سرسیّد ہال ریویو
اولڈ بوائز نمبر

سرسیدہال ریویو

اولڈ بوائز نمبر

ایڈیٹر :
ملک خالد حسین

نگراں :
ڈاکٹر اصغر عباس

بیادگار صد سالہ تقریبات یوم تاسیس مدرسۃ العلوم
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سر سیّد ہال ریویو

اولڈ بوائز نمبر

پروسٹ

ڈاکٹر حسام الدین فاروقی

ایڈیٹر:
ملک خالد حسین

نگراں:
ڈاکٹر اصغر عباس

۱۹۷۵ء

سلسلۂ مطبوعات سرسید ہال
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

سنہ اشاعت ... ۱۹۷۵
تعداد ... ... ایک ہزار
طباعت ... . لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ

مافیہ :

پیغام

جناب پروفیسر علی محمد خسرو۔ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

عزیزی اصغر عباس صاحب

مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ کی نگرانی میں سرسید ہال ریویو کا اولڈ بوائز نمبر نکل رہا ہے جس نام نامی سے آپ کا ہال موسوم ہے وہ نہ صرف اس ادارے کا بانی ہے بلکہ علمی، ادبی اور ثقافتی حیثیت سے اس کا محسن ہے۔ سرسید نے جس روش پر اس ادارے کو ڈالا تھا میں سمجھتا ہوں کہ وہ روش ادارے کے حق میں نہایت مستحسن ثابت ہوئی ہے۔ دین و دنیا کا مناسب امتزاج، سائنس کی قدروں کو ماننا اور بڑھانا مختلف گروہوں، مذاہب علاقوں اور طبقوں کے ساتھ بے تعصبی کا برتاؤ۔ یہ سب ایسی قدریں ہیں کہ آج بھی بلکہ ہمیشہ ان قدروں کی افادیت باقی رہے گی۔

سرسید کی قدروں کو آگے بڑھانے اور مستقل طور پر اس یونیورسٹی میں قائم کرنے میں علی گڑھ اولڈ بوائز کا بڑا رول رہا ہے۔ ملک کی زندگی کے مختلف شعبوں پر یہاں کے اولڈ بوائز نے اپنا اثر ڈالا ہے اور ناموری پیدا کی ہے۔ دنیا کے تقریباً ہر حصے میں ہمارے اولڈ بوائز پھیلے ہوئے ہیں، ان کی زبان سے یا قلم سے علی گڑھ کے ماضی کا قصہ سننے یا پڑھنے کا لطف آپ کے اولڈ بوائز نمبر سے ہم کو ملے گا۔

مجھے امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ و روایات کا ایک صد رنگ آئینہ نمانہ ہمارے سامنے لائے گا۔ اس کی مقبولیت کے لئے میری نیک ترین خواہشات شامل ہیں۔

خیر اندیش

علی محمد خسرو

اداریہ

مدرسۃ العلوم کے یوم تاسیس کی صد سالہ تقریب کے موقع پر سرسید ہال کے طلبار نے یہ فیصلہ کیا کہ اس دن کی یاد میں سرسید ہال ریویو کا خصوصی نمبر شائع کیا جائے جس ہمارے ہال کے اولڈ بوائز کے اقامتی زندگی سے متعلق تجربات و تاثرات پر مشتمل مضامین شامل ہوں کہ اپنے پیشروؤں اور بزرگوں کے تجربات سے ہمیں نہ صرف بیتے دنوں کا سراغ ملے گا بلکہ اپنے ماضی کا صحیح عرفان حاصل ہوگا اور یہ مستقبل کے لئے نشانِ راہ کا سامان بھی فراہم کرے گا کیونکہ ماضی اقوام و امم کا حافظہ ہے اور حافظے سے فکر میں تابندگی آتی ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے ہال کے بارے میں بھی چند باتیں عرض کر دیں ۱۸۵۷ء کے بعد جب خوف و دہشت کا غلبہ عام تھا حوصلے پست تھے اور توانائیاں روبہ زوال تھیں اور ہر طرف ایک ذہنی جمود طاری تھا ایک بڑے رہنما نے احیاء قوم و ملک کا ارادہ باندھا اور اپنی کوششوں کو ایک تعلیمی ادارہ پر مرکوز کر دیا یہ ادارہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں قائم ہوا اس کی ابتدا ایک چھوٹے سے مدرسہ کی شکل میں ہوئی جس کی سب سے اعلیٰ جماعت نویں تھی اور جس میں کل طلبار کی تعداد پچاس سے کچھ زیادہ تھی ۱۸۷۵ء کے نومبر میں اس مدرسہ میں ایک بورڈنگ ہاؤس بھی قائم ہوا جو کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد بورڈنگ ہاؤس تھا اس کی نگرانی کے انتظامات پہلے مولوی ابوالحسن اور مولوی محمد اکبر نے انجام دیئے۔ یہ بورڈنگ ترقی کرتے کرتے

۱۹۰۱ء میں سرسید ہال کہلایا اور ان کے پہلے پرووسٹ انگریزی کے سینئر پروفیسر ایل۔ پنگ مقرر ہوئے۔ تاریخی حیثیت سے ہمارا ہال یونیورسٹی کا سب سے قدیم ہال ہے۔ اور اس دانش گاہ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے یہاں کے رہنے والوں نے اپنے علمی ذوق، رواداری، باہمی اخوت، رہن سہن، کھیل کود اور دوسرے تفریحی مشاغل کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا جس سے ایک ایسا اجتماعی ذہن وجود میں آیا جس نے ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کے گوناگوں مسائل کو نئے تقاضوں کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک نئے ہندوستان کے طلوع ہونے کی بشارت دی۔

یہ خصوصی شمارہ مدرسۃ العلوم کے یوم تاسیس کی صدسالہ تقریب کے موقع پر ہمارے ہال کے طلبار کا نذرانہ ہے۔ اس خصوصی نمبر میں سرسید ہال کے اقامتی زندگی کی تقریباً ایک صدی کی تہذیبی تاریخ کی مرقع کشی ہے۔ اس کے قلمی معاونین میں ایسے نامور اور مقتدر نئی اور پرانی نسل کے ارباب فکر شامل ہیں جن پر کوئی بھی رسالہ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں جن بزرگوں کے مضامین شامل ہیں ان میں مولوی میاں محمد امین صاحب، سید طفیل احمد صاحب اور خواجہ عبد العلی صاحب کے مضامین ہم نے اخبار "سرگزشت" سے اخذ کئے ہیں۔ یہ اخبار علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا آرگن تھا اور علی گڑھ سے شائع ہوتا تھا۔ میر ولایت حسین صاحب کا مضمون ان کی کتاب "آپ بیتی یا ایم اے او کالج کی کہانی میر ولایت حسین کی زبانی" سے انتخاب کیا گیا ہے۔ بانی ڈینس کالج ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ کا مضمون ان کی کتاب "مشاہدات و تاثرات" سے لیا گیا ہے۔ سر رضا علی کا مضمون ان کی خود نوشت سوانح حیات "اعمال نامہ" سے ماخوذ ہے۔ عبد المجید قریشی صاحب کا مضمون کراچی سے شائع ہونے والے رسالہ "العلم" سے لیا گیا ہے۔ حکیم احمد شجاع صاحب کا مضمون ان کی کتاب "خوں بہا" اور ڈاکٹر ذاکر حسین کا مضمون ان کی کتاب "تعلیمی خطبات" سے اخذ کیا گیا ہے۔ کچی بارک پر جو مضمون شامل ہے وہ علی گڑھ منتھلی سے منتخب کیا گیا ہے۔

ہم کو اس کی بڑی خوشی اور فخر ہے کہ اس خصوصی نمبر کو برصغیر کے مشہور اہل قلم اور ممتاز دانشوروں نے اپنی قلمی اعانت سے سرفراز کیا ہے ہم پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد صدیقی،

پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مختار الدین احمد جناب عدیل عباسی جناب محمد شفیع قریشی وزیر ریلویز جناب خواجہ مسعود علی ذوقی جناب ارشد مسعود جناب حبیب احمد صدیقی اور جناب سید وقار حسین کے دل سے ممنون کرم ہیں جنھوں نے اپنی بزرگانہ شفقت و محبت کے پیش نظر اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہمیں اپنے تازہ مضامین عنایت کئے، ان مضامین کی ترتیب سرسید ہال کی سینیرٹی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔

ہم اپنے مقبول و محترم پرووسٹ ڈاکٹر حسام الدین فاروقی کے ممنون کرم ہیں جن کی مشفقانہ رہنمائی میں ہم اس شمارہ کا اجراء کر سکے۔ ہم فخر کرتے ہیں کہ ہر قدم پر موصوف کی رہنمائی نے ہمیں سہارا دیا۔ ڈاکٹر اصغر عباس کے شکر گزار ہیں جن کے مشوروں نے ہر مقام پر ہماری دستگیری کی۔ ہم اپنے تمام وارڈن صاحبان اور جوائنٹ ایڈیٹر جناب محی الدین اظہر اور پرویز احمد نیز اپنی مجلس ادارت کے مشکور ہیں جن کی اعانت سے طباعت و اشاعت کا مرحلہ آسان ہوا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ یہ نمبر خاصی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے پھر بھی ارباب نظر کے سامنے یہ نمبر اک نگہ التفات کی امید کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ملک خالد حسین

(ایڈیٹر سرسید ہال ریویو)

ڈاکٹر حسام الدین فاروقی

بہ دوست - سر سید ہال

تمہید

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان اور خصوصاً ہندوستانی مسلمان نہ صرف بدیسی استعمار کے استبداد کے شکار ہوئے بلکہ "پدرم سلطان بود" کے تصور کے سبب وہ زندگی کی واضح حقیقتوں سے گریزاں بھی تھے اور اسی وجہ سے وہ بدلتے ہوئے حالات سے مفاہمت کے لئے تیار نہ تھے۔ گوکہ ان کے آبا نے ماضی میں ایک بہت ہی ممتاز تہذیب کو جنم دیا تھا لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں یہ تہذیبی قدریں اتنی پائدار ثابت نہیں ہو سکتی تھیں کہ ان کے ذریعہ ہندوستانی مسلمان اپنے لئے ایک تابناک مستقبل کا تصور کر سکیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد کی صورت حال کو سامنے رکھیں تو ہندوستان ایک سہ طرفی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے ان میں سب سے پسماندہ مسلمان تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو معاشرہ میں اپنا مقام بنائے رکھنے کے لئے نہ صرف اندرونی فرقوں اور طبقوں سے بلکہ بدیسی طاقت کے ساتھ اس طرح مفاہمت ضروری تھی کہ وہ ان کو مزید گزند نہ پہنچا سکے۔ ان حالات میں بدیسی سامراج کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ ایک طرف تو یہاں کی ملکی قوتوں سے حکمانہ مگر بظاہر دوستانہ تعلقات رکھے اور دوسری طرف ان میں آپس میں ایک ایسی خلیج حائل کر دے جو اندرونی طاقتوں کو متحد نہ ہونے دے اس کی ایک صورت یہ تھی کہ جس علاقہ میں جو طبقہ یا فرقہ زیادہ ممتاز اور نمایاں ہو اس کے خلاف دوسرے طبقہ کی سرپرستی کی جائے تاکہ پورا معاشرہ ایک محدود جنجال میں الجھا رہے اور سامراج کا مفاد پورا ہو۔ لیکن خوش قسمتی سے انیسویں صدی

کے نصف آخر میں کچھ ایسے دور اندیش لوگ منظر عام پر آئے۔ جنھوں نے ماضی اور حال میں پوشیدہ ان منفی اور مثبت عناصر کو سمجھنے اور قابو میں لانے کی کوشش کی جن کی تربیت و تعلیم سے ایسی نسل پیدا ہوئی جس نے آج ہمارے ملک کو ایٹمی طاقت بنا دیا اور خلائی دور میں لاکھڑا کیا۔ ان معدودے دور اندیش لوگوں میں سرسید بھی تھے۔

سرسید نے اس نشاۃ الثانیہ کی کلید تعلیم و تربیت کو سمجھا جس کے ذریعہ ایک ترقی پسند معاشرہ کا قیام عمل میں آسکتا تھا۔ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے علی گڑھ تحریک کی ابتدا کی۔ کمال مخالفت اور بسا اوقات بے حد ناسازگار حالات کے باوجود ان کے عزم میں فرق نہیں آیا۔ خدا نے ان کو ایسے رفقا بھی دیئے جنھوں نے دامے درمے قدمے سخنے سرسید کے نظریات کو اپنی زندگی کا مطمع نظر بنایا اور اس تحریک کو لے کر چل پڑے جو نہ صرف ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے بلکہ جو بعد میں ایک زندہ جاوید ادارہ کی شکل میں وجود پذیر ہوئی۔ یہ ادارہ نہ صرف ملک کا ایک اہم تعلیمی اور تربیتی مرکز ہے بلکہ ہماری رنگا رنگ تہذیب کا ضامن بھی۔ علی گڑھ تحریک کو استحکام ایم اے او کالج اور بعد میں مسلم یونیورسٹی سے ملا۔ اس عرصہ میں ملک میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں شب و روز بدلے سازگار اور ناسازگار حالات رونما ہوتے رہے مگر علی گڑھ اپنے مشن سے نہیں ہٹا اس ادارہ کے کارکن اس کے طلبار اور اساتذہ اور خیر خواہ ہمیشہ اسی نظریہ سے اپنے اپنے دائروں میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے کہ ان پہ ایک اہم ملکی اور قومی ذمہ داری عاید ہے اور وہ ایک ایسے ورثہ کے امین ہیں جن کو سرسید نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔

علی گڑھ تحریک اور ایم اے او کالج اور یونیورسٹی کا ذکر ہو تو سرسید ہال اور اس کے اولڈ بوائز کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سرسید ہال کے اولڈ بوائز نے اپنے تعلیمی اور تفریحی مشاغل سے اپنے اعلیٰ انسانی خصائل سے اپنے عملی تدبر فکری صداقت اور بے لاگ عمل سے ان روایات کو ابھارا جو ہماری قومی زندگی کا مطمع نظر ہے۔ انھوں نے قومی زندگی کی خامیوں کو

جس شدت سے محسوس کیا اتنی ہی گہری، دل سوزی اور جرأت سے قومی تعمیر و ترقی کی تحریک میں حصہ لینے کی روایت کا آغاز کیا جس کی مثال کم ملے گی اولڈ بوائز کی اچھی روایات کا استحکام ان کی قدر و منزلت اور ان کا احترام اتنا ہی اہم ہے جتنا تدریسی اور علمی کام ۔ یہ روایات نہ صرف ماضی میں اہمیت رکھتی تھیں بلکہ آج بھی ہم ان کی ضرورت اور اہمیت کا لحاظ کرنے پر مجبور ہیں کہ ان روایات کا ایک اہم عنصر یہ ہے کہ ان سے طلبا میں SELF DISCIPLINE پیدا ہوتا ہے اور کردار اور شخصیت کی تعمیر میں مدد ملتی ہے ۔

جن اولڈ بوائز نے اپنے اپنے دائروں میں علی گڑھ اور سرسید ہال کے مقاصد کو فروغ دینے میں نمایاں رول انجام دیا ہے ان میں سے چند کے تاثرات اس شمارہ میں شامل ہیں یہ تاثرات سرسید ہال کی بورڈنگ لائف کی تاریخ کا زریں باب ہے جس کا مطالعہ موجودہ طلبا کے لئے مفید بھی ہے ناگزیر بھی ہے شرف بھی ہے اور آزمائش بھی ۔

اس خصوصی شمارہ کے اجرا میں ہمارے ہال کے موجودہ طلبا نے جس جوش و خروش سے حصہ لیا ہے وہ ان کا امتیازی شرف ہے اور اچھے کاموں میں طلبا کی اس طرح شرکت سے بڑی امیدیں قائم ہوتی ہیں۔ یہ کاوش سرسید ہال کے طلبا کی ایک ادنیٰ خدمت تصور کی جائے گی ۔ اس والہانہ محبت کے ذیل میں جو ان کو اس ادارہ سے ہے جس کا فروغ ان سب کا فروغ ہے اور جس کا عنوان سب کی معراج ہے ۔ میری دعا ہے کہ وہ ہال کے باعثِ فخر طالب علم ثابت ہوں ۔

میں خاص طور پر سرسید ہال ریویو کی ادارتی مجلس کا ممنون ہوں کہ انھوں نے بڑی توجہ اور خلوص کے ساتھ اس کی طباعت وغیرہ کی ذمہ داریوں کو پورا کیا ۔ میں تمام وارڈن صاحبان خصوصاً عزیزی ڈاکٹر اصغر عباس وارڈن سنٹرل ہاسٹل کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس خصوصی شمارہ کی نگرانی کے فرائض بڑے شوق اور تندہی سے انجام دینے کی کوشش کی ۔

اصغر عباس

یہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک

یونیورسٹی روڈ سے فیض گیٹ پر آتے ہی وہ عمارت نظر آتی ہے جس کو "قوم کے بزرگوں اور عزیزوں نے جو غفلت کے اندھیروں کے لیے مثل چراغوں کے ہیں..... بنایا ہے جس کی بنیاد تقویٰ الٰہی پر ہے تاکہ اس میں علوم دینی اور دنیوی سکھائے جائیں اور عالم کے اخلاق شائستہ بنائے جائیں" اسے سرسید ہال کہتے ہیں۔

جس قطعہ زمین میں سرسید ہال کی عمارتیں ہیں کبھی یہاں فوجوں کی پیڈ ہوا کرتی تھی ۷۴ ایکڑ کے اس بے آب و گیاہ میدان کو سرسید کی درخواست پر سر جان اسٹریچی لفٹننٹ گورنر یوپی کی کوششوں سے مجلس خزینۃ البضاعۃ کو حکومت نے عطا کیا اور ۱۸ اپریل ۱۸۷۵ء کو مولوی سمیع اللہ خاں کو اس زمین پر قبضہ ملا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ چھاؤنی کے میس ہاؤس میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا جس نے گمشدہ منزلوں کا سراغ دیا جس نے بے گھر ہواؤں کو گھر عطا کیا جس نے فکر و شعور کو جلا بخشی اور جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کو نیا موڑ دیا۔ اس وقت تک مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لئے جو نقشہ تجویز ہوا تھا وہ یہ تھا:

۱۔ مسجد اہل سنت والجماعت۔ ۲۔ مسجد شیعہ امامیہ۔ ۳۔ چاہ جس سے مسجدوں میں اور تمام مکانات بورڈنگ ہاؤس میں بذریعہ کل کے پانی جا دے گا۔ ۴۔ دو یا تین دروازے

احاطہ مدرسۃ العلوم کے۔ ۵۔ بڑا ہال جو امتحانوں اور تقسیم انعامات وغیرہ اجلاسوں کے لئے بنایا جاوے گا۔ ۶۔ ایک دروازہ غربی اندرونی عمارت متصل ہال جس کے ذریعہ سے مدرسہ کے ایک چوک سے دوسرے چوک میں جانے کا راستہ ہوگا۔ ۷۔ ایک دروازہ مشرقی اسی غرض سے بہ جواب دروازہ غربی۔ ۸۔ ایک کتب خانہ جو نہایت عمدہ خوبصورت بنایا جاوے گا۔ ۹۔ ایک میوزیم یا عجائب خانہ جس میں آلات علمی رہیں گے اور ان کا تجربہ سکھایا جاوے گا۔ ۱۰۔ ایک بڑا کمرہ کھانے کا۔ ۱۱۔ پارک متعلق مدرسۃ العلوم۔ ۱۲۔ گیند گھر اور کرکٹ کھیلنے کے میدان میں ایک خوشنما بارہ دری جس کو کرکٹ شیڈ کہتے ہیں۔"

۱۸۷۶ء میں سرسید نے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی اور مدرسہ کی نگرانی کیلئے بنارس سے مستقل قیام کے لئے علی گڑھ آ گئے۔ سرسید ہال کی عمارتوں کی تعمیر میں انھیں جن جانگداز حالات اور آزمائشوں سے گزرنا پڑا اس کی تفصیل ان کتابچوں میں ملتی ہے جن کے نام تھے "لٹھ" "آرہ" "درّہ" "بوت" اور "کشاپ" وغیرہ۔ انیسویں صدی کے ہمارے جلیل القدر رہنما کو اس مدرسہ کے لئے کبھی انگریزوں سے لڑنا پڑا کبھی ملاؤں سے مرتد و زندیق کے فتوے ملے اور کبھی یہ حال ہوگیا کہ بقول عبدالحلیم شرر در و دیوار سے لعنت و نفریں کی صدائیں سننی پڑیں۔ اس ہنگامۂ تذلیل و تکفیر میں انھوں نے ایک جگہ مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میں فرض کرتا ہوں کہ میں بدعقیدہ ہوں مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم اپنا خیرخواہ نہ سمجھیں گے آپ کے لئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں اور آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد و ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں چوہڑے چمار، قلی کافر بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم

کے قائم کرنے میں ایک قلی چار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے نئے گھر کو بنتے دیکھئے اور اس کی وجہ سے کہ اس کا بنانے والا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چار ہے اپنے گھر کو نہ ڈھائیے۔"

سرسید کو اپنے مقصد سے جیسی والہانہ شیفتگی تھی اس نے انھیں اپنے سفر میں دشواریوں اور صعوبتوں کو کبھی حائل نہ ہونے دیا وہ ایک سیمابی قوت کے حامل تھے جو کبھی مطمئن نہیں ہوتی۔ انھوں نے ایک بے صبر عاشق کی طرح سرسید ہال کی عمارتوں کی تعمیر شروع کرادی چنانچہ مسجد دمینار نے، اسٹریچی ہال اور وکٹوریہ گیٹ نے لٹن لائبریری اور سالار منزل نے سر بلند کرنے شروع کر دیئے۔ ہاسٹل، لکچر روم، کرکٹ فیلڈ اور باغ نمودار ہوئے، مدرسہ کے چاروں طرف سنگ سرخ کی جالیاں کھینچ گئیں جس کے لئے کسی نے کہا تھا کہ "یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آئے"۔ سرسید مئی جون کی تپتی ہوئی دوپہر میں خود تعمیرات کا معائنہ کرتے تھے اور تعمیر کی ایک ایک جزئیات کی بیک وقت نگرانی بھی کرتے اور کام کرنے والوں کو تیزی سے کام کرنے پر بڑھائے جاتے تھے کبھی کبھی تو ان پر وہ اضطرابی کیفیت طاری ہوتی تھی کہ جب تک معماروں کے ساتھ بیٹھ کر وہ خود پتھر نہ اٹھواتے انھیں چین نہ آتا تھا اس طرح عمارتوں کی بنیادیں حیرت ناک تیزی سے ابھرتی چلی گئیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی سرسید کے کان میں کہہ رہا ہو کہ وقت کے پر لگے ہیں وقت تیزی سے قریب آرہا ہے انھوں نے مدرسۃ العلوم کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

> عزیزو! میرے بے چین دل کو آج کچھ قرار سا آگیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے میں اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوا چاہتا ہوں میری ہڈیوں کو اس غم نے پگھلا دیا تھا کہ میں دیکھتا تھا کہ وقت کا قافلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جارہا ہے لیکن تم ہو کہ خواب گراں سے بیدار ہونے کا نام نہیں

لیتے۔ میں نے برسوں لگاتار تمہیں جگانے کی جد و جہد کی۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم و اندوہ پہ بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ آج مسجد کی محرابیں اور اسٹریچی ہال کے بام و در دیکھتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کی بے قراریوں نے اس کالج کا پیکر اختیار کر لیا ہے۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک جو عمارتیں مکمل ہو گئی تھیں ان کی تفصیل یہ ہے:

فیض گیٹ سے چند قدم مغرب کی طرف آئے تو وکٹوریہ گیٹ ملتا ہے۔ یہ سرسید ہال کا صدر دروازہ ہے یہ ۱۸۹۴ء میں مکمل ہو چکا تھا اس کے مینار پر وہ کلاک لگا ہوا ہے جسے مدرسۃ العلوم کے مشہور پرنسپل مسٹر تھیوڈر ربک کے والد نے تحفتاً لندن سے بھیجا تھا۔ اس کلاک کا وزن ۲۳۶ پونڈ ہے گھڑی کا رخ شمال و جنوب کی سمت ہے اس دروازے میں داخل ہوتے ہی سامنے اسٹریچی ہال دکھائی دیتا ہے۔

سرسید ہال کی عمارتوں میں اسٹریچی ہال سب سے بڑی عمارت ہے جس زمانے میں یہ ہال تعمیر ہوا تھا شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا ہال سمجھا جاتا تھا۔ ۱۱ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو سرجان اسٹریچی کے نام پر اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ سرجان اسٹریچی کے ناخن تدبیر نے مدرسۃ العلوم کو زمین ملنے میں جو گتھیاں پڑ گئی تھیں انھیں سلجھایا تھا۔ یہ عمارت معہ برآمدوں اور طرفین کی گیلریوں کے ۱۰۷ فٹ طول ہے اور ۸۱ فٹ عرض اور ۵۲ فٹ بلندی میں ہے۔ اس میں تقریباً ۰۰۰، ۷ مربع فٹ کا رقبہ شامل ہے جس میں ہال کا اندرونی رقبہ ۰۰۰ ۵ مربع فٹ ہے یہ عمارت تقریباً نوے ہزار روپیہ میں تعمیر ہوئی اور اس کے لئے ۱۲۰ بزرگوں نے چندہ دیا۔ جن کے نام کے پتھر ہال میں نصب ہیں۔ ۱۲ر نومبر ۱۸۹۴ء کو سرچارلس کراستھویٹ گورنر اضلاع

شمال و مغرب نے اس ہال کا افتتاح کیا ہیں سرسید نے کہا تھا: "جس جگہ ہم لوگ اس وقت جمع ہیں ایک روز وہ اولوالعزم نوجوانوں کی بیتاب تمناؤں کا مرکز بنے گا اور یہاں سے علمی اعزاز اور سرفرازی کے قافلے روانہ ہوں گے۔"

سرسید کورٹ کے مشرقی گوشہ کے ۴۳ کمرے ۱۸۸۳ء کے اواخر تک مکمل ہوچکے تھے ان کمروں کی تعمیر کے لئے جن بزرگوں نے چندے دئے ان کے نام یہ ہیں:

چودھری شیر سنگھ، قاضی سید رضا حسین پٹنہ، سید فضل الرحمن پٹنہ، حاجی نور زکریا اینڈ کمپنی کلکتہ، حاجی محمد اسماعیل خاں دتاولی، حاجی محمد مصطفیٰ خاں بوڑہ گاؤں، منشی محمد مشتاق حسین وقار الملک، چارلس اے ایلیٹ، کنور لیکھ راج سنگھ سید پور، منشی صفدر حسین گورکھپور، راؤ کرن سنگھ بردلی، راجہ شیو نرائن سنگھ سید پور، مرزا محمد رحمت اللہ بیگ بنارس، محمد عنایت علی خاں مالیر کوٹلہ، منشی محمد اکرام اعظم گڑھ، محمد عنایت اللہ بھیکم پور، منشی سید مہربان علی گلاؤٹی، مولوی خواجہ محمد یوسف علی گڑھ، مرزا کاظم حسین بنارس، سید محی الدین علوی مدراس، ڈپٹی نذیر احمد دہلی، سید احمد خاں، سید مہدی علی خاں دہلی و اٹاوہ، سید حسین بلگرامی حیدرآباد، راجہ گھنشیام سنگھ مرسان، راجہ اودے پرتاپ سنگھ بھنگا، ولیم منٹر، لالہ پھول چند ہاتھرس، لالہ باسدیو سہائے سکندرہ، عبدالمجید جون پور، کنور محمد عبدالغفور خاں دھرم پور اور سردار محمد حیات خاں راولپنڈی۔

ان کمروں کو دیکھ کر ایجوکیشن کمیشن کے ایک ممبر نے ۱۸۸۲ء میں کہا تھا کہ "جس وقت میں نے کمروں کی اس قطار کو دیکھا تو مجھ کو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آئندہ کی بہ نسبت نئی ہمت نہ پیدا ہو۔"

سرسید ہال کے مشرقی کونے پر جو بڑا ہال ہے اسے سالار منزل کہتے ہیں یہ ہال کا ڈائننگ ہال ہے۔ ۱۸۸۸ء میں میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد دہلی آئے ان کی خدمت میں مجلس

خزینۃ البضاعۃ نے ایک وفد دہلی بھیجا تاکہ نظام سے کالج کے لئے امداد حاصل کی جائے اس سلسلے میں سالار جنگ نے بڑی مدد کی ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر یہ عمارت تعمیر ہوئی اور ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو نواب میر لائق علی نے مدرسۃ العلوم آکر اس عمارت کا افتتاح کیا۔

۱۸۹۱ء میں سر سید نے ایس ایس ہال کی عمارتوں کے سلسلے میں یہ تجاویز پیش کی تھیں

" اس عمارت کے بیچ میں سنٹرل ہال ہے جو اسٹریچی ہال کے نام سے معنون ہے۔ اس ہال کے جانب مشرق جو ایک دروازہ ہے وہ لارنس گیٹ کے نام سے نامزد ہے جو کلکٹر و مجسٹریٹ علی گڑھ کے تھے اور جنھوں نے مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لئے ایک قطعہ زمین کے ملنے کی ابتداً گورنمنٹ میں تحریک کی تھی اور ان کے نام کا جو کتبہ تیار ہے اس پر نصب ہوگا۔ اس کے متصل ایک کمرہ یعنی لکچر روم ہے جو سمیع اللہ خاں کے بیٹے حمید اللہ خاں کے ولایت سے تعلیم پاکر آنے کی یادگار میں تعمیر ہونا تجویز کیا گیا ہے اور بہت کچھ تعمیر بھی ہو گیا ہے اس کے متصل جوبلی روم ہے بیادگار جشن جوبلی ملکہ وکٹوریا وہ بھی تعمیر ہونا شروع ہوا ہے۔ اس کے متصل ایک اور کمرہ یعنی لکچر روم ہے جس کی لاگت نواب محسن الملک نے اپنے پاس سے دینے کا اقرار کیا ہے اور نصف کے قریب عنایت بھی کر چکے ہیں اس کے متصل لائبریری کا ہے جو لٹن لائبریری کے نام سے معنون ہے اور لٹن لائبریری کہلاوے گی وہ بھی کرسی تک بن گئی ہے اس کے متصل جو خوبصورت عمارت ہے وہ نواب محسن الملک کے احسانات کی یادگار میں تیار کی گئی ہے اور تیار ہے اور مہدی منزل کے نام سے موسوم ہے۔ جس طرح کی عمارات اور جس شکل و صورت کی سنٹرل ہال کے جانب شرق ہیں ویسی ہی اس کے جانب غرب ہیں۔ سنٹرل ہال کے پیوستہ جانب غرب کا دروازہ بہ یادگار احسانات خلیفہ سید محمد حسن حسن گیٹ کے نام سے موسوم ہے اور اس پر ان کے نام کا جو کتبہ تیار ہے نصب ہوگا۔ اس کے متصل ایک کمرہ لکچر روم کا ہے اور اس کے متصل آسمان منزل بیادگار عنایت و احسانات سر آسمان جاہ کے ہے اور یہ عمارت مثل جوبلی روم کے ہوئی اس کے متصل ایک اور کمرہ لکچر روم ہے اس کے متصل نظام میوزیم ہے جو ہز ہائنس نظام حیدر آباد کے نام سے معنون ہے اور اس

کے متصل نظام میوزیم ہے جو ہز ہائنس نظام حیدرآباد کے نام سے معنون ہے اور اس کی عمارت مثل لائبریری کے ہوگی اور اس کے متصل وہ عمارت ہے جو مثل مہدی منزل کے ہوگی پس میں تحریک کرتا ہوں کہ یہ یادگار احسانات مولوی محمد مشتاق حسین یہ عمارت ان کے نام سے موسوم ہو اور مشتاق منزل کہلائے۔

۱۸۹۵ء میں مدرسۃ العلوم کے ہیڈ کلرک شیام بہاری لال نے کالج کے روپیہ میں غبن کیا جس کے بعد سرسید ہال کی عمارتوں کی تعمیر کا کام تقریباً بند ہوگیا یہی وجہ ہے کہ مجوزہ عمارتوں میں مہدی منزل کے علاوہ سب سرسید کی وفات کے بعد مکمل ہوسکیں۔

سرسید ہال کی سب سے پرکشش عمارت مسجد کی ہے اسی جگہ ۱۸۷۹ء میں مسجد کی تعمیر شروع کرتے ہوئے سرسید نے اپنے رب سے کہا تھا " یا اللہ! میں یہاں تیرے نام لیواؤں کے لئے ایک گھر بناؤں گا "۔ یہ گھر فروری ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوا اس کی خشت اوّل سید محمود کے ہاتھوں رکھی گئی۔ مسجد کی تعمیر میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ چند طالب علم تعمیر مسجد کے چندہ کے لئے ایک بزرگ کے مکان پر پہنچے اور ان سے اعانت کی درخواست کی ان بزرگ نے فرمایا میں اس مسجد میں چندہ دینا تو درکنار نماز پڑھنا بھی ناجائز سمجھتا ہوں کیونکہ مدرسۃ العلوم کے طلبا بغیر وضو نماز پڑھتے ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ گو مسجد ساخت میں زیادہ نہیں لیکن حسن تناسب میں بے نظیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جامع مسجد دہلی کے علاوہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی مسجد ایسی ہو جس کے سرخ میناروں اور تینوں اجلے گنبدوں میں انفرادی اور مجموعی طور پر ایسا تناسب واقع ہوا ہو غالباً یہی سبب ہے کہ ہماری نگاہیں اس پر اس حد تک مرکوز ہوجاتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی چلے جائیں۔

مسجد کے احاطے کے شمالی حصے میں محمود منزل اور سید محمود کا مقبرہ ہے اور اس کے بعد ہمارے رہنما کی تربت ہے سرسیّد کا مقبرہ ان کے رفیق سید زین العابدین کی نگرانی میں تیار ہوا کہا جاتا ہے کہ سرسید اور زین العابدین جب علی گڑھ میں ہوتے صبح کی چائے ساتھ پیتے تھے

جب ان کا انتقال ہو گیا تب بھی زین العابدین نے اپنی وضع قائم رکھی۔ صبح کو خادم چائے کی ٹرے لے کر سرسید کے مزار پر آتا یہاں زین العابدین پہلے فاتحہ پڑھتے اور حظیرہ کے اندر چائے پیتے تھے اور ان کی یہ وضع مرتے دم تک برقرار رہی۔ یہیں سر راس مسعود ڈاکٹر ضیاء الدین احمد محسن الملک اور سید زین العابدین بھی مدفون ہیں۔

وکٹوریا گیٹ سے جنوب مغربی گوشے کے موجودہ کامرس ڈپارٹمنٹ تک کے کمروں کی بنیادیں اور چار کمروں کی کچھ دیواریں سرسید کے زمانہ میں تیار ہوئی تھیں لیکن یہ حصہ ۱۹۰۱ء میں مکمل ہوا باب رحمت سے کامرس ڈپارٹمنٹ تک جو کمرے ہیں وہ ۱۹۱۴ء میں مکمل ہوئے ان کمروں کے لئے جن لوگوں نے چندے دیئے ان کے نام یہ ہیں:

مسلمانان گجرات صوبہ پنجاب، عبدالشکور جمال برادرز رنگون، محمد عنایت اللہ خاں بھیکم پور، ایس۔ این پنڈت راجکوٹ، بیگم صاحبہ ناخدا محمد علی روغنی بمبئی فاطمہ بی بی بنت محمد علی امین روغنی بمبئی، آغا کلب حیدر اناؤ، حاجی ولی محمد حسینی، سراج احمد، حاجی احمد سعید خاں بھیکم پور، مزمل اللہ خاں بھیکم پور، سید علی امام پٹنہ، نواب حمید اللہ خاں بھوپال، کنور عبدالغفور خاں دھرم پور، فتح علی خاں قزلباش لاہور، سید علی حسن خاں لکھنؤ اور رسول خاں جی، مہابت خاں جی جونا گڑھ۔

مشتاق منزل: کی تعمیر کا کام ۱۸۹۱ء سے شروع ہوا اور ۱۹۰۵ء میں ختم ہوا۔

نظام میوزیم: ۱۸۷۵ء میں ریاست حیدرآباد نے مدرسۃ العلوم کو ۲۰۰ روپیہ سالانہ ... یہ۔ تم رفتہ رفتہ ۱۸۹۱ء میں چوبیس ہزار کر دی گئی، ان خدمات کی یادگار کے طور پر ... نظام میوزیم کی عمارت تعمیر ہوئی اس کا چندہ صرف اہل حیدرآباد نے دیا ۱۹۰۴ء میں یہ عمارت مکمل ہوئی۔

آسمان منزل: ۲۴ / ۱۸۸۸ء کو سر آسمان جاہ وزیر اعظم حیدرآباد علی گڑھ آئے

مدرسہ کی امداد انھوں نے جی کھول کر کی۔ انھیں کی یادگار میں ۱۹۰۲ء میں یہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس موقع پر کالج کے طالب علم سید ابو محمد نے نظم کہی جس میں یہ شعر بھی تھا:

آسماں منزل بہ منزل تا قیامت طے کند گو بخواہد زیر پائے رفعتش روزے قیام

برکت علی خاں لکچر روم: برکت علی خاں پنجاب کے صاحب خیر بزرگوں میں تھے سرسید تحریک پنجاب میں جن بزرگوں کی کوششوں سے مقبول ہوئی ان میں برکت علی خاں سرفہرست ہیں۔ ان خدمات کی شکر گذاری میں یہ لکچر روم تعمیر ہوا اس کی تعمیر کا کام سرسید کے زمانے میں شروع ہوگیا تھا لیکن یہ کمرہ بھی ۱۹۰۴ء میں مکمل ہو سکا۔ نظام میوزیم، آسمان منزل اور برکت علی خاں لکچر روم کا افتتاح ۲۸ جولائی ۱۹۰۴ء کو سر جیمس لاٹوش گورنر اضلاع شمال و مغرب نے کیا۔

تصدق رسول عربک روم: حسن گیٹ سے متصل یہ کمرہ راجہ تصدق رسول کے چندہ سے تعمیر ہوا یہ کمرہ راجہ صاحب کی خواہش کے مطابق عربی کے درس کے لئے مخصوص کیا گیا تھا ۱۹۰۵ء میں یہ مکمل ہوا۔

حمید اللہ خاں لکچر روم: لارنس گیٹ سے متصل اس کمرہ کی بنیاد ۱۸۸۹ء میں پڑی۔ حمید اللہ خاں مدرسۃ العلوم کے پہلے بیچ کے طالب علموں میں تھے یہ اس چندہ سے تعمیر ہوا جو حمید اللہ خاں کے دوستوں نے ان کی ولایت سے تعلیم پاکر لوٹنے کی خوشی میں دعوت کے عوض دیا تھا۔

بیک منزل: اس عمارت کی تعمیر کا کام ۱۸۹۶ء میں شروع ہوگیا تھا پہلے یہ تجویز تھی کہ اسے ملکہ وکٹوریا کے جشن جوبلی کے یادگار کے طور پر بنایا جائے لیکن بعد میں مدرسۃ العلوم کے مقبول پرنسپل تھیوڈر بیک کے نام سے موسوم کی گئی۔

لٹن لائبریری: ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو جب لارڈ لٹن وائسرائے کالج کا افتتاح کرنے آئے تو اس موقع پر سرسید نے اعلان کیا کہ کالج لائبریری لارڈ لٹن کے نام سے معنون ہوگی

اس کی تعمیر ۱۸۸۲ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۰۹ء میں مکمل ہوئی۔

مہدی منزل : یہ عمارت ۱۸۸۱ء میں مئی شروع ہوئی سرسید کے زمانہ میں مکمل ہو چکی تھی۔

آدم جی پیر بھائی منزل : آج کل جس عمارت میں پوسٹ آفس ہے اسے آدم جی پیر بھائی منزل کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر کا روپیہ بمبئی کے مخیر تاجر آدم جی پیر بھائی نے دیا تھا یہ عمارت اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ اس میں بورڈنگ کے نگراں رہ سکیں۔ بہت دنوں تک اس میں مولانا سلیمان اشرف کا قیام بھی رہا ہے۔ یہ عمارت ۱۹۰۴ء میں پوری ہوئی۔

کچی بارک : کچی بارک جو آجکل سید محمود کورٹ کے نام سے مشہور ہے کبھی اس میں ستر کمرے تھے۔ ۱۹۰۷ء میں یہ طے کیا گیا کہ کچی بارک کے پچیس کمروں کو پختہ بنا دیا جائے ۱۹۱۳ء میں اس کے دس کمرے اور پختہ بنائے گئے ۱۹۱۸ء میں جب نظام حیدر آباد علی گڑھ آئے تو انھوں نے کچی بارک کے بقیہ کمروں کو پختہ بنانے کے لئے پچاس ہزار روپیہ دیا۔

سمیع منزل : وکٹوریہ گیٹ کے اوپر اب جہاں رجسٹرار آفس ہے ، سمیع اللہ خاں کے نام پر بنا منزل کی تعمیر کی تجویز ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ یہ عمارت ۱۹۱۸ء میں مکمل ہوئی۔

سرسید ہال میں داخل ہوں تو اس کے طرز تعمیر سے اس کے بنانے والوں کے اسلوب فکر، عمل اور انداز کی آئینہ داری کے علاوہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جوش ایثار ہمت و عزم نے سنگ و خشت کا پیکر اختیار کر لیا ہو یہاں جس گوشے کی طرف جائیے تاریخ زندہ حقیقت معلوم ہوتی ہے اور ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارا ماضی ہمارے حال کا حصہ ہے انھیں عمارتوں سے وہ قافلے نکلے جنھوں نے ایک نئی شرقیت کی طرح ڈالی اور انجان زمینوں میں نئے گر انتھو نکالے اور ماضی و حال کے درمیان وہ پل بنایا جس سے جدید ہندوستان کی تعمیر میں مدد ملی۔ حالی نے پہلی بار جب مدرسۃ العلوم کی عمارتوں کو دیکھا تو نظیری کے الفاظ میں اس طرح خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

این کعبہ را بنا نہ بباطل نہادہ اند   صد معنی دقیق دریں گل نہادہ اند

میاں محمد امین

۱۸۷۸ء کا علی گڑھ کالج!

محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول ۱۸۷۵ء میں کھلا، اور ۲۳ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو مجھے اسکول کی پرانی آٹھویں کلاس میں داخل ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ والد مرحوم کی پلٹن مراد آباد میں تھی، پلٹن کو کابل کے خلاف لڑائی میں شریک ہونے کا تار آیا، حکم تھا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر پلٹن ضرور پشاور کو روانہ ہو جائے، اس وقت میری عمر ۱۲ برس آٹھ مہینے کی تھی، والد مرحوم نے ایک خط سرسید کے نام لکھ کر میرے حوالہ کیا اور ایک سپاہی کو ساتھ کیا کہ مجھے علی گڑھ پہنچا دے، میں ایک شلوار اور لٹھے کے کوٹ میں یکہ پر سرسید کی کوٹھی پہنچا اور خط بذریعہ کلن سردار اندر بھجوایا، چند منٹ میں میں نے ایک بلند آواز سُنی کہ "بلاؤ" چنانچہ میں بیرے کے ساتھ اندر گیا اور سرسید کی داڑھی، نورانی چہرہ اور گلے کی رسولی پر سفید رومال بندھا ہوا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، سرسید نے پاس بلا کر سر پر دست شفقت پھیرا، اور صوفے پر بیٹھا لیا، والد کا حال پوچھنے کے بعد انہوں نے ایک آواز دی "میاں محمد علی" فوراً ایک سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان خوش رو کمرہ میں داخل ہوا، سرسید نے نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا "ہمارے ایک دوست کا بیٹا ہے اسکول میں داخل ہونے کو آیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو بورڈنگ میں داخل کرنے سے پہلے چند روز اسے اپنے پاس رکھوں تم ان کو لے جاؤ، بھائیوں کی طرح اپنے کمرہ میں رکھو، خبردار ان کو پنجابی ڈگا

نہ کہنا" اور روز صبح کو چائے کے وقت اپنے ساتھ میرے پاس لایا کرو"۔ سید محمد علی صاحب سر سید کے نواسے تھے اور ان کے دو چھوٹے بھائی سید محمود علی اور سید حامد علی کوٹھی کے ایک حصے میں رہتے تھے اور تین کمرے ان کی رہائش کے لئے علیحدہ کر دئے گئے تھے سید محمد علی مرحوم نے مجھ کو اپنے کمرے میں جگہ دی، دوسرے دونوں بھائی پاس والے کمرے میں رہتے تھے، پہلا دن تو خیریت سے گذرا، دوسرے ہی دن سے محمد علی صاحب نے مجھ کو "پنجابی ڈگا" کہنا شروع کر دیا، مجھ کو بُرا تو معلوم ہوا مگر ان کا برتاؤ محبت کا تھا اور میں نے اپنے کو ڈگا کہلوانے پر کوئی اعتراض نہ کیا، دو چار دن بعد ہی محمود علی و حامد علی جو مجھ کو میاں امین کہتے تھے پنجابی ڈگا کہہ کر مخاطب کرنے لگے اور چند روز میں ڈگا میری چڑ بن گئی، ایک روز اتفاق سے چائے کے وقت سر سید کی موجودگی میں محمد علی نے مجھ کو ڈگا کے نام سے مخاطب کیا، سر سید نے سن لیا اور کڑک کر سید محمد علی سے کہا "کیا یہ ہمارے حکم کی تعمیل ہے" اور تینوں بھائیوں کو چائے کی میز پر سے اٹھ جانے کا حکم دے دیا اس دن سے ڈگا کہنا بند ہوا، سر سید نے متواتر تین چار روز چائے پر یا کھانے پر دریافت کیا " اب تو لونڈے ڈگا نہیں کہتے ؟" ہم سب اور لوگ جو سر سید سے ملنے آتے ان کو سرکار کہتے تھے۔ چنانچہ میں نے بھی سرکار ہی کہنا شروع کیا اور اطمینان دلایا کہ اب مجھ کو کوئی ڈگا نہیں کہتا۔ میں سید محمد علی صاحب مرحوم کے ساتھ اسکول جایا کرتا اور ۴ بجے دوپہر کی چائے کے بعد ہم سب بورڈنگ ہاؤس میں کھیلنے کے لئے جایا کرتے تھے، اس وقت بورڈنگ ہاؤس میں صرف ۱۳ طلبہ تھے جن میں کچھ مولوی محمد اکبر صاحب منیجر بورڈنگ ہاؤس کے ساتھ رہتے تھے، بدر الحسن عرف "بدو" و علاء الحسن مولوی صاحب کے بیٹے اور میاں عقیل اور میاں شمس الحسن عرف "چھمن" مولوی صاحب کے بھتیجے تھے جن سے میرا دوستانہ ہو گیا، ۲۰ دن کے بعد سید صاحب نے مولوی محمد اکبر صاحب سے کہا، آج میں میاں محمد امین کو آپ کے پاس بھیجدوں گا ان کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر لو اور اپنے پاس رکھو" چنانچہ دوسرے روز

میں مولوی صاحب کے خاندان میں شامل ہوگیا، ان کا کھپریل کا کچا مکان ٹھیک اس جگہ تھا جہاں اب بورڈنگ ہاؤس کا صدر دروازہ ہے، کوٹھی کے قیام میں میں نے دیکھا کہ سرسید ۸ بجے سے ۲ بجے شام تک تحریر کا کام کرتے تھے، کسی کسی وقت ان کا مذاق راجہ جے کشن داس ریٹائرڈ سب جج سے ہوتا تھا راجہ صاحب موصوف بھی کوٹھی کے ایک حصے میں رہتے تھے ان کے پاس ایک پستہ قد سبزہ پہاڑی ٹٹو بھی تھا جس پر وہ مجھ کو اکثر سوار کراتے تھے، اس امید پر کہ ٹٹو مجھ کو گرادے گا اور سید محمد علی وغیرہ ہنسیں گے، اتفاق ایسا ہوا کہ ان کو ہنسنے کا موقع نہ ملا۔ میں قریب قریب ہر روز اسکول کے وقت سے پہلے سرسیدؒ کی کوٹھی پر جایا کرتا اور سرسید کوئی نہ کوئی پھل کھانے کو دیتے تھے، اور بورڈنگ ہاؤس کے قیام کا حال پوچھتے تھے، اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس میں گلی ڈنڈا، کانی ڈنڈا، کبڈی بورڈرس کے عام کھیل تھے، اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ہنری جارج ایم۔ پی سڈنس تھے، ان کی عمر اس وقت اندازاً تیس برس تھی، بڑے ہنس مکھ اور خوش پوش جوان تھے۔ ہر روز شام کو وہ کھیل دیکھنے آیا کرتے تھے۔ بڑے تنک مزاج تھے کہ اکثر شام کو کوئی لڑکا کھیل بند ہونے کے بعد گڈ ایوننگ کہہ دیتا تھا تو روٹھ جاتے تھے، دوسرے دن کھیل پر نہ آتے پر لڑکے سمجھ جاتے تھے کہ سڈنس صاحب روٹھے ہیں، چنانچہ بورڈنگ کے سب لڑکے ان کی کوٹھی پہنچ جاتے اور کوٹھی کے برآمدے میں کھڑے ہوکر چلاتے ہم معافی مانگنے آئے ہیں۔ سڈنس صاحب خوش ہوجاتے اور لڑکوں کے ساتھ ہوجاتے، سرسید نے "شہر کول" جو علی گڑھ کے ایک کچے قلعے کا نام ہے جو شہر سے دو میل کے فاصلے پر ہے، کالج کے لئے اس خیال سے تجویز کیا تھا کہ ضلع علی گڑھ ملحقہ بلند شہر میں مسلمان رئیسوں کی تعداد بمقابلہ ممالک مغربی و شمالی کے دیگر اضلاع کے بہت زیادہ تھی اور سرسید کو امید تھی کہ ان رؤسا کی مدد سے ایک بڑی درس گاہ بنانے میں پوری مدد ملے گی، مگر چند سال تک کوئی مدد نہ ملی، لوگوں نے سرسید کو نیچری کا خطاب دیا بجائے مدد دینے کے سرسیدؒ کے کاموں میں روڑا اٹکانا شروع کیا، اور

اس زمانہ کے لکھنؤ کے اودھ پنچ نے سرسید کا مذاق اڑانا شروع کیا، اس اخبار میں ایک نظم چھپی جو اخبار کے دو صفحوں پر تھی وہ سب تو مجھ کو یاد نہیں، مگر اخیر کے چند مصرعے یہ تھے:

چھل چھل لگی ٹوپی میں ہو　　دل جوشش آزادی میں ہو

ہم پھبتیاں تم پر کہیں　　ٹولو ہے حشو جانگلو

لینا پکڑنا بھائیو جانے نہ پائے جانور

سرسید اس اخبار کو پڑھتے اور ان کے دوست راجہ جے کشن داس، مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم اور سید زین العابدین مرحوم چاہتے کہ اودھ پنچ کے مضمون کا جواب دیا جائے مگر سرسید اس بات کو پسند نہ کرتے حالانکہ اودھ پنچ کے مضامین نے ملک میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے خلاف ایک لہر پیدا کر دی تھی اور کالج کے لئے چندہ بہت کم اور ہلکی رفتار سے آتا تھا۔

۱۸۷۹ء میں بورڈروں کے دل میں کرکٹ کے کھیل کا خیال پیدا ہوا، اس وقت بورڈروں کی تعداد کم تھی نہایت معمولی لکڑی کے ہینڈل والے بیٹ منگائے گئے اور کرکٹ شروع ہوا، پنڈت اما شنکر مسرا ریاضی کے پروفیسر اور کرکٹ کے مشہور کھلاڑی تھے، انھوں نے طلبار کو کرکٹ سکھانا شروع کیا۔ اور پہلی کرکٹ میچ ۱۸۸۱ء میں مرادآباد کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے زیر کپتانی محمد رفیق صاحب مرحوم مرادآباد میں ہوئی، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب سی۔ ایم۔ جی۔ اور خان بہادر سید زین العابدین صاحب مرادآباد میں سب جج تھے، علی گڑھ کے طلبار کی خوب خاطر مدارات ہوئی ابر و بارش کی وجہ سے مسلسل کھیل نہ ہو سکا، اور میچ مشکل سے چار روز میں ختم ہوا، علی گڑھ والے میچ جیت گئے، اور شہر والوں نے سیروں نہیں بلکہ منوں مٹھائی جلتی ہوئی ٹیم کے لئے ان کی قیام گاہ پر پہنچائی، احمد حسین خاں صاحب ساکن مرادآباد ٹیم میں شامل تھے۔ انھوں نے علی گڑھ ٹیم کو نہایت مرغن کھچڑی اور شلجم کا اچار کھلایا۔ میچ جیتنے کے بعد دہلی کی روانگی سے قبل جب مولوی خلیل احمد صاحب نے ایک نہایت

مختصر سا مضمون عربی میں لکھ کر مجھ کو یاد کرا دیا، میچ کھیلنے کے بعد آخری شب کو کھانے کے بعد کپتان احمد حسین خاں صاحب نے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور میں نے عربی کی نظم سنائی کھانے پر تقریباً پچاس آدمی تھے، نظم سن کر مسلمانوں میں بڑا جوش پیدا ہوا، اور لوگوں نے چلانا شروع کیا، کہ لوگ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو ناحق بدنام کرتے ہیں۔ بلاؤ جامع مسجد کے پیش امام صاحب کو اور کہو ان سے کہ عربی میں چند فقرے ایسے بول دیں جیسے علی گڑھ کے ایک ادنیٰ کلاس کے طالب علم نے ابھی سنائے، دلی والوں پر بھی اس کا بہت اثر ہوا، اور مہینے دو مہینے کے اندر دس بارہ لڑکے محمڈن کالجیٹ اسکول علی گڑھ میں داخل ہوئے ایک دوسری بات جس نے یکایک علی گڑھ کو مشہور کر دیا یہ تھی کہ انٹرنس کلاس کے تیرہ طالب علم کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان میں شامل ہوئے اور تیرہ کے تیرہ پاس ہو گئے، کالج کے لئے جو کچھ چندہ ملا وہ زیادہ تر حیدرآباد دکن کی ریاست سے ملا۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں سرسید نے انسٹی ٹیوٹ میں ایک بڑا بھاری جلسہ کیا۔ روسا کو مدعو کیا اور رقعہ دعوت میں لکھ دیا کہ چندہ نہ مانگا جائیگا۔ اس جلسہ میں سید صاحب اور نواب محسن الملک نے پُر درد تقریریں کیں۔ سید زین العابدین نے دردانگیز لہجہ میں یہ شعر پڑھنا شروع کیا ؎

مری تربت پہ سب روئے نہ رویا پر وہ سنگیں دل
قیامت ہے دو آنسو بھی نہ چشم یار میں نکلے۔

اس وقت مولوی صاحب کو دلی جوش تھا زار زار روتے اور یہ شعر پڑھتے جاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ چند منٹ کے اندر دو لاکھ روپے کے وعدے ہوئے اور یہ روپیہ بہت جلد ادا ہو گیا اس واقعہ کے بعد سے رؤسا علی گڑھ اور بلند شہر نے سرسید کی مدد کرنا شروع کی اور یہ اس مدد کا نتیجہ ہے جو آج آپ دیکھ رہے ہیں۔

سنہ ۱۸۸۲ء و سنہ ۱۸۸۳ء میں بورڈوں کی تعداد ۳۰۰ تک پہنچ گئی، پکی بارک میں تیرہ چودہ کمرے

تھے، زیادہ تر بورڈر کچی بارک میں رہتے تھے جس میں ۷ سے زیادہ کمرے تھے، اور زیادہ تر وہ طلباء جنھوں نے زندگی میں نام پیدا کیا کچی بارک والوں میں سے تھے، طلباء کو کچی بارک اس لئے زیادہ پسند تھی کہ اس کے سامنے کھیلنے کے لئے کھلا میدان تھا جو پکی بارک کے سامنے نہ تھا۔

سید محمود صاحب مرحوم اس وقت ملازمت میں تھے اور چھٹیوں میں اکثر علی گڑھ آتے تھے، مجھ کو ان کی خدمت میں اس قدر نیاز حاصل ہو گیا تھا کہ میں ان سے آزادی سے گفتگو کر سکتا تھا، سرسیدؒ کے بڑے کمرے میں بڑی بڑی نو الماریاں کتابوں سے بھری رکھی تھیں؛ جن میں بلا مبالغہ چارسو کے قریب مجلّد قانون کی کتابیں سجی تھیں، ایک لڑکا جو اسکول میں سکنڈ ریڈر پڑھ رہا تھا اور وہ اس کا سال بھر کا کورس تھا کس طرح یہ خیال کر سکتا تھا کہ کسی شخص نے ان سب کتابوں کو پڑھا ہوگا۔ ایک دن میں نے سید محمود مرحوم سے کہا کہ اتنی کتابیں تو کوئی پڑھ نہیں سکتا، کیا آپ نے لوگوں پر اپنی لیاقت کا سکہ جمانے کے لئے زرِ کثیر خرچ کر کے یہ کتابیں جمع کی ہیں؛ مرحوم بہت ہنسے اور فرمایا کہ جاؤ سید محمد علی کو لے آؤ اور جب سید محمد علی کو لے آیا تو فرمایا جس الماری سے چاہو ایک کتاب نکال لو میں نے کرسی پر چڑھ کر سب سے اوپر والے خانے میں سے ایک مجلد کتاب نکالی، سید محمود مرحوم نے سید محمد علی سے کہا کہ اس کو بلا سوچے سمجھے کھولو اور اوپر کی سطر کے چند الفاظ پڑھو سید محمد علی نے آٹھ دس الفاظ پڑھے، سید محمود نے فرمایا کہ بس اور شرع محمدی کی رو سے جو تفصیل تقسیم جائداد کے متعلق تھی اردو میں بیان کرنا شروع کر دی، ایک دریا تھا کہ بہنا شروع ہو گیا اور ایک گھنٹے تک اردو زبان میں اس طرح قانون کو سنایا کہ گویا کوئی کتاب سے عبارت پڑھ رہا ہے، مضمون میں سے میرے پلّے تو کچھ نہ پڑا مگر ان کی تقریر جاری رہی اور درخواست کی کہ اب آپ اس تقریر کو بند کریں اگر خدا کو منظور ہوا تو دس برس کے بعد آپ سے شرع محمدی کے متعلق سبق لوں گا، سید محمود مرحوم فی البدیہہ انگریزی کثرت سے پیتے تھے،

اور اس وقت ایک سو سگریٹ کے بکس کی قیمت ساڑھے چھ روپے تھی، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اتنا روپیہ دھوئیں کی شکل میں اڑاتے ہیں جس سے دو تین غریب طلبار تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، ایک آدھ منٹ تک کچھ سوچا پھر فرمایا، تم ٹھیک کہتے ہو، میں آج سے سگریٹوں کا خرچ آدھا کر دوں گا، اور ڈیڑھ سو قریب روپیہ ماہوار بچے گا وہ غریب طلبار کو وظائف دینے کے لئے کالج میں داخل کر دوں گا، اسس وعدے کی پوری پوری تعمیل ہوئی، جب سرسید کو روپے آنے پر اس کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ کو بورڈنگ ہاؤس سے بلوا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ میاں امین جو کام مجھ سے برسوں میں نہ ہو سکا وہ تم نے ایک دن میں کر دیا۔

سید محمود مسلمہ طور پر ہندوستان میں سب سے کم عمر اور سب سے لائق ہائی کورٹ کے جج مانے جاتے تھے ان کو اس بات کا مذاق تھا کہ اپنے فیصلوں میں مناسب موقعوں پر اردو فارسی نظم درج کریں، ایک قتل کے مقدمہ میں انھوں نے اپنے فیصلہ میں یہ شعر لکھا ؎

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اس فیصلے کی ایسی دھوم ہوئی کہ قانون پیشہ وغیر قانون پیشہ سب کو فیصلہ دیکھنے کی خواہش ہوئی، الہ آباد کے ایک وکیل صاحب نے اس فیصلے کی ہزاروں نقلیں چھپوائیں اور خاصا روپیہ کمایا، سید محمود نے بورڈنگ ہاؤس میں بیت بازی کا سلسلہ جاری کر کے بورڈوں کو نظم کی طرف متوجہ کیا، شام کا کھانا کھانے کے بعد سید محمود بورڈنگ ہاؤس میں آجاتے، کچی بارک کے سامنے چار پائیاں بچھ جاتیں اور بیت بازی اس طرح شروع ہوتی کہ سید محمود مرحوم اکیلے اور ان کے خلاف پارٹی میں ۲۰ - ۲۲ طلبار جن میں سے نصف تو میدان میں رہتے اور نصف اپنے کمروں میں گھسے مختلف شعرار کے دیوان کھول کر سید محمود صاحب کو جواب دینے کے لئے اشعار ڈھونڈتے تھے، مرحوم اس بیت بازی میں سگریٹ

نہ پہنچتے، مردان میواتی چوکیدار کا سیدھی نے کا چھوٹا حقہ جس کو مرحوم گلگرہ کہتے تھے، بھر کر سامنے رکھ دیا جاتا تھا جب نیند آنے کو ہوتی تو متواتر دو تین ایسے شعر پڑھتے جن کا جواب دینا نہ صرف نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا، بیت بازی جیتنے کے لئے وہ ایسے اشعار پڑھتے جو "ڑ" "غ" "ط" پر ٹوٹیں، بورڈر جواب نہ دے سکتے بیت بازی فتح ہو جاتی اور قریب دو بجے کے مرحوم کوٹھی کو روانہ ہوتے، دس پانچ بورڈر کوٹھی تک پہنچانے جاتے۔

اس زمانہ سے ذرا قبل مسٹر سڈنس کالج کی نوکری چھوڑ کر کالون اسکول لکھنؤ کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے، ان کی جگہ چند ماہ کے لئے مسٹر لارزمین ہیڈ ماسٹر ہوئے، اسی زمانہ میں سید محمود مرحوم ولایت گئے اور مسٹر بک کو اپنے ساتھ کالج کی پرنسپلی کے لئے لائے، بک مرحوم کی عمر اس وقت ۲۲ یا ۲۴ برس کی تھی، نہایت سادہ لباس، سر پر لمبے لمبے بال، ہنس مکھ چہرہ تھا۔ فرسٹ اور سیکنڈ ایر کے طلبار میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہ معصوم سا بچہ کیا پرنسپلی کرے گا، اور سید محمود مرحوم صاحب اس کو کیوں لے آئے؟ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں بک صاحب مرحوم نے طلبار کی یہ رائے بالکل پلٹ دی، سب کے دلوں پر سکہ جما لیا اور یہ ثابت کر دیا کہ ان سے زیادہ قابل اور ہمدرد کوئی پرنسپل مل ہی نہیں سکتا ہے،

۱۸۸۴ء میں سید صاحب فراہمی چندہ کے لئے مع اپنے رفقار پنجاب کے سفر کو گئے، پنجاب میں چندہ بھی بہت ملا اور پنجاب والوں نے سید صاحب کی پارٹی کی خاطر مدارات میں دقیقہ نہ اٹھا رکھا، جب سفر سے واپس آئے تو اظہار کیا کہ میں زندہ دلان پنجاب سے بہت خوش آیا ہوں، مناسب ہے کہ ہماری ایک کرکٹ ٹیم پنجاب کا سفر کرے۔ اس خواہش کی تعمیل میں فوراً ایک بارہ کھلاڑیوں کی ٹیم بنائی گئی، اس ٹیم کو ایک گھنٹہ صبح اور دو گھنٹے شام بلاناغہ بیٹنگ۔ اور بالنگ کی پریکٹس کرائی جاتی تھی، ٹیم ایک بالکل نئے طریقے پر تیار کی گئی اور وہ طریقہ یہ تھا کہ محمد فصیح و محمد احمد مرحوم پتھر اور ہڈی کی دو

ٹیمیں بنائی گئیں جس کا کام صرف وکٹ کو بچانا تھا، رَن حاصل کرنے کی ان کو اجازت نہ تھی، محمد فصیح دبلے پتلے تھے پتھر کی دیوار کہلاتے، اللہ محمد احمد جو دہرے جسم کے تھے ان کو مٹی کی دیوار کا خطاب دیا گیا تھا، نومبر ۱۸۹۴ء میں جب پنجاب کے سفر کا وقت آیا تو علی گڑھ کے انگریزوں نے لکھا کہ سفر پر جانے سے پہلے ہم سے ایک ٹسٹ میچ کھیل لو، یہ بات منظور ہو گئی انگریزوں نے آگرہ، بلند شہر و میرٹھ سے نامی کرکٹ کھلاڑی بلوائے اور تین دن کا میچ ٹھہرا، کالج والوں کے کھیلنے کی پہلی باری آئی، دس بجے دن کے دونوں ٹیمیں میدانِ کارزار میں جا ڈٹیں، ساڑھے پانچ بجے شام کو کھیل بند ہوا تو کالج والوں کے صرف ۹ رَن تھے، دوسرے دن پھر دس بجے کھیل شروع ہوا، اور لنچ کے وقت تک صرف تیرہ رَن ہوئے، انگریزوں کے کپتان نے کہا یہ کوئی کرکٹ نہیں، اور ہم اس میچ کو جاری رکھنا نہیں چاہتے، کالج نے دونوں ٹیموں کو واپس بلا لیا، اور مرزا نذیر بیگ حیدرآبادی، محمد صدیق کو ان کی جگہ بھیجا، مرزا نذیر بیگ کو آف کا ہٹ لگانے کی مشق کرائی گئی تھی، اور محمد صدیق اوّل درجہ کے لگ ہٹر تھے ان کو ہدایت کی گئی کہ جس قدر جلد ہو سکے اسکور بڑھاؤ، چنانچہ لنچ کے بعد اور چائے کے وقفہ سے پہلے کالج کا اسکور ۱۳۸ ہو گیا، چائے کے بعد کالج والوں نے دست برداری دی اور انگریزوں کو کھلانا شروع کیا، سید محمود علی مرحوم جن کو انگریز "ہاٹ بالر" کہتے تھے اس قسم کی گیند پھینکتے تھے کہ اس میں ہٹ لگانا ناممکن تو نہیں مگر نہایت مشکل تھا، ڈیڑھ گھنٹے کے اندر سید محمد علی نے چھ وکٹ لئے اور باقی بولروں نے چار، میچ ختم ہونے پر ان کے رَن صرف سترہ تھے، میچ دیکھنے والے بہت خوش ہوئے اور امید دلائی کہ پنجاب ٹور میں ضرور کامیابی ہو گی، پہلا میچ دہلی میں ہوا جو کالج والے ایک ہی دن میں جیت گئے، دوسرا میچ میرٹھ چھاؤنی کے انگریزوں سے ہوا، اس میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کو شکار ٹیم اور خاص کر میں تمام عمر نہیں بھول سکتا، میچ شروع ہونے کے آدھ گھنٹے بعد مجھ کو لرزہ سے بخار آیا اور میں پویلین میں جا کر چوکیدار کی چارپائی پر جا لیٹا، دو ایک کمبل

جو ہمارے ساتھ تھے اپنے اوپر ڈال لئے، منہ سر لپیٹ لیا مگر لرزہ کم نہ ہوا، میں نے وزیر خاں کرکٹ کے ملازم کو آواز دی کہ میرا بدن دباؤ، فوراً میرا بدن دبنا شروع ہوگیا، پندرہ بیس منٹ میں مجھ کو پسینہ آیا، بخار میں قدرے کمی ہوئی، تو میں نے منہ پر سے کمبل اٹھایا، دیکھتا کیا ہوں کہ اب بک صاحب مرحوم بدن دبا رہے ہیں، میں نے گھبرا کر اٹھنا چاہا تو انھوں نے مجھے مضبوطی سے پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا اور کہا کہ چپ چاپ لیٹے رہو، ہمیں تمھاری بہت ضرورت ہے، ذرا دیر بعد ڈاکٹر عبدالرحیم صاحب میرٹھ کے مشہور اور قابل اسسٹنٹ سرجن دوا لیکر آگئے جس کی دو خوراکیں آدھ آدھ گھنٹے بعد پئیں اور تین بجے سہ پہر کو پھر کھیل میں جا شریک ہوا، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بک صاحب کے اس طرزِ عمل سے ہم لوگوں کے دلوں پر کیا اثر ہوا ہوگا اور کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کے کالجوں کے پرنسپلوں میں کون اپنے طلبار کے ساتھ ایسی محبت سے خدمت گاری کرنے کو معیوب نہ سمجھے گا۔

بک صاحب مرحوم کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مسٹر ریلے و مسٹر آرنلڈ پروفیسروں کو ہمراہ لاکر ہفتہ میں دو مرتبہ طلبار کے ساتھ ڈائننگ ہال میں رات کا کھانا کھایا کرتے تھے، یہ طرزِ عمل بھی استادوں اور شاگردوں میں محبت اور یگانگت پیدا کرنے والا تھا، اس کے علاوہ چوں کہ کرکٹ ٹیم کے طلبار کو انگریزوں کے ساتھ لنچ کھانا ہوتا تھا بک صاحب ہر دوسرے روز ٹیم کے دو طلبار کو اپنے یہاں کھانے پر بلاتے اور صاحب موصوف اور ان کی ہمشیرہ صاحبہ چھری اور کانٹے سے میز پر کھانا سکھاتے اور طلبار کا جذبۂ یگانگت بڑھاتے۔

۱۴ فروری ۱۸۸۷ء کو کالج میں پہلی مشہور اسٹرائیک ہوئی جس میں بیسوں طلبار آناً فاناً اپنا سامان لے کر کالج کے احاطے سے باہر ہو گئے، اس شورش کی وجہ یہ تھی کہ ایک صاحب میر سید حسین عرف بانگڑ دبعد سرکے رہنے والے بورڈنگ میں تھے اور وہ چھٹی کے دن اکثر شہر جاتے تھے اور کھانے کے وقت ڈائننگ ہال سے غیر حاضر رہتے واپس آنے پر بارک کے بیرے کو حکم دیتے تھے کہ

میرا کھانا کمرہ میں لے آؤ، اسی طرح سے بعض اور بورڈر بھی کمروں میں کھانا منگاتے تھے اور نوکروں کو چینی کے برتن اڑا لینے کا موقع ملتا تھا اور ڈائننگ ہال کا نقصان ہوتا تھا، سرسیدؒ نے حکم دے دیا کہ کمروں میں کھانا قطعی نہ جایا کرے اور نوکروں کو حکم سنا دیا کہ کمروں پر کھانا نہ لے جایا کریں، ایک اتوار کے دن سید حسین صاحب بارہ بجے دن کے شہر سے واپس آئے اور راستے میں ڈائننگ ہال جا کر کمرے میں کھانا بھیجنے کا حکم دیا، خانساماں نے بموجب حکم کھانا بھیجنے سے انکار کیا، سید حسین صاحب نے خانساماں کے دو چار دھپ لگائے وہ روتا ہوا سیدھا سرسید کی کوٹھی پہنچا اور واقعہ بیان کیا۔ سید صاحب نے منیجر صاحب کے پاس تحریری حکم بھیجا کہ سید حسین کو بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا جائے، ایک بجے دن کو اس حکم کا حال معلوم ہوا فوراً مولوی صبغۃ اللہ نے شعر تصنیف کیا ؎

اگر مدرسے سے یہ دل چیر سد ہارے　　پڑھیں ہم کسے خس کم جہاں پاک سارے

چند منٹ میں کچی بارک کے سامنے بڑی دھوم سے اس شعر کا کورس ہوا، دو بجے کے بعد عزیز مرزا صاحب کے کمرے میں دو چار بورڈر جمع ہوئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ آج تو سید حسین نکالا گیا ہے کل کو ہماری اور تمھاری باری بھی آجائے گی اور تجویز ہوئی کہ چار بجے جب سرسید صاحب بورڈنگ ہاؤس میں آویں تو ایک وفد ان کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہو، کہ سید حسین کے نکالے جانے کا حکم منسوخ کیا جاوے، چنانچہ چار بجے ہم بورڈروں کا ایک وفد بسرکردگی عزیز مرزا، شوکت علی دشتر بے مہار اور امام علی سرسید کے روبرو پیش ہوا جونہی ممبرانِ وفد نے منسوخی حکم کا ذکر کیا، سید صاحب کو جلال آگیا، مونڈھے پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مجھ کو پرواہ نہیں ہے تم سب چلے جاؤ۔ بورڈنگ ہاؤس میں کہرام سا مچ گیا، بارہ برس کی عمر سے اونچے جتنے بورڈر تھے سب اپنا اپنا اسباب لیکر ظہور گیٹ کے سامنے جمع ہوگئے ضلع کی کچہری جو احاطہ بورڈنگ سے ملی ہوئی ہے ابھی بند نہ ہوئی تھی کچہری کے لوگ جمع ہو گئے، ڈپٹی محمد کریم صاحب مرحوم بھی موقع پر آگئے، پہلے ذرا سختی، پھر

محبت بھرے الفاظ میں بورڈروں کو واپس جانے کی ہدایت کی، قصبہ جلالی کے میر صاحب بھی مجمع میں موجود تھے انھوں نے بورڈروں سے کہا میرا گھر حاضر ہے وہاں تشریف لے چلو، فوراً یکے اور گاڑیاں موجود ہو گئیں اور شورش کرنے والے طلبا، میر صاحب کی بڑی حویلی میں جو وسط شہر میں ہے پہنچ گئے، پلاؤ زردے کی دیگیں چڑھ گئیں اور عبد اللہ تھیٹریکل کمپنی کے مینجر فری پاس لے کر حاضر ہو گئے، کہ جب تک آپ لوگوں کا قیام میر صاحب کی حویلی میں ہے مفت تھیٹر دیکھیے، پھر کیا تھا "دن عید اور رات شب برات"۔

دو دن کے بعد کمسن بورڈر جو بورڈنگ ہاؤس میں رہ گئے تھے ایک وفد بنا کر سرسیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے بہت سے بڑے بھائی بورڈنگ سے چلے گئے ہیں ہم بہت پریشان ہیں اور پڑھنے لکھنے میں ہمارا دل نہیں لگتا، سرسیدؒ نے ان کو یہ شعر سنایا اور سمجھایا ؎

زکوٰۃ مال بدر کن کہ فضلۂ رز را   چو باغباں ببرد بیشتر دہد انگور

بچے مایوس ہو گئے اور باغی بورڈروں کے پاس خبر بھیجی کہ یا تو واپس آجاؤ ورنہ ہم کو بھی اپنے پاس بلا لو، باغی بورڈروں نے کہہ دیا کہ جو کچھ ہوگا سب کی رائے سے ہوگا پارٹی سے کوئی جدا نہ ہوگا، اخیر فروری میں سالانہ کھیل تماشہ بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے ایک صاحب کو پریشانی ہوئی کہ امسال اسپورٹس کا جلسہ اچھا نہ ہوگا رحمٰن حسین خاں شاہجہان پوری کو انگریزی کھانوں کا بہت شوق تھا، محمد رفیق صاحب نے ان کو لنچ پر بلایا اور قابو میں کر لیا، اسی شام کو میں سائنٹفک سوسائٹی میں ٹہلنے گیا تھا کہ بک صاحب اور ان کی ہمشیرہ مل گئے، بک صاحب نے فرمایا امین ذرا دیر کے لئے میرے ساتھ چلو میں شہر تک تم کو اپنی ٹم ٹم سے پہنچا دوں گا، چنانچہ میں ان کے ساتھ کوٹھی گیا، پیار اور محبت کی باتوں سے انھوں نے مجھ کو گرویدہ کر لیا اور فرمایا کہ رات کا کھانا کھا کر جانا، چونکہ شام کے قریب مس صاحبہ نے دو اور بورڈروں کے نام لئے جو باغیوں میں سے تھے اور کہا کہ پرچہ بھیج کر کھانے کیلئے ان کو بھی بلا لو چنانچہ

میں نے پرچہ لکھدیا اور بک صاحب کی ٹم ٹم شہر سے دونوں بورڈروں کو لے آئی، اب گویا بغاوت کے آٹھ دن بعد چار بورڈر اپنی جماعت سے باہر ہو گئے، دوسرے دن آٹھ بجے صبح بک صاحب مجھ کو لے کر شہر میں میر صاحب کے مکان پر پہنچ گئے اور جو بیس تیس بورڈر وہاں موجود تھے ان کو ایک نہایت پر درد لکچر سنایا، چند ہی منٹ میں باغیوں پر ایسا اثر ہوا کہ وہ زار و قطار رونے لگے اور بک صاحب سے کہا کہ ہم آپ کے پیچھے چلنے کو تیار ہیں خواہ آپ ہمیں کنوئیں میں ڈھکیلیں خواہ جہنم میں۔ اسٹرائیک ختم ہو گیا اور شام کو سب بورڈر بورڈنگ ہاؤس میں واپس آ گئے، چار بجے شام کو سید صاحب بورڈنگ ہاؤس میں تشریف لائے اور سب بورڈروں کو جمع کر کے مختصر سی اسپیچ دی اور فرمایا ؎

سگے در چاہ افتد کند منجلاب

حکم دیا کہ عزیز مرزا، شوکت علی شتر بے مہار، امام علی اور سید عبدالحمید دہلوی بورڈنگ ہاؤس سے خارج کئے گئے اور فوراً احاطہ کالج سے نکل جاویں، باقی طلبہ کو میں خوشی سے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کی اجازت دیتا ہوں، ہر ایک واپس آمدہ بورڈر باری باری سرسید کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر ان سے دعائے خیر و سلامتی لیکر اپنے اپنے کمرے کو چلا گیا۔

اس شورش کا تین چار ماہ تک کالج پر بُرا اثر پڑا کہ آمد قریب قریب بند ہو گئی مگر تین چار ماہ کے بعد یکایک بورڈروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔

بک صاحب نے آنے کے کچھ عرصہ بعد اور اردو سے تھوڑی واقفیت ہو جانے پر یہ خیال کیا کہ اردو نظم خیالی ہے نیچرل نہیں، اس پر میاں محمود میرٹھی نے بک صاحب کو نیچرل نظم سنانا شروع کی، نمونہ کے طور پر دو شعر پیش کرتا ہوں ؎

یکم تھی جنوری اور نو بجے پر دس منٹ گذرے

ابھی کی بات ہے میں بھی شریک سیر بستاں تھا

گلوں کی ٹہنیاں تھیں جھنٹ اور پر ہنسیخ بلبل تھی

ابھی کی بات ہے میں بھی شریک سیر بستاں تھا

ایک روز بک صاحب کچی بارک کے سامنے بورڈروں سے باتیں کر رہے تھے کہ میاں محمود آگئے، روڑکی کے رہنے والے ایک ابراہیم خاں بورڈر تھے جن کے والد کی عام سوداگری کی دوکان تھی، بک صاحب نے محمود سے کہا کہ ابراہیم کی بابت ایک شعر کہو، محمود نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

کل ابراہیم خاں اس طرح کڑکے	سلائی بیچیں کنگھے رہڑکے

ایک شام کو جب سب بورڈر کھانے کے کمرے میں تھے محمود کے کمرے میں لیمپ کی بتی اونچی ہو جانے سے لیمپ پھٹ گیا پاس والے کمرے کے بورڈر عبدالرحمٰن کو بو آئی، اس نے شور مچا دیا۔ آگ لگ گئی، ڈائننگ ہال سے سب طلبا دوڑ پڑے اور ریت ڈال کر آگ بجھادی، ذرا دیر میں بک صاحب آگئے اور محمود سے پوچھا ویل کیا ہوا محمود نے جواب دیا۔

نہ پڑتا اس پہ گر ریتا تو جلتے لیمپ ٹوٹا تھا

رضائی خاک ہو جاتی دری میں آگ جا لگتی

بک صاحب نیچرل شاعری کے جلد قائل ہو گئے اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس میں شاعری کا چرچہ ہو گیا تھا۔ محمد داؤد مرحوم کا کلام کسی طرح نظیر اکبر آبادی اور داغ کے کلام سے گرا ہوا نہ تھا۔

بورڈنگ ہاؤس میں کھانا اچھا نہ ہونے کی شکایت شروع سے چلی آئی ہے ۱۸۸۴ء کے اخیر میں دہلی سے سید صاحب نے سعید احمد صاحب کو بلا کر باورچی خانہ کا داروغہ بنایا وہ

گھی اور مصالحہ وغیرہ اپنے سامنے گوشت میں ڈلواتے تھے اور کھانا تیار ہو جانے پر ایک بڑی سی قلفی جس میں گھی ہی گھی ہوتا تھا اپنے لئے علیحدہ نکال لیتے۔ تھے جس کو وہ دن بھر پیا کرتے تھے کھانا پکتے وقت سید احمد صاحب کرسی بچھا کر باورچی خانے میں ڈٹے رہتے تھے جو چپاتیاں پکتی جاتی تھیں وہ ان کے قریب بڑے دسترخوان پر جمع ہوتی تھیں، باورچیوں نے ایک نیا ڈھنگ چوری کا نکالا، چپاتیاں پکانے والے تین چار اکٹھی کر کے اس طرح دسترخوان پر پھینکتے کہ وہ سالن کے دیگچے میں جا گرتیں اور گھی میں تر بتر ہو جاتیں، گوشت پکانے والا باورچی چلاتا "ابے دیکھ کر نہیں پھینکتا" دوسرا جواب دیتا "ذرا ہاتھ بہک گیا، کیا آفت آگئی نکال لو" اس طرح سید احمد صاحب کی آنکھوں کے سامنے ۳۰۔ ۴۰ گرم گرم چپاتیاں گھی میں تر کر لی جاتیں سید احمد صاحب اور باورچی تو مزے میں رہتے اور بورڈروں کو پانی سا شوربا ملتا،

بورڈروں نے تنگ آکر ایک کمیٹی بنائی جس کے ممبر فرحت احمد مرحوم عرب سرائے والے، مولوی مظہر الحق صاحب کاندھلے والے اور سید احمد حسین مولانا طفیل احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے روز شام کو بورڈروں سے دریافت کر لیا جاتا کہ کل کیا کھاؤ گے، عام رائے کے مطابق کھانا پکتا۔ گوشت بہت کم کر دیا گیا، سبزیاں ہفتہ میں چار دن پکائی جاتی تھیں اور بورڈر خوش ہو کر کھاتے تھے کھانے کی رقم میں بچت ہونے لگی یہاں تک کہ پانچ چھ مہینے کے عرصہ میں سات سو روپیہ جمع ہو گیا اور کھانے کی کسی کو شکایت نہیں ہوئی یہ سات سو روپیہ محمد رفیق، حمید اللہ خاں، حامد علی خاں صاحبان کے ولایت سے واپس آنے پر بورڈنگ ہاؤس میں چراغاں کرنے اور ایک گرینڈ ڈنر دینے میں صرف ہوا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور مسلم یونیورسٹی کی نیک نامی اور شہرت میں سٹوڈنٹس یونین کلب نے (جہاں پر ہفتے میں دو پارٹیوں میں علمی مباحثہ ہوتا تھا) بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ یونین کے مباحثہ سے طلبا کی جھجک جاتی رہی اور انھوں نے بلا تکلف اردو اور انگریزی بولنے

کی مہارت اپنے میں پیدا کرلی، ہمیشہ بورڈروں کی خواہش رہتی کہ وہ یونین کلب کیٹی کے ممبر بن جائیں، مولوی مظہر الحق (بھائی بھشو) بورڈنگ ہاؤس میں ہر دل عزیز تھے اور ہر بورڈر کی یہ خواہش رہتی تھی کہ ان کو ذرا سا چڑھا کر گالیاں سنئے ان کی گالیوں کا کوئی بُرا نہیں مانتا تھا، کیوں کہ وہ گالیاں سمجھ میں نہیں آتی تھیں، کمیٹی کے ممبران نے بہت کوشش کی کہ بھائی بھشو یونین کیٹی کے ممبر بن جائیں مگر انھوں نے منظور نہ کیا اس لئے ان کی شان میں یہ شعر موزوں کیا گیا ؎

بھائی بھشو تو کچھ دیوانے ہیں وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں

کچھ عرصہ بعد یونین کلب کے ممبران کی ایک میٹنگ ہوئی، جھانسے میں آ کے مولوی مظہر الحق صاحب شریک ہو گئے، پھر کیا تھا ایک صاحب نے مولوی صاحب کا نام تجویز کیا دوسرے نے تائید کی اور بلا اختلاف ممبروں کی رائے سے مولوی صاحب ممبر منتخب ہو گئے اور ایک صاحب نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

خدا کی دین کا بھشو سے پوچھیے احوال

جو ووٹ دینے کو جائے ممبری مل جائے

یونین کلب میں تقریر کرنے میں خورجہ کے مصطفیٰ خاں مرحوم نے بہت نام پیدا کیا۔ ۱۸۸۲ء میں بابو سریندر ناتھ بنرجی (انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈر) نے سائنٹفک سوسائٹی ہال میں ایک بڑے جلسے کے سامنے اسپیچ کی، مصطفیٰ خاں مرحوم کو بہت پسند آئی اور انھوں نے دوسرے دن سے شام کے وقت اپنا کمرہ بند کر کے دیوار کی طرف مخاطب ہو کر بلند آواز سے اسپیچ دینا شروع کی اور دو تین سال کے اندر اچھے خاصے مقرر بن گئے جس وقت وہ اسپیچ دیتے تھے سامعین کو معلوم ہوتا تھا کہ انگریزی زبان کا دریا امڈا چلا آرہا ہے جب کوئی اہل علم یا افسر کالج دیکھنے آتا تو یونین کلب میں مصطفیٰ خاں مرحوم کی تقریر ضرور ہوتی، بلا کسی اطلاع و تیاری کے وہ فی البدیہہ جس کو انگریزی میں "ایکس ٹم پور" کہتے

ہیں، ایسی سپیچ دیتے تھے کہ گھڑی میں سامعین کو رلا دیتے اور گھڑی میں ہنسا دیتے تھے۔ کرکیٹ کھیل سے مجھ کو ۱۸۷۹ء سے خاص دل چسپی رہی ہے اور چھ سال تک کالج ٹیم کی کپتانی کا فخر رہا ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں سرسید نے جس قومی خیر خواہی کے ارگن کو، کو، کا، دم واپسیں تک اس کی آواز منقطع نہ ہوئی اور ایک سے ایک بڑھ کر نغمۂ دل کش اس سے نکلتا چلا آیا۔ جہاں جہاں وہ سرکاری خدمات کے تعلق سے رہے ان کے آثارِ حمیدہ مدرسے اور سوسائٹیاں وغیرہ وہاں موجود ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ ایک قومی خیر خواہ اور ایک قومی ریفارمر نے ان کی بنیاد ڈالی ہے۔ مگر سب سے بڑا اور بہت بڑا احسان جو انہوں نے قوم پر کیا، ملک پر کیا، سرکار پر کیا، ان پر کیا جواب موجود ہیں اور ان پر کیا جو آگے کو پیدا ہوں گے وہ علی گڑھ کالج کا جاری کرنا تھا۔ انہیں کا فکر تھا صحیح و صائب کہ اس نے ایسے کالج کی ضرورت کو سمجھا اور انہی کی ہمت بلند و وسیع کہ اس کے بنانے اور جاری کرنے کا ارادہ کیا اور انہی کا استقلال تھا متین و مستحکم کہ جو سوچا تھا اور جس کا ارادہ کیا تھا اس کو کر دکھایا۔

محسن الملک

سید طفیل احمد

علی گڑھ کالج کا ابتدائی زمانہ

یہ درسگاہ جو ۱۸۷۵ء میں کھلی، ۱۸۷۸ء میں میرے بڑے بھائی سید احمد حسین صاحب مرحوم داخل ہوئے اور ستمبر ۱۸۷۹ء میں مجھے اپنے ساتھ لائے، میں گیارہ سال کی عمر میں اسکول کی ابتدائی جماعت میں جو اس وقت نویں کلاس کہلاتی تھی اور سیکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہوا۔ اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس کی تین کلاسیں تھیں، فرسٹ، سکنڈ اور تھرڈ۔ فرسٹ کلاس کے کھانے کی فیس عہ ماہوار، سکنڈ کی آٹھ اور تھرڈ کی پانچ روپیہ ماہوار تھی اور اسی نسبت سے دوسری فیسیں تھیں۔ جب میں آیا تو فرسٹ کلاس والے کچے بنگلوں میں رہتے تھے جو یونین کلب کے آس پاس ہیں اور بکڈپو کی عمارت کے بڑے کمرے میں فرسٹ کلاس کا ڈائننگ ہال تھا۔ سیکنڈ کلاس والے ان بنگلوں میں رہتے تھے جو اسٹریچی ہال کے چبوترہ کے سامنے تھے اور عرصہ ہوا توڑ دیئے گئے اور تھرڈ کلاس کی بارک گریجوئس بارک میں تھی جس قدر پختہ بارکیں اور عمارتیں اس وقت نظر آتی ہیں ان میں سے اس وقت کوئی بھی نہ تھی، اسکول اور کالج کی کل کلاسیں اس ایک بنگلہ میں تھیں جو ابھی منہدم کیا گیا ہے اور جہاں موجودہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بنگلہ ہے۔ اب مختلف کلاسوں کے کھانوں کی تفصیلات سنیے۔ تھرڈ کلاس کے پانچ روپیہ میں دونوں وقت بکری کا گوشت اور دال ملتی تھی، سیکنڈ کلاس کے آٹھ روپے میں علاوہ دونوں

وقت گوشت کے اتوار کو بریانی جمعہ کو زردہ اور فیرنی ملتی تھی، صبح کو چائے اور دو بسکٹ ملتے تھے، اور لطف یہ کہ ان دو بسکٹوں کو ناکافی سمجھا جاتا تھا، چنانچہ کھانے کی مذمت میں ایک نظم لکھی گئی تھی جس کا ایک مصرعہ تھا ؎

"دو بسکٹ لئے ہاتھ میں چل دیئے"

صبح کی چائے کے علاوہ شام کو ٹفن ملتی تھی جس میں سموسے یا فرنی ہوتی تھی، گرمیوں میں صبح کے وقت بجائے چائے کے دو دو ڈبل روٹی ملتی تھی، گرمیوں میں ساتھ ساتھ برف اور رمضان شریف میں سحری کے وقت دو دو جلیبی اور شام کو افطاری ملتی تھی، یہ سب چیزیں سیکنڈ کلاس میں دی جاتی تھیں اور فرسٹ کلاس کی جس کی فیس بارہ روپیہ تھی تکلفات کی تو کوئی انتہا نہ تھی مگر باوجود اس کے کھانے کی شکایتوں کا ایسا ہی چرچا رہتا تھا جیسا کہ آج کل رہتا ہے طلبا کی تعداد چونکہ کم تھی اس لئے باہمی ارتباط اور میل جول زیادہ تھا اور پارٹی بندی بھی بہت کم تھی اس زمانہ میں الکشن تو ندارد تھے تاہم دو چار سال میں طلبا میں لڑائی ہو جاتی تھی۔ سب سے پہلی شورش تو ۱۸۸۲ء کی ہے جو مولوی محبوب عالم صاحب اور یعقوب خاں صاحب کے زمانہ میں ہوئی تھی اس میں کچھ لڑکے نکالے گئے دوسری میرے سامنے ۱۸۸۳ء میں ہوئی جب کہ غیر بردہ پختہ بارک بن چکی تھی، بنائے مخاصمت یہ تھی کہ فرسٹ کلاس کے لڑکے اپنے کو بالاتر سمجھتے تھے، سیکنڈ کلاس بارک کے سامنے اکڑ کر کھنکارتے ہوئے نکل جاتے تھے اس کے جواب میں ایک روز شام کے وقت سیکنڈ کلاس کے دو لڑکے یعنی احمد حسین صاحب میرے بھائی اور سید شریف الحسن سامانوی فرسٹ کلاس کی بارک کے سامنے گذرے ان دونوں کو احمد حسین خاں صاحب مرحوم اور سر سید عبد الرؤف صاحب نے چیلنج کیا اور اسی وقت میدان میں دوا کھاڑے قائم ہو گئے جب بورڈنگ ہاؤس میں اس کی خبر ہوئی تو سب طرف سے لڑکے جمع ہو گئے مگر ان لوگوں کے علاوہ کسی نے اس میں شرکت نہ کی اور ذرا سی دیر میں بیچ بچاؤ کر دیا گیا، اس زمانہ میں مولوی اکبر صاحب مرحوم منیجر تھے انھوں

نے تحقیقات کرکے سیکنڈ کلاس والوں کو یہ سزادی کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے ایک علیحدہ کمرے میں نظربند رہیں، کیوں کہ وہ اپنی بارک چھوڑ کر دوسری بارک والوں پر حملہ آور ہوئے تھے، مگر اس زمانہ کی لڑائیاں سیاسی نہ تھیں کہ کالج چھوڑنے پر بھی عداوت کا سلسلہ جاری رہتا چند دنوں بعد وہی اکھاڑے کے پہلوان مثل حقیقی بھائیوں کے بھول جاتے تھے، چنانچہ سرسید عبدالرؤف صاحب میرے بڑے بھائی سے ملنے کے مشتاق رہتے تھے اور میرے ساتھ تو بھائی صاحب مرحوم سے مخالفت کے زمانہ میں بھی بزرگانہ برتاؤ کرتے تھے، ایک بار میں غلطی سے الٰہ آباد میں ایک ہوٹل میں ٹھہر گیا تو سید صاحب نے ناراض ہوکر فرمایا، کیا میں (خدانخواستہ) مرگیا تھا جو تم ہوٹل میں جاکر ٹھہرے، سرسید عبدالرؤف کی مہمان نوازی ان کے عروج کے زمانہ میں نہیں ہوئی بلکہ جس روز سے وہ کالج چھوڑکر الٰہ آباد تشریف لے گئے تب ہی سے ان کا مکان علی گڑھ والوں کا مہمان خانہ بنا ہے۔

خواجہ عبدالعلی

ایم اے او کالج کی یاد

۱۸۸۲ء میں جب کہ ایم اے او کالج کے افتتاح کو صرف چھ سات برس گذرے تھے میں مدرسۃ العلوم میں داخل ہوا تھا۔ ایم اے او کالج اس وقت دراصل ایم۔ اے۔ او اسکول تھا اور مولوی محمد اکبر صاحب اس مختصر بورڈنگ کے منیجر تھے جو اس وقت موجود تھا جس میں تخمیناً چالیس یا پچاس بورڈر تھے، کچی بارک جو اب سید محمود کورٹ ہے بنی شروع ہوئی تھی اور جس کی ترقی و تعمیر کے ساتھ بورڈروں کی تعداد بڑھتی گئی، اس کے بعد پختہ بارک کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور تعداد بورڈرس میں ترقی ہوئی، کچی بارک اور پکی بارک کے ڈائننگ ہال علیحدہ علیحدہ تھے اور کھانے کی فیس میں بھی فرق تھا اس وقت مسٹر سڈنس ہیڈ ماسٹر تھے، جب اسکول کالج کے اسٹینڈرڈ کو پہونچا تو اس کے سب سے پہلے پرنسپل مسٹر بک MR. BECK ہوئے تھے اور مسٹر نسبٹ ہیڈ ماسٹر ہوئے تھے اس کے کچھ دنوں بعد مولانا شبلی مرحوم اور مولوی خلیل احمد صاحب مرحوم سنبھلی بھی اسٹاف میں شامل ہوگئے تھے۔

جو تعلقات اس زمانہ میں مابین اسٹاف و طلبارِ کالج ایک طرف اور مابین طلبار دوسری طرف تھے وہ اپنی مثال آپ تھے، تمثیلاً اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کرتا ہوں، ایک مرتبہ

میں کچھ عرصہ تک بخار میں مبتلا رہا اور اس وجہ سے کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں مسٹر بک نے مجھ کو دیکھا اور کہا کہ تم بہت کمزور ہو گئے ہو، تھوڑے دن میرے مہمان رہو، انگریزی ہلکی اور مقوی غذائیں تم کو جلد توانا کر دیں گی۔ میں نے شکریہ کے ساتھ ان کی مہمانی منظور کی اور تخمیناً ۲۰، ۲۵ روز میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا، انگریزی کھانے تو عموماً زود ہضم اور مقوی ہوتے ہیں لیکن بک صاحب مرحوم کو کھانے کے ساتھ خاص دلچسپی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا اور بعد میں جو مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا، چھ سات قسم کے کھانوں سے کم کبھی ان کی میز پر نہ ہوتے تھے اور ہر کھانا لطیف اور خوش ذائقہ ہوتا تھا۔ باوجود ان تمام خوبیوں اور محبت کے میں ان کھانوں سے گھبرا گیا اور ڈائننگ ہال کی ایک گوشت اور ایک دال کی یاد نے بہت ستایا اور انہیں چپاتیوں کو دل للچایا تو میں نے بک صاحب سے رخصت چاہی، انہوں نے فرمایا کہ تم میں ابھی پوری طاقت نہیں آئی ہے ابھی چند روز ہمارے ساتھ اور کھانا کھاؤ، چنانچہ دس روز تک انہوں نے مجھ کو اور کھلایا اور توانا و تندرست کر کے بمشکل اجازت رخصت دی۔ میں خدا کے فضل اور بک صاحب کی شفقت و محبت سے اپنی اصلی حالت تندرستی پر عود کر آیا جو اس وقت تک مجھ کو یاد ہے اور جس کا آج بھی میں شکر گذار ہوں اور ہمیشہ رہوں گا، یہ برتاؤ ظاہرداری کا نہیں تھا بلکہ اس خلوص اور محبت کے سبب تھا جو ایک ہمدرد اور شفیق باپ یا عزیز قریب کو اپنی اولاد یا عزیز کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک مثال اس تعلق کی ہے جو اس زمانہ میں باہم استاد و طلبا کے تھی۔

اب ایک دوسری مثال باہمی تعلقات کی دیتا ہوں جو آج بھی میری نظروں کے سامنے موجود ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ چاندنی رات تھی، طلبا آپس میں کبڈی کھیل رہے تھے، میری پارٹی میں ایک لڑکا شرافت نامی تھا جو غالباً ۲۰ سال کا تھا اور فن کشتی سے خوب واقف تھا مقابلہ پارٹی میں [illegible] نوجوان [illegible] تھے جو اس سے کہیں قوی تھے اور کبڈی کبڈی کہتے ہوئے ہمارے پالے میں آتے اور شرافت کو زور سے ہاتھ مار کر واپس ہو رہے تھے کہ شرافت

نے ایک کران کو اٹھایا اور وہ اپنے ہی زور میں ایک طرف گرے اور ان کا سر اتفاق سے بارک کی سیڑھی پر لگا اور پھٹ گیا، کبڈی اسی وقت بند ہوگئی اور سب سے پہلا مدد کرنے والا شخص وہی شریف تھا جس کی وجہ سے چوٹ پہونچی تھی، شریف نے مثل بھائی کے ان کی خدمت کی اور صحت ہو جانے کے بعد ان دونوں کے تعلقات میں سرمو کوئی فرق نہیں ہوا، بلکہ آپس کی محبت میں اضافہ ہوا، یہ نوجوان سید ہمارے محترم دوست ہندوستان کے مشہور بزرگ نکلے اور ہائی کورٹ پنجاب کے عرصہ تک جج رہے اور اس سر کے نشان کے باعث گورنمنٹ کے قابل احترام سر ثابت ہوئے یعنی آنریبل سر سید حاجی مولوی عبدالرؤف صاحب،

مختصر یہ کہ اگر اقتضائے بشری سے اگر آپس میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا تو وہ ایک عارضی واقعہ ہوتا تھا دلوں میں کبھی کوئی کدورت نہیں آتی تھی اور مثل عرب کے ادھر لڑے اُدھر صاف دل ہو جاتے تھے۔

ہر طالب علم استاد کے ہر حکم جائز کی تعمیل اپنا فرض سمجھتا تھا اور ادب مثل باپ کے کرتا تھا، میرا ذاتی واقعہ ہے کہ ایک روز میں پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ ٹہلنے جا رہا تھا اور ان سے ایک قدم پیچھے بالقصد جا رہا تھا۔ آرنلڈ صاحب نے کہا کہ تم پیچھے کیوں چلتے ہو، برابر آؤ، میں نے ان سے مؤدب طریقہ سے عرض کیا کہ ہماری قومی تہذیب میں استاد کا رتبہ بمنزلہ باپ کے ہے اور باپ کے برابر چلنا ہماری تہذیب کے خلاف ہے اور میں اس کو ترک کرنا نہیں چاہتا وہ یہ سنکر بہت خوش ہوئے اور جو اثر ان پر ہوا اس کا بیان ممکن نہیں،

بارک اور باورچی خانہ کے ملازمین کے ساتھ طلبا کا برتاؤ نہایت مہذب ہوتا تھا اور علی قدر مراتب ان کی عزت کرنے اور پوری انسانی ہمدردی ان سے رکھتے تھے سوائے چوری کے اور تمام خطائیں اکثر معاف کر دی جاتی تھیں صرف تنبیہ پر اکتفا کیا جاتا تھا، چوری کے الزام میں بلا سزائے جسمانی اس کو علیحدہ کر دیتے تھے۔

اس وقت ہمارے یہاں پرفکٹ ڈسپلین تھی جو تمام ہندوستان میں ایک مثال تھی

اور اس کی وجہ وہی خیالاتِ ادب تھا جو ایک شاگرد کو استاد کے ساتھ ہوتا ہے، میرے نزدیک ڈسپلن تعلیم کے واسطے تعلیم سے کہیں زیادہ لازمی و ضروری ہے جو آئندہ زندگی پر بڑا اثر ڈالتا اور اس کے انسان ہونے اور کامیاب زندگی کی وجہ ہوتا ہے۔ ایک واقعہ سنیئے۔

ایک روز سرسید مونڈھے پر اسٹریچی ہال کے سامنے جو زیر تعمیر تھا بیٹھے تھے کہ ایک چھوٹا لڑکا زار و قطار روتا ہوا ان کے پاس پہونچا، اور شکایت کی کہ مجھ کو فلاں بڑے لڑکے نے مارا ہے۔ اس کے رونے پر وہ کچھ ایسے مضطرب ہوئے کہ فوراً اس کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور کہا کہ وہ لڑکا کہاں ہے اس کے کمرے پر پہونچے اور بلا کچھ دریافت کے اپنے ڈنڈے سے اس کی خبر لے ڈالی وہ ایک دو ڈنڈے کھا کر بھاگ گیا اور سید صاحب اپنی جگہ واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد چند بڑے لڑکے سید صاحبؒ کے پاس گئے اور حقیقت حال اس طرح بیان کی کہ یہ چھوٹا لڑکا بہت شیطان ہے اور فحش گالی بڑے لڑکوں کو دیدیتا ہے اس وجہ سے اس نے برا فروختہ ہو کر اسے مارا تھا، یہ سنکر سید صاحب کو بہت افسوس ہوا اور بڑے لڑکے کو اپنی کوٹھی پر بلا کر معذرت چاہی۔ اس واقعہ سے سید صاحب کا خلوص اور سچائی ظاہر ہوتی ہے اور اسی وجہ سے طلباء ان پر فدا تھے۔

"سرسید کی ذات بڑی بلند تھی، بڑی ہمہ گیر۔ افسوس ہے مسلمانوں کو پھر ویسا کوئی رہنما نہیں ملا۔"

اقبال

میر ولایت حسین

علی گڑھ کالج میں داخلہ

میں وسط جنوری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ پہونچ گیا، اب میں اپنے دل میں خوش تھا کہ دہلی میں مجھ کو چار روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا، علی گڑھ میں دس روپیہ ماہوار وظیفہ ملے گا اچھی طرح گذر ہوگی، مگر جب میں مینیجر بورڈنگ ہاؤس مولوی محمد اکبر صاحب کے پاس گیا تو انہوں نے دریافت کیا کہ بورڈنگ ہاؤس کی کس کلاس میں داخل ہو گے؟ میں نے جواب دیا کہ فرسٹ ایر کلاس میں، انہوں نے فرمایا کہ "بورڈنگ ہاؤس کی کونسی کلاس میں داخل ہو گے؟ میں نے تعجب سے دریافت کیا کہ "بورڈنگ ہوس میں بھی کلاسیں ہوتی ہیں" انہوں نے فرمایا کہ "یہاں بورڈنگ ہاؤس کے تین درجے ہیں، اور ہر درجے کے جدا جدا اخراجات ہیں، فرسٹ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں بیس روپیہ ماہوار، سیکنڈ کلاس بورڈنگ میں پندرہ روپیہ اور تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں دس روپیہ ماہوار فیس ہے، میں نے کہا مجھ کو تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر لیا جائے، مینیجر صاحب نے مجھ کو ایک کچے بنگلہ کی کوٹھری میں جو وکٹوریہ گیٹ کے قریب تھا بھیجدیا، اب مغرب کا وقت ہو گیا تھا اور کوٹھری جو مجھ کو دی گئی تھی صاف نہ ہوئی تھی، بنگلہ کے کمروں میں رہنے والے طلبا نے مجھ سے کہا کہ آج رات ہمارے کمرے میں رہیں، چنانچہ رات کا کھانا انہوں نے مجھے تھرڈ کلاس کے باورچی خانہ سے منگا کر کھلایا اور رات کو اپنے کمرے میں سلایا۔

(فرسٹ کلاس بورڈنگ ہاؤس کے طلبہ مشرقی پختہ بارک (موجودہ سرسید کورٹ ایسٹ) کے بارہ کمروں میں جو اس وقت تک تیار ہو گئے تھے، چھوٹے چھپر کے بنگلوں میں رہتے

تھے جو احاطہ کالج میں بنے ہوئے تھے اور سٹوڈنٹس یونین کلب کی عمارت میں کھانا کھاتے تھے، کھانے میں صبح کو چار توس مکھن، نو بجے صبح کا کھانا، ایک بجے ٹفن، چار بجے شام کو چائے اور بعد مغرب شام کا کھانا ملتا تھا۔ فرسٹ کلاس بورڈروں کی تعداد پچیس یا تیس سے زیادہ نہ تھی۔

سیکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس کچا کوارڈینگل کے نصف حصہ میں تھا جو اس وقت تیار ہوا تھا اور جو اب سید محمود کورٹ کہلاتا ہے، طلبا کو صبح کے وقت چار ادر دو بسکٹ، ۹ بجے صبح کا کھانا جس میں گوشت دال اور روٹی ہوتی تھی، سہ پہر کو ٹفن جس میں ایک طشتری فرینی یا پراٹھا یا اسی قسم کی کوئی چیز ہوتی تھی، بعد مغرب شام کا کھانا ملتا تھا جس میں دال گوشت اور ہفتہ میں دو بار پلاؤ اور ایک بار میٹھے چاول اور فرینی ہوتی تھی، سیکنڈ کلاس بورڈروں کی تعداد تقریباً ستر یا اسی تھی، اور کچا کوارڈینگل کے شمال مشرقی کونے پر ان کا ڈائننگ ہال تھا۔ ۱۸۸۲ء میں تھرڈ کلاس بورڈرز مختلف بارکوں میں رہتے تھے جو اب منہدم ہو گئی ہیں اور وہ زیادہ تر اس موقع پر تھیں جو کالج کے لکچر روم اور ظہور وارڈ کے درمیان ہے اور ظہور وارڈ کے بچوں کے کھیلنے کے میدان کے خاتمے پر ان کا باورچی خانہ اور ڈائننگ ہال تھا۔ تھرڈ کلاس بورڈروں کی تعداد پچاس کے قریب تھی، ان کو دو وقت کا کھانا ملتا تھا جس میں گوشت اور دال ہوتی تھی، مگر پلاؤ زردہ اور ناشتہ و ٹفن نہیں ملتا تھا۔ منیجر بورڈنگ ہاؤس اس بورڈنگ ہاؤس کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے مگر اس بورڈنگ ہاؤس کو ان کی توجہ کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی لڑکے عموماً نیک چلن اور محنتی تھے۔

ایک بار منیجر بورڈنگ ہاؤس نے غلطی سے ایک سیکنڈ کلاس بورڈر کو کسی قصور پر سزا دی کر وہ تھرڈ کلاس بورڈروں کے ساتھ کھانا کھائے، مولوی خلیل احمد صاحب جو سیکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے اس طالب علم کو تھرڈ کلاس ڈائننگ ہال میں کھانا کھلانے لائے مگر کوئی تھرڈ کلاس بورڈر ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے نہیں گیا۔ منیجر بورڈنگ ہاؤس نے معذرت

کی اور اپنا حکم واپس لے لیا،

سر سید تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس کو پسند نہیں کرتے تھے، ۱۸۸۲ء کے آخر میں جب کچا کوارٹرنگل کے سب کمرے تیار ہو گئے تو انہوں نے تھرڈ کلاس بورڈروں کو سیکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں منتقل کر دیا اور تھرڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس توڑ دیا۔

دو ستر روز میں کالج کے انگلش ڈیپارٹمنٹ کے فرسٹ ایر کلاس میں داخل ہوا، اس وقت مجھ کو شامل کر کے ہمارے کلاس میں آٹھ طلبا تھے، چار ہندو اور چار مسلمان تھے، ہم چاروں مسلمان بورڈر تھے، کلب علی بیگ، سخاوت حسین، سید عبدالباقی عرف سید کلن، سید کلن اور سخاوت جو مجھ سے چند دن پہلے داخل ہو گئے تھے ایک کمرہ میں رہتے تھے جو ہارس کورٹ کے سامنے لان پر بنے ہوئے تھے اور ان میں رہنے والوں سے کچھ کرایہ نہیں لیا جاتا تھا ان دونوں صاحبوں نے مجھ سے کہا کہ اس بارک میں ان کے کمرے کے قریب ایک کمرہ خالی ہے میں اس میں آجاؤں، چنانچہ میں اس کمرے میں چلا گیا۔

۱۸۸۲ء میں مدرسۃ العلوم میں دو شعبہ جات انگریزی و مشرقی تھے، اسی واسطے اس کا انگریزی نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ تھا، شعبۂ انگریزی میں جماعت دوم سے جماعت ہشتم تک اسکول میں اور ایف اے بی اے کی چار جماعتیں کالج میں تھیں، اسکول میں انگریزی جماعت دوم سے پڑھائی جاتی تھی اور ذریعہ تعلیم انگریزی تھا، جماعت ششم تک نصاب تعلیم کالج کی ایک کمیٹی تجویز کرتی تھی، اور امتحانات انٹرنس اور ایف اے، بی اے کے واسطے یہ اسکول و کالج کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق تھے۔

اورینٹل ڈیپارٹمنٹ یعنی شعبۂ مشرقی میں علاوہ قدیم عربی علوم کے ریاضی تاریخ و جغرافیہ اردو میں پڑھایا جاتا تھا اور زبان انگریزی کی بطور ثانوی زبان کے تعلیم ہوتی تھی،

مولوی عباس حسین صاحب اورینٹل ڈیپارٹمنٹ کے افسر اعلیٰ تھے علاوہ ان کے مولوی نجف علی صاحب مدرس فارسی ایک ہندو معلم انگریزی اور ایک مولوی بطور اسسٹنٹ اورینٹل ڈیپارٹمنٹ

میں تھے، یہ صیغہ اور دینیات کی تعلیم انگریزی کالج کو مسلمانوں میں ہر دل عزیز بنانے کیواسطے شامل کی گئی مگر یہ صیغہ کامیاب نہ ہوا، کچھ عرصہ تک مولوی عباس حسین صاحب اپنے وطن سے چند لڑکے لاکر اسکو چلاتے رہے مگر آخر کار جب طلبار کی تعداد استادوں کی تعداد سے زیادہ نہ رہی تو اورنٹل ڈپارٹمنٹ توڑ دیا گیا اور مولوی عباس حسین صاحب کالج اسٹاف میں اور مولوی نجف علی صاحب اسکول اسٹاف میں شامل کر دیئے گئے۔

میں اپنے گھر سے صرف دس روپیہ لایا تھا اس لئے میں نے کورس کی انگریزی کتابیں چار روپیہ بارہ آنے کی خریدیں اور ایک روپیہ دو آنہ میں کمرے میں چٹائی کا فرش اور چھ آنے میں تیل کا فتیلہ سوز خریدا، اس طرح جو رقم لایا تھا اس کا بیشتر حصہ خرچ ہوچکا تھا اور میرے پاس ریاضی اور قدیم تاریخ اور فارسی کی کوئی کتاب نہ تھی، بان کی ایک چار پائی بورڈنگ ہاؤس سے مل گئی تھی اور ایک چھوٹی گول میز محمد آباد ضلع اعظم گڈھ کے طلبار نے جو مولوی محمد کریم صاحب کے عزیز تھے اور اسی بارک میں رہتے تھے مستعار دیدی تھی، میں نے والدہ کو خرچ کے واسطے لکھا انہوں نے جواب دیا کہ "یہاں کیا خزانہ گڑا ہے، تم واپس چلے آؤ"۔ میں نہایت پریشان تھا، واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا، اور کالج میں رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، مرزا کلب علی بیگ ساکن مراد آباد نے جو میرے ہم جماعت تھے مجھ کو پریشان دیکھ کر میری پریشانی کا سبب پوچھا، میں نے کہا کہ دہلی میں مجھ کو چار روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور دو تین روپیہ ماہوار پرایئویٹ ٹیوشن سے مل جاتے تھے اس طرح میری گذر ہو جاتی تھی، علی گڑھ میں دس روپیہ ماہوار وظیفہ سے توقع تھی کہ اچھی گذر ہو جاوے گی، مگر یہاں وظیفہ تو میرے ہاتھ آتا نہیں وہ منیجر بورڈنگ ہاؤس کے پاس آتا ہے میرے پاس متفرق خرچ کے واسطے کچھ نہیں، گھر کو لکھتا ہوں تو والدہ جواب دیتی ہیں کہ واپس چلے آؤ اور میرا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔

کلب علی بیگ نے کہا کہ مولوی مشتاق حسین صاحب سے کہو وہ تم کو کوئی پرایئویٹ ٹیوشن دلادیں گے، شام کو پانچ بجے کے قریب مولوی مشتاق حسین صاحب آنریری طور پر بورڈنگ ہاؤس

کی نگرانی فرماتے تھے پارک میں گشت کرتے ہوئے آئے، اور مجھ کو کمرہ میں بیٹھا دیکھکر فرمانے لگے کہ "کرکٹ کھیلنے کیوں نہیں گئے"۔ میں نے کہا کہ مجھ کو کرکٹ کھیلنا نہیں آتا فرمایا کہ "سیکھنا چاہیئے" پھر بھی میں چند قدم ان کے ہمراہ گیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ کیا کچھ فرمانا ہے"۔ میں نے کہا کہ "ہاں عرض کرنا ہے" فرمایا "کہو" میں نے عرض کیا کہ مجھ کو اسکول کے کسی طالبعلم کی پرائیویٹ ٹیوشن دلا دیجئے، انہوں نے فرمایا کہ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ تم اپنا وقت دوسرے کے ہاتھ بیچتے ہو، اس وقت کو اپنے پڑھنے کے کام میں کیوں نہیں لاتے، میں نے عرض کیا اگر میں تھوڑا وقت دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کروں گا تو میرا سارا وقت پڑھنے سے چلا جائے گا، فرمایا کہ "کیوں"؟ میں نے عرض کیا کہ میرے والد تو زندہ نہیں ہیں، میری والدہ میری کچھ مالی مدد نہیں کرسکتی ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ کالج چھوڑ دو اور گھر واپس چلے آؤ، میں دس روپیہ ماہوار وظیفہ کے بھروسہ پر آیا تھا مگر وظیفہ مجھ کو ملتا نہیں، منیجر صاحب بورڈنگ ہاؤس کالج کے اخراجات میں محسوب کر لیتے ہیں، انہوں نے دریافت کیا کہ کالج کے کیا مطالبات ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ فیس تعلیم تین روپیہ (۳ ر) فیس طعام پانچ روپیہ آٹھ آنے ماہوار (۸/۵) مطالبات کالج و بورڈنگ ہاؤس کے ہیں اور ایک روپیہ آٹھ آنے ماہوار وظیفہ میں سے بچتے ہیں مولوی صاحب نے فرمایا کہ ڈیڑھ روپیہ ماہوار تمہارے متفرق اخراجات کے واسطے کافی نہیں ہیں میں نے کہا کافی تو ہیں بشرطیکہ وہ مجھ کو ملا کریں، انہوں نے فرمایا کہ منیجر بورڈنگ ہاؤس سے کہدونگا کہ وہ ڈیڑھ روپیہ ماہوار تمہارے وظیفہ میں سے تم کو دیدیا کریں، پھر تو تم کو پرائیویٹ ٹیوشن کی ضرورت نہ ہوگی، میں نے عرض کیا کہ ہاں پھر تو ضرورت نہ ہوگی، اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ میرے پاس خواندگی کی کتابیں بھی نہیں ہیں، انہوں نے فرمایا کہ خواندگی کی جو کتابیں نہیں ہیں ان کی فہرست معہ کتاب کی قیمت کے ان کی خدمت میں بھیجدوں، دوسرے روز میں نے کتابوں کی قیمت معہ فہرست ان کی خدمت میں بھیجدی، کل قیمت بائیس (۲۲) روپے ہوتی تھی، مولوی صاحب موصوف حیدرآباد تشریف لے جانے والے تھے اور سید صاحب کی کوٹھی پر مقیم تھے، انہوں

نے مجھکو سید صاحب کی کوٹھی پر بلاکر بائیس ۲۲ روپیہ دے دیئے اور خود حیدرآباد تشریف لے گئے۔

چوں کہ مجھ کو بینجر بورڈنگ ہاؤس سے ڈیڑھ روپیہ ماہوار وصول ہونے کی امید نہ تھی اس لئے میں نے بائیس ۲۲ روپیہ اپنے پاس رکھے اور کتابیں نہ خریدیں دوسروں کی کتابوں سے اپنا کام نکالا، البتہ انگریزی پروفیسر کے ڈر سے انگریزی کورس کی کتابیں جو انگریز پروفیسر پڑھاتے تھے خریدلیں۔

۱۰ اپریل ۱۸۸۲ء کو جی، اے لینگ کلکٹر ضلع علی گڑھ کی زیر صدارت مدرسۃ العلوم کالج کے تقسیم انعامات کا سالانہ جلسہ ہوا مجھ کو اس جلسہ میں دس روپیہ ماہوار کی وظیفہ کی سند ملی، یہ وظیفہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کا قائم کیا ہوا تھا، مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے رپورٹ ترقی تعلیم بابت ۱۸۸۱ء پڑھی اور بتایا کہ آخر مارچ ۱۸۸۲ء تک تعداد طلباء ۲۷۳ ہے جس میں سے ۲۵۶ انگلش ڈپارٹمنٹ میں اور ۱۱۷ اورنٹیل ڈپارٹمنٹ میں ہیں، اور کل میں سے ۲۱۳ مسلمان ۵۹ ہندو اور ایک ہندوستانی عیسائی ہے، ۱۵۰ مسلمان اور ۲۲ ہندو بورڈنگ میں، اس جلسہ میں سرسید نے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی بہت ہی تعریف کی،

اس وقت کالج میں مسٹر سڈنس پرنسپل تھے، جن کو چھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی اور وہ فورتھ ایر کلاس کو دو گھنٹے، تھرڈ ایر کو ایک گھنٹہ اور سکنڈ ایر کو ایک گھنٹہ روزانہ انگریزی پڑھاتے تھے،

(مسٹر سڈنس کالج کے پرنسپل اس وقت مقرر ہوئے جب کہ وہ اسکول کی جماعت ہفتم تک تعلیم دیتے تھے اور انہوں نے اسکول کو بی اے کلاس تک ترقی دی، اس لئے ان کے عہد میں کالج کے کلاسوں میں بھی اسکول کے کلاسوں کی طرح سے پابندیاں رہیں، کلاس کو خواہ وہ اسکول کی ہو یا کالج کی، گرمی ہو یا جاڑا، پورے پانچ گھنٹے تعلیم ہوتی تھی، گرمیوں میں کالج چھ بجے صبح سے گیارہ بجے دن تک ہوتا تھا اور جاڑوں میں دس بجے سے ایک بجے تک، بعد ازاں ایک بجے سے دو بجے

تک نماز ظہر کیواسطے چھٹی ہوتی تھی، پھر دو بجے سے چار بجے تک کالج ہوتا تھا جمعہ کے دن صبح ۸ بجے سے ۱۱ بجے دن تک کالج ہوتا تھا اور عموماً جمعہ کا دن ہفتہ وار امتحان کے نذر ہوتا تھا ان دنوں میں سیشن ۲ر جنوری سے شروع ہوتا تھا اور مئی و جون میں گرمیوں کی تعطیل پر اور دوسرا سیشن جولائی سے شروع ہوتا تھا اور ماہ دسمبر میں تعطیل کرسمس پر ختم ہوتا تھا۔ سکنڈ ایر اور فورتھ ایر کلاسوں میں ایف اے اور بی اے کے کورس اول ششماہی میں ختم کر دیئے جاتے تھے اور دوسری ششماہی خواندگی دہرانے اور امتحانات میں گذرتی تھی۔

چونکہ اس وقت علی گڑھ کالج میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کالج کلاسوں اور اسکول کی دو اعلیٰ کلاسوں کو حتی المقدور انگریزی ادب اور زبان کی تعلیم دے اور کالج اسٹاف میں سوائے مسٹر سڈنس اور کوئی انگریز نہ تھا۔ اس لئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نسبٹ (NISBIT) فرسٹ ایر کلاس کو ایک گھنٹہ روزانہ انگریزی اور ایک گھنٹہ روزانہ لاجک (منطق) پڑھاتے تھے اور اسکول کی جماعت نہم و دہم کو روزانہ دو گھنٹے انگریزی کی تعلیم دیتے تھے۔

مسٹر نسبٹ ہیڈ ماسٹر علاوہ اسکول میں انتظامی کام کے چار گھنٹے روزانہ درس دیتے تھے مگر کسی قدر سخت تھے، بعض طلبہ ان کے طرز تعلیم کے شاکی تھے، مسٹر نسبٹ متوقع تھے کہ طلبا ر اپنا سبق پورے طور سے تیار کر کے لائیں، اگر طالب علم کو کسی لفظ کے معنی نہ معلوم ہوں تو وہ خفا ہوتے تھے کہ تم نے اس کے معنی ڈکشنری میں کیوں نہیں تلاش کئے، پیرا فریز کرنے میں وہ چاہتے تھے کہ فقط لفظ کی جگہ دوسرا لفظ ہی نہ بدلو بلکہ فقرہ کا کنسٹرکشن بدل کر ممتحن پر واضح کرو کہ تم فقرہ کا مطلب سمجھتے ہو۔

مسٹر نسبٹ نوٹ لکھانا پسند نہ کرتے تھے وہ کہا کرتے تھے میرا کام تم کو عبارت کا سمجھا دینا ہے، پھر تم اس کو اپنے الفاظ میں امتحان میں ظاہر کرو کہ تم اس عبارت کو سمجھتے ہو۔ اگر میں تم

کو نوٹ لکھا دوں گا اور تم اس کو حفظ یاد کر کے امتحان میں لکھ آؤ گے تو ممتحن جو میری عبارت پر نمبر دے گا وہ دراصل تمہارے نمبر نہ ہوں گے، لڑکوں کی خواہش ہوتی تھی کہ مشکل اشعار یا عبارتوں کا پیرا فریز یا اکسپلینیشن وغیرہ مسٹر نسبٹ لکھا دیں مگر وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔

مسٹر نسبٹ نے فرسٹ ایر کلاس کو اول سہ ماہی میں فاؤلرز ڈی ڈکٹیو لاجک ختم کرادی تھی اور ماہ اپریل میں امتحانات یونیورسٹی لاجک کے پرچے کلاس میں حل کرایا کرتے تھے انہوں نے اسی طرح سے انگریزی کے کورس کو جو زمانۂ حال کے کورس سے کم نہ تھا فرسٹ ایر میں بیشتر حصہ پڑھا دیا تھا اور سکنڈ ایر کی اول ششماہی میں پورا کورس انگریزی ختم کرا دیا تھا اور دوسری ششماہی، روائز یعنی دوہرانے اور امتحانات کے واسطے تھی، مسٹر نسبٹ ہم سے سکنڈ ایر کلاس میں ایک جواب مضمون لکھایا کرتے تھے جو ہفتہ کے روز کلاس میں ورنہ آٹھ بجے شب تک ان کی کوٹھی پر پہونچنا چاہیئے، درصورت خلاف ورزی دوشنبہ کے روز چار آنے جرمانہ کے ساتھ جواب مضمون پیش کرنا ہوتا تھا، مگر جرمانہ ادا کرنے کی صورت صرف ایک طالب علم کو ایک بار پیش آئی۔

اس وقت کالج میں مولوی امجد علی صاحب ایم اے لکچرر فلاسفی اور بابو گوبند پرشاد صاحب ایم اے لکچرر ریاضی تھے اور ہر ایک کو دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، (بابو گوبند پرشاد پانچ گھنٹے روزانہ کالج میں کام کرتے تھے، بلکہ نماز ظہر کے وقت جب کہ وہ خالی ہوتے تھے تو اسکول کے بعض طلبا ریاضی میں اپنی مشکلات ان کے پاس لے آتے تھے اور وہ اپنی نیکی کے باعث انکار کرنا جانتے نہ تھے اس لیے اکثر اوقات بجائے پانچ گھنٹوں کے چھ گھنٹے روزانہ ان کو کام کرنا ہوتا تھا، علاوہ ان دو پروفیسروں کے بابو بھودی لال ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر تھے جو فرسٹ ایر کلاس کو ریاضی اور تاریخ اور سیکنڈ ایر کلاس کو تاریخ وغیرہ پڑھاتے تھے اور ساٹھ روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ مولوی محمد اکبر صاحب سرسید کے استاذ زادہ پروفیسر عربی کی تنخواہ ستر روپیہ تھی، اسکے علاوہ مولوی صاحب منیجر بورڈنگ ہاؤس بھی تھے، اس کا الاؤنس تیس روپیہ ماہوار ملتا

تھا، مولوی عبدالجبار صاحب پروفیسر فارسی کو چالیس روپیہ ماہوار اور پنڈت شیوشنکر صاحب پروفیسر سنسکرت کو تیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

مولوی عبدالجبار صاحب ملکاپور علاقہ برار کے رہنے والے تھے اور اورنٹیل کالج لاہور میں مولوی فیض الحسن صاحب ادیب کے شاگرد تھے وہ اپنا کام محنت سے کرتے تھے، مگر مغرورالمزاج اور تندو درنج واقع ہوئے تھے، مولوی مشتاق حسین صاحب کی ان پر زیادہ مہربانی تھی، حیدرآباد سے عارضی طور پر آنے کے بعد مولوی مشتاق حسین صاحب بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی میں زیادہ حصہ لیتے تھے اور مولوی عبدالجبار صاحب سے بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی میں مدد لیتے تھے،

ایک روز سیکنڈ ایر کلاس کے طالب العلم معشوق علی نے فارسی کے گھنٹہ میں مولوی عبدالجبار صاحب سے کوئی ایسی بات کہی جو مولوی صاحب کو بہت ناگوار ہوئی، مسٹر سڈنس پرنسپل اسی وقت کلاس میں تشریف لے آئے اور معشوق علی طالب علم کو کالج سے نکال دیا مگر چونکہ مولوی محمد اکبر صاحب بااثر تھے اور مولوی عبدالجبار صاحب کے خلاف تھے ان کی کوشش سے معشوق علی کو دوبارہ داخل کرلیا گیا اور مولوی عبدالجبار صاحب علیحدہ کردیئے گئے، ان کی جگہ سال کے آخر تک کوئی شخص مقرر نہیں ہوا، کبھی مولوی محمد اکبر صاحب اور کبھی اسکول سے مولوی خلیل احمد صاحب جو عربی کے مدرس تھے فارسی پڑھاتے تھے۔

ابتدا میں اسکول کلاسوں کی ایک قدیم عمارت میں تعلیم ہوتی تھی جہاں اب ہیڈ ماسٹر کی کوٹھی ہے (موجودہ گیسٹ ہاؤس) اور کالج کلاسیں سڑک کی دوسری طرف ایک کرایہ کے بنگلہ میں پڑھتی تھیں جو مسٹر فلر کی ملکیت تھا، ۱۸۸۲ء کے آخر میں جب شرقی حصہ کالج لکچر رومز کا تیار ہوگیا تو کالج کلاسیں کالج لکچر رومز میں منتقل ہوگئیں۔

ان دنوں میں گرمی کی تعطیل دو ماہ کی مئی اور جون میں ہوتی تھیں ۱۸۸۲ء میں گرمی کی تعطیل

میں وطن نہیں گیا اور علی گڑھ کالج کے بورڈنگ میں رہا، سال کے آخر میں جب سالانہ امتحان ہوا تو میں اپنے کلاس کے ہر مضمون میں نیز دینیات کے امتحان میں بھی پاس ہو گیا اور سیکنڈ ایر کلاس میں ترقی ہوئی، اس لیے سیکنڈ ایر کلاس میں مجھکو بارہ ۱۲ روپیہ ماہوار وظیفہ سیکنڈ ایر کلاس کا اور دو ۲ روپیہ ماہوار دینیات کا، کل چودہ ۱۴ روپیہ ماہوار ملنے لگا،

۱۸۸۳ء کے آخر میں کالج کے کلاسوں کے امتحانات کا نتیجہ اچھا نہیں رہا، فورتھ ایر کلاس میں چار طلبہ میں نے صرف ایک ایشری پرشاد تھرڈ ڈویزن میں پاس ہوا، سیکنڈ ایر کلاس میں بھی نصف سے زیادہ امتحان ایف اے کلکتہ یونیورسٹی میں فیل ہوئے، ان فیل ہونے والوں میں سید محمد علی سرسید کے عزیز اور سید عبدالرؤف ساکن محمد آباد بھی تھے جو بعد میں جج ہائی کورٹ ہوئے، سید محمد علی سیشن جج ہو کر ریٹائر ہوئے۔ اور یونیورسٹی کے قیام کے وقت اس کے ٹرسٹی رہے، فیل شدہ طلبار کے ہمارے نئے سکنڈ ایر میں شامل ہونے سے تعداد بجائے آٹھ کے انیس ۱۹ ہو گئی۔

اس سال مسٹر ڈائی ٹن پرنسپل آگرہ کالج ریٹائر ہو گئے تھے، اور آگرہ کالج کو علی گڑھ کالج کے ساتھ ایک قسم کی رقابت تھی، اب تک کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات علی گڑھ میں نہیں ہوتے، بلکہ آگرہ کالج، امتحانات کلکتہ یونیورسٹی کا سنٹر تھا اور علی گڑھ کے طلبار آگرہ میں امتحانات دیا کرتے تھے، ۱۸۸۳ء میں سرسید کو خیال ہوا کہ آگرہ کالج کے ساتھ رقابت سے، ایسا نہ ہو کہ امتحان میں ہمارے طلبار کو کسی قسم کا نقصان پہونچے اس لئے انہوں نے ارادہ کیا کہ ۱۸۸۳ء کے امتحان بی اے میں ہمارے طلبار بجائے آگرہ کے کلکتہ میں اور امتحانات انٹرنس اور ایف اے کے طلبہ بجائے آگرہ کے الہ آباد میں شریک امتحان ہوں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور انٹرنس اور ایف اے کے طلبار کے قیام کا مولوی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر نے الہ آباد میں اپنے مکان پر انتظام کیا، اس سال بھی امتحانات

۱۸۸۲ء یونیورسٹی بالخصوص امتحان ایف اے کا نتیجہ اچھا نہیں رہا۔

۱۸۸۳ء میں سرسید نے محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن قائم کی، ہر مسلمان جو ڈیڑھ روپیہ ماہوار چندہ دے وہ اس کا ممبر ہوتا تھا اور اس فنڈ سے یہ مقصد تھا کہ جو ہونہار مسلمان طلبار اپنے پاس سے ولایت کی تعلیم کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے تھے، ان کی اس فنڈ سے امداد کی جائے اور مدرستہ العلوم علی گڑھ میں ایک سول سروس کلاس قائم کی جس کا طریقۂ تعلیم ایسا مقرر کیا گیا تھا جس سے اس کلاس کے طلبار کو ولایت میں پہونچ کر سول سروس کے امتحان میں مدد ملے۔

۱۸۸۳ء میں مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی مداخلت بورڈنگ ہاؤس سے ناراض ہوکر مسٹر سڈنس پرنسپل نے استعفیٰ کا نوٹس دے دیا تھا، چونکہ سید محمود لندن میں تھے ان کو لکھا گیا کہ وہ کالج کے لیے نیا پرنسپل تجویز کریں، چنانچہ مسٹر بیک کو جو کیمبرج یونی ورسٹی کے گریجویٹ تھے، اور یونیورسٹی کے پریسیڈنٹ رہ چکے تھے، علی گڑھ کالج کے لیے مع تنخواہ سو روپیہ ماہوار پرنسپل تجویز کر کے سید محمود انگلستان سے اپنے ہمراہ لائے، ابھی مسٹر سڈنس نے کالج نہ چھوڑا تھا کہ مسٹر بیک علی گڑھ کالج میں تشریف لے آئے، ان کے آنے کے دو ایک ماہ بعد مسٹر سڈنس علی گڑھ سے رخصت ہو گئے۔

مسٹر سڈنس کے علی گڑھ کالج سے جانے پر مسٹر بیک نے ان کے نام پر ۲۷ اگست ۱۸۸۴ء کو کیمبرج کے نمونہ پر علی گڑھ کالج میں سڈنس یونین کلب قائم کیا جو اب تک قائم ہے اور مسلم یونی ورسٹی یونین کہلاتی ہے، طلبار کے انتخاب سے اس کلب کے وائس پریسیڈنٹ، سکریٹری ٹریزرر اور سلیکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے اور کالج پرنسپل پریسیڈنٹ۔ اس کلب کے اوّل وائس پریسیڈنٹ خواجہ سجاد حسین صاحب اور سکریٹری سید محمد علی تھے اور ۱۸۸۷ء میں مولوی بدرالحسن وائس پریسیڈنٹ اور راقم الحروف (میر ولایت حسین) سکریٹری تھے آٹھ آنے فیس ممبری تھی ابتدا میں طلبار کے واسطے ممبری لازمی نہ تھی۔ اس کلب میں ہر ہفتہ کسی مضمون پر مباحثہ ہوتا تھا اور

ممبروں کے پڑھنے کے واسطے اردو، انگریزی اخبار اور رسالے خریدے جاتے تھے اور چند کتابوں کی اس کے ساتھ لائبریری بھی تھی۔

مسٹر بیک بہت خلیق شخص تھے اور طلبار سے بہت محبت سے پیش آتے تھے اور ان کے کمروں میں جاتے تھے، برخلاف دوسرے انگریزوں کے ان کا برتاؤ ہندوستانیوں کے ساتھ بہت اچھا تھا، مگر پڑھانے میں ایسے اچھے نہ تھے اس لئے طلبار میں کچھ عرصہ تک ہردل عزیز نہ ہوئے۔

جب مسٹر بیک پرنسپل ہوئے وہ تھرڈ اور فورتھ ایر کلاسوں کو انگریزی پڑھاتے تھے، اور کبھی کبھی فلسفہ پر بھی ان کا لکچر ہوتا تھا، مگر ان کے پڑھانے سے طلبا مطمئن نہ تھے، گو وہ طلبا کے ساتھ بہت اخلاق و محبت کا برتاؤ کرتے تھے، وہ طلبا کو اپنے گھر بلاتے تھے اور چار پلاتے تھے اور خود طلبا کے کمروں پر آتے تھے مگر اس برتاؤ کا طلبا پر کچھ اثر نہ تھا۔

بورڈنگ ہاؤس میں طلبا کی دو پارٹیاں تھیں، ایک پارٹی کے ہیڈ عزیز مرزا مرحوم فرحت مرحوم وغیرہ تھے، جو سیکنڈ ایر میں پڑھتے تھے اور سکنڈ کلاس بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے، دوسری پارٹی کے ہیڈ احمد حسین خاں تھے جو فورتھ ایر کلاس میں پڑھتے تھے، کرکٹ کے کپتان تھے اور فرسٹ کلاس بورڈنگ میں رہتے تھے وہ منشی محمد سعید خاں گڑھ کپتان کے صاحبزادے تھے جو سرسید کے مصاحب اور ایام غدر کے رفیق تھے، مسٹر بیک احمد حسین خاں مرحوم پر عنایت کرتے تھے مگر طلبا میں ان کو ہردل عزیزی حاصل نہ تھی ۱۸۸۵ء میں جب یونین کلب کے عہدیداروں اور سلکٹ کمیٹی کے ممبروں کا انتخاب ہوا، طلبار نے احمد حسین خاں کو یونین کا عہدیدار منتخب کرنا تو درکنار ان کو سلکٹ کمیٹی کا ممبر بھی منتخب نہیں کیا، حالاں کہ سلکٹ کمیٹی کے ممبروں میں بعض طلبائے اسکول منتخب ہوئے۔

مسٹر بیک کو جب علاوہ پرنسپل علی گڑھ کالج ہونے کے سٹوڈنس یونین کلب کے ایکس افیشو

پریسیڈنٹ تھے یہ انتخاب ناپسند ہوا، انہوں نے ممبران سٹڈنس یونین کلب کو جمع کیا اور ناواجب انتخاب پر اظہار ناراضی کرکے اس کو منسوخ کیا اور از سر نو انتخاب کے واسطے حکم دیا، یہ حکم ممبران سٹڈنس یونین کلب کو ناپسند ہوا اور سب نے ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔ اب سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ پرنسپل حکم منسوخی کو واپس لے لیں اور انتخاب کو بحال رکھیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

مئی ۱۸۷۷ء میں بابو سریندر ناتھ بنرجی نے ہندوستان کے اکثر حصوں کا اس غرض سے دورہ کیا تھا کہ ہندوستان کی تعلیم یافتہ جماعتوں کو اس بات کی طرف متوجہ کیا جائے کہ سول سروس کے امیدواروں کی عمر ۲۱ سے گھٹاکر ۱۹ برس قرار دی گئی ہے اس کی بابت گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ۲۱ برس کا قاعدہ جو امتحان مذکور کے لئے پہلے تھا اب پھر جاری کیا جائے اور تمام ہندوستانی مل کر ایک فنڈ بنام نیشنل فنڈ جمع کریں تاکہ جب کبھی ان کو گورنمنٹ ہند یا گورنمنٹ انگلستان میں کوئی درخواست یا شکایت پیش کرنے کی ضرورت ہو تو اس فنڈ کی آمدنی سے خرچ کیا کریں۔

اس دورے میں انہوں نے ایک مقام علی گڑھ میں بھی کیا تھا اور جو جلسہ اس مقصد کے لئے انسٹی ٹیوٹ ہال میں ہوا، اس کے صدر انجمن سرسید تھے، سرسید نے اپنی افتتاحی تقریر میں بابو سریندر بنرجی کے ایثار اور قومی اور ملکی خدمات کی بہت تعریف کی، بابو صاحب نے امتحان سول سروس کی عمر بڑھنے، امتحان مذکور کے ہندوستان میں ہونے، ہندوستانیوں کو والنٹیر بننے لیجسلیٹو کونسل کے ممبر انتخاب سے ہونے اور ہندوستان کے قانون میں اسی قسم کی اصلاحات کو بیان کیا۔

انہوں نے انگریزی میں مفصل تقریر کی اور انگریزی راج میں ہندوستانیوں کی جو حق تلفیاں ہو رہی تھیں ان کو مفصل بیان کیا۔ مسٹر بیک جو اپنے کو لبرل کہتے تھے اور مسٹر کیبین ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جو اپنے کو فرانسیسی نسل سے بتاتے تھے اس جلسہ میں شریک ہوئے تھے باقی حاضرین

جلسہ ہندوستانی تھے، تقریر بہت دل چسپ تھی، پانچ بجے شام شروع ہوئی اور آٹھ بجے شب تک ہوتی رہی مگر سامعین کی دل چسپی کم نہ ہوئی۔

میں اس وقت تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا اور جلسہ میں شریک تھا جلسہ کے خاتمہ پر مسٹر بیک نے تقریر کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں پارلیمنٹ کا کوئی ممبر انتخاب کرنے والی جماعت کو خطاب کر رہا ہے، یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہندوستانی سامعین کے سامنے تقریر کر رہا ہے، مگر میرا خیال ہے کہ یہ تقریر سامعین کی قابلیت سے اونچی تھی، جلسہ کے اختتام پر مسٹر بیک طلبا کے ساتھ پاپیادہ اپنی کوٹھی تک لکچر کی تعریف کرتے آئے۔

مسٹر بنرجی ہندوستانیوں کے دستخط سے گورنمنٹ کی خدمت پر اس موضوع پر ایک درخواست بھیجنا چاہتے تھے جو دورہ کے بعد انہوں نے بھیجی، مگر گورنمنٹ نے نامنظور کی۔

۱۸۹۲ء میں جب میں علی گڑھ آیا اس وقت اسٹریچی ہال کی صرف بنیادیں بھری گئی تھیں اور اس کے ایک حصہ پر جانب شرق چھپر پڑا ہوا تھا جس میں شیعہ طلباء کی نماز ہوا کرتی تھی، جب کوئی جلسہ ہوتا تو اس پر عارضی اندر کی طرف سے کپڑے کی چھت گیری لگا دی جاتی اور ہر قسم کی آرائش سے خوب صورت بڑا ہال تیار کر دیا جاتا تھا، یہ ہر دفعہ کا عارضی انتظام دیرپا نہیں ہوتا تھا اور روپیہ بے کار جاتا تھا اس لئے سر سید نے ۱۸۸۵ء میں اسٹریچی ہال کی تعمیر کے لئے پانسو روپیہ فی کس چندہ کی اپیل کی اور چندہ دہندگان کے نام اسٹریچی ہال میں کندہ کرانے کا اعلان کیا تعمیر کا تخمینہ ساٹھ ہزار روپیہ تھا، اس کے بعد تخمینہ میں بیس ہزار کا اضافہ کر دیا گیا جو ایک سو بیس چندہ دہندگان سے فی کس پانسو روپیہ وصول کیا جانا تجویز ہوا، اور سب سے اوپر اس شخص کے نام کا کتبہ تجویز ہوا جو دس ہزار روپیہ اسٹریچی ہال کی تعمیر میں دے، مگر یہ کتبہ آخر تک خالی رہا اور

سرسید رح کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں سید محمود نے اس پر سید صاحب کا نام "اسمہ احمد" کندہ کرا دیا۔

ایک روز مولانا شبلی نے ذکر کیا کہ کل بیک کو سرسید کے ہاں ذکر تھا کہ اگر تم امسال امتحان بی۔اے میں کامیاب ہو گئے تو تم کو اسکول میں بطور ٹیچر رکھا جائے گا۔ مارچ ۱۸۸۹ء میں جب میں الہ آباد سے امتحان بی۔اے دینے کے بعد واپس آیا تو مسٹر بیک نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر تم امسال بی اے میں کامیاب ہو گئے تو تم کو اسکول میں ایک جگہ ساٹھ روپیہ ماہوار کی دی جاوے گی کیا تم اس کو منظور کر لوگے؟ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ اور یکم جولائی ۱۸۸۹ء سے میں نے کالجیٹ اسکول میں نفتھ ماسٹری کا کام شروع کر دیا۔

"علی گڑھ کی بدولت ایک عام بیداری پیدا ہوئی اور قوم کے قوائے علم و عمل حرکت میں آئے یہ گویا ہماری نشاۃ الثانیہ ہی کی ایک تحریک تھی۔"

اقبالؔ

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ

ایم۔اے۔او کالج میں میرا داخلہ

۱۴ر مئی سنہ ۱۸۹۱ء کو ایم۔اے۔او کالج کی فرسٹ ایر کلاس میں میرا داخلہ ہو گیا، لاہور سے علی گڑھ تک کا سفر بڑا ہی عجیب معلوم ہوا، کچھ نئی شکلیں کچھ عجیب و غریب طریقے مشاہدے میں آئے اور قریب بارہ بجے رات کو میں علی گڑھ پہونچ گیا۔ جب میں علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہونچا تو آواز سن کر کہ علی گڑھ کا اسٹیشن آ گیا میں فوراً درجہ سے اترا اور سامنے خالی پلیٹ فارم دیکھ کر وہیں اپنا سامان رکھ دیا اور دیوار کے سہارے بچھونا بچھا کر سو گیا، اور صبح تک برابر سوتا رہا۔ ان دنوں یا تو آدمی کم تھے یا لوگ سفر کم کرتے تھے اس لئے آج کل سی بھیڑ بھاڑ اسٹیشن پر نہ تھی ورنہ اب بڑے بڑے اسٹیشن پر سونے کا کہاں موقعہ ملتا ہے۔

صبح کو اٹھ کر ایک قلی کے سر پر اپنا سامان رکھوا کر کہا کہ ایم۔اے۔او کالج لے چلو۔ ان دنوں تانگے نہیں ہوتے تھے بلکہ گھوڑا گاڑیاں ہوتی تھیں جو ریلوں کی آمد کے وقت اسٹیشن پر آیا کرتی تھیں، اس لئے مجھ کو کوئی سواری نہیں ملی۔ قلی جو میرے ساتھ تھا وہ مجھ سے بھی زیادہ ناواقف نکلا، وہ اول تو مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول میں لے گیا وہاں سے اس کو کسی نے بتایا تو وہ سائنٹفک سوسائٹی کے مکان پر لے گیا۔ وہاں پر ایک صاحب نے قلی کو ٹوکا کہ تم

کہاں لئے لئے پھر رہے ہو اشارہ کرکے بتایا کہ ایم۔ اے۔ او کالج ادھر ہے، اس کے بعد قلی مجھ کو کالج کے وکٹوریہ گیٹ پر لے کر پہونچا، وہاں مجھ کو بھائی جی ظفر علی ملے، یہ بھائی جی ظفر علی بھی فرسٹ ایر کلاس میں داخل ہونے کے لئے آئے تھے۔ میں نے ان سے حافظ ولی احمد کا نام دریافت کیا جو لاہور میں پڑھا کرتے تھے اور مجھ سے واقفیت تھی، مجھے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے آکر تھرڈ ایر کلاس میں داخل ہوگئے ہیں، چنانچہ بھائی جی ظفر علی نے کسی سے ان کے کمرے کا پتہ دریافت کرکے مجھے ان کے پاس پہونچا دیا وہاں پر دو تین اور دوست جن سے واقفیت تھی ملے اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی غیر ماحول میں نہیں ہوں بلکہ اپنے ہی لوگوں میں ہوں، دوسرے روز میں فرسٹ ایر کلاس میں داخل ہوگیا، سر ٹامس آرنلڈ نے مجھ کو داخل کیا اور سر تھیوڈور ماریسن سے جو قائم پرنسپل تھے تعارف کرایا۔

مجھے اس بارک میں کمرہ ملا جس کو کچی بارک کہتے ہیں، میرے کمرے کے پاس بہت طالب علم رہتے تھے، جیسے خواجہ غلام الثقلین مرحوم، خان بہادر ڈاکٹر حبیب اللہ خاں وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے یا تیسرے دن میں کچھ معززین کے خطوط جو لاہور سے اپنے ساتھ سر سید علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پیش کرنے کو لایا تھا وہ لے کر کوٹھی پر گیا اور مولانا حکیم نورالدین صاحب کا ایک پیغام تھا وہ ان کی خدمت میں پہونچایا، سر سید علیہ الرحمۃ نے نہایت شفقت اور محبت سے فرمایا کہ کبھی کبھی آکر ہم سے ملتے رہیئے گا، میری زندگی کے وہ دن جو بورڈنگ ہاؤس میں گذرے بہت ہی لطف اور بے فکری کے دن تھے، سر سید کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتا تھا اور جتنی مرتبہ حاضری کا شرف حاصل کیا، اتنی ہی مرتبہ کوئی نہ کوئی ایسی بات حاصل کی کہ جس کا اثر میری زندگی پر بہت اچھا پڑا اور اب تک میں ان ہی کے فیض کا اپنی طبیعت کو مطیع پاتا ہوں۔

سر سید کے پاس بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور

مسلمان بھی، ہندوؤں میں راجہ جے کشن داس آن جہانی کو جو کہ سر جگدیش پرشاد صاحب کے دادا تھے، ان کو کبھی کبھی سر سیدؒ کے پاس دیکھا کرتا تھا وہ مراد آباد کے رئیس تھے، لیکن سر سیدؒ سے محبت سے ہمیشہ دو مہینہ میں سر سید سے ملنے آجایا کرتے تھے وہ ٹھہرتے بھی سر سیدؒ کے پاس تھے اور کھانا کھانے کا انتظام ان کا مجھ کو معلوم نہیں کہاں ہوتا تھا، لیکن ایک برہمن رسوئیا ان کے ساتھ آیا کرتا تھا، راجہ صاحب آن جہانی ہندو قوم کی ترقی اور تہذیب کے متعلق مایوسی کا اظہار کیا کرتے تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہندو ذات پات کے قیود کے شکنجے میں ایسے کسے ہوئے ہیں کہ ان کو تہذیب اور ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں ملتا، ایک موقع پر راجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر ہندو قوم اپنی رسوم اور ذات پات کی زنجیروں میں جکڑی رہی جیسی کہ اب ہے تو ہزار سال میں بھی وہ ایک مہذب قوم نہ بن سکے گی، سر سید نے فرمایا یہ ضرور ہے کہ ہندو اپنی ذات پات اور رسوم کے جکڑبند میں مبتلا ہیں اور آزادی سے آگے بڑھنے میں ان کے راستے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں، لیکن رسموں کی پابندیاں کمزور ہو رہی ہیں ممکن ہے کہ بہت جلد ہندو قوم کو ان سے نجات مل جائے اور وہ ترقی کی راہ پر پڑ جائیں۔ مسلمانوں کی حالت ہندوؤں سے بھی بدتر ہے، وہ یوں تو وہ اپنے کو ایک قوم کہتے ہیں لیکن علماء نے ان میں اس قدر اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ ایک گروہ دوسرے کا جانی دشمن ہو گیا ہے، پہلے ہی مسلمانوں میں بہت سے فرقے تھے لیکن اب ان میں اضافہ پر اضافہ ہو رہا ہے، ایک مولوی دوسرے کا دشمن ہے اور اپنے اپنے مریدوں کو دشمن بنانے میں ان کی تمام کوشش صرف ہوتی ہے، ترقی و تہذیب کو وہ اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں، میرے نزدیک مسلمانوں کی حالت ترقی کے میدان میں ہندوؤں سے بدرجہا بُری ہے، ممکن ہے کہ موجودہ زمانہ کی تعلیم مولویوں کے پنجہ سے اس قوم کو نجات دلا دے اور مسلمان بھی ترقی کی راہ پر پڑ جائیں اور آخر میں یہ دونوں قومیں ترقی اور تہذیب میں یورپ کی قوموں کا مقابلہ کرنے لگیں۔

میں نے ایف، اے کی دونوں کلاسوں میں دو سال تک پڑھا، میرے استادوں میں سر تھیوڈور مارسین، سر ٹامس آرنلڈ، جادب چند رچکرورتی، شمس العلماء مولانا شبلیؒ، اور شمس العلماء مولانا عباس حسین صاحب تھے، یہ سب لوگ صاحب تصنیف گذرے سر ٹامس آرنلڈ نے "پریچنگ آف اسلام" جیسی شہرۂ آفاق کتاب لکھی، شمس العلماء مولانا شبلی رہ نے اسلامی تاریخ کے لٹریچر میں اس قدر زبردست اضافہ کیا کہ اور کسی ہندوستانی مصنف نے اس قدر اضافہ نہیں کیا ہے، مولانا مرحوم و مغفور کی سیرت النبیؐ الفاروق المامونؒ حالات متعلق کتب خانہ اسکندریہ بہت مقبول تصنیفات ہیں، جادب چند چکرورتی نے اسکولوں کے نصاب کے لئے ریاضی میں دو ایسی اچھی کتابیں لکھیں کہ کل ہندوستان کے اسکولوں میں ان کا رواج ہوگیا اور ان کتابوں سے چکرورتی صاحب کو اتنا منافع ملا کہ جب وہ ملازمت سے الگ ہوئے تو ان کے پاس پانچ لاکھ روپیہ نقد تھا، مولانا عباس حسین کی کوئی خاص تصنیف تو مجھے یاد نہیں، لیکن وہ بڑے عالم تھے اور مذہبی اختلافات کو مٹانے میں وہ ہمیشہ سر سیدؒ کی امداد کرتے رہے، ہمارے زمانہ کے اساتذہ میں ایک مولانا خلیل احمد صاحب تھے جو عرضی کے عالم تھے اور ان کی تعلیم سے بہت سے لوگ خواہ وہ کالج کے طالب علم ہوں یا نہ ہوں بہرہ ور ہوتے تھے، مولانا عباس حسین مرحوم ضلع جگت بولنے کے بہت عادی تھے، ایک مرتبہ مولانا شبلی رہ کے پاس آئے تو مولانا بیٹھے کیلا کھا رہے تھے، انہوں نے مولانا عباس صاحب کے سامنے پیش کیا کہ آپ بھی کھائیے، مولانا عباس حسین صاحب نے جواب دیا اکیلے ہی کھائیے، ایک مرتبہ محترم کی تعطیل کے متعلق جو کالج میں ہوتی تھی گفتگو شروع ہوئی کہ کتنے دن کی تعطیل ملتی فرمائی ہے، مولانا نے فرمایا کہ کبھی بارہ روز کی تعطیل ہوتی تھی اس کے بعد دس روز کی ملنے لگی، پھر گھٹتے گھٹتے سات روز کی رہ گئی اب سات روز میں بھی شش و پنج ہے

مولانا عباس حسین صاحب جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تھے تو طالب علم پہلے ہی سے ہنسنا شروع کر دیتے تھے کہ یہ خوب ضلع بولیں گے اور حاضرین کو خوب ہنسائیں گے، ایک جلسے

میں کچھ روز کے لئے مولانا باغات کے نگراں ہو گئے، اور ایک دفعہ فرمایا مالی کی خوب کوشش مالی کرتا ہوں، لیکن مالی نقصان نہیں پہونچاتا، اس قسم کی ضلع بازی سے ان کو خود بھی لطف حاصل ہوتا تھا اور ان کے شاگرد ہمیشہ بہت محظوظ ہوتے تھے۔

مولانا عباس حسین صاحب شیعہ اثنا عشری تھے وہ غیرمسلموں کے ہاتھوں کی چیز نہیں کھاتے تھے، وضو اور طہارت کا ہمیشہ بہت خیال رکھتے تھے لیکن میں نے ان کے دل میں کسی غیر مذہب کو نقصان پہونچانے کا خیال نہیں پایا۔

ہم لوگوں کا معمول تھا کہ صبح کے وقت سب سے اول کالج کا وقت شروع ہونے سے قبل سب جماعتوں کے طالب علم اسٹریچی ہال میں یا اور کسی بڑے ہال میں جمع ہو جاتے تھے اور وہاں پر مولانا شبلی صاحب خوش الحانی سے قرآن پاک کے کسی رکوع کی تلاوت فرماتے تھے اور ترجمہ کر کے ہم لوگوں کو سمجھاتے تھے اتنے میں گھنٹی ہو جاتی تھی اور ہم لوگ اپنی اپنی کلاسوں میں چلے جاتے تھے، یہ زمانہ بہ لحاظ اپنی عمر کے اور بہ لحاظ بہت سے خوش گوار مشاغل کے ایسا اچھا گذرا کہ اس کی ایک ایک بات اس وقت تک یاد ہے، کالج سے اس قدر انسیت پیدا ہو گئی تھی کہ کسی کو اپنے ماں باپ اور گھر سے بھی محبت نہیں ہوتی ہو گی، ایک مرتبہ ایک انگریز کلکٹر نے اس زمانہ میں جب میں وکالت میں تھا مجھ سے پوچھا کہ تم اپنے کالج کے متعلق کیا کرتا چاہتے اور کیا ایسی بات تمہارے دل میں ہے جس سے تم کالج کی زندگی کے متعلق خوشی حاصل ہو سکتی ہے میں نے جواب دیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں پھر طالب علم بن کر اپنے بورڈنگ ہاؤس کے کمرے میں جا کر رہوں، اس پر انگریز نے قہقہہ لگایا کہ بالکل یہی خیال میرے بھی ہیں کہ میں کیمبرج میں جا کر پھر طالب علم کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس زمانہ کے طالب علموں کو اپنے کالج سے کس درجہ گہری محبت ہو جایا کرتی تھی۔

مجھے امید ہے کہ اس کے بعد کے طالب علموں کو اپنے کالج سے ویسی ہی محبت ہو جاتی ہو گی لیکن اب یونیورسٹی کی زندگی ہمارے زمانہ کی زندگی سے مختلف ہے، ہم تعداد میں کم تھے اس

سے ہر ایک کو کالج کی زندگی گھر کی زندگی کی طرح معلوم ہوتی تھی، اب چار پانچ ہزار طالب علم ہیں، بجائے ایک دو ہوسٹل کے پندرہ بیس ہوسٹل ہو گئے ہیں۔ اس لئے ایسے گہرے تعلقات آپس میں پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ ادارے کے در و دیوار سے اس قسم کا انس ہو سکتا ہے جیسا کہ پہلے تھا۔

ہم لوگوں کی زندگی میں ڈرل، جسمانی ورزشیں، کرکیٹ، فٹ بال، رائڈنگ اسکول اور بہت سے بڑے بڑے مشاغل تھے، ان کے علاوہ یونین کلب اور چھوٹی چھوٹی سوسائٹیاں مثل ڈیوٹی سوسائٹی وغیرہ ہمارے دن رات کے خوش گوار مشاغل کے لئے بہت کافی تھے، یونین کلب اور ڈیولی سوسائٹی میرے آنے سے پہلے قائم ہو چکے تھے، لیکن رائڈنگ اسکول میرے آنے کے دو سال بعد سر تھیوڈور ماریسن نے قائم کیا۔

سب سے پہلے جنھوں نے گھوڑے کی سواری سیکھنا شروع کی ان میں میں اور میرے ہم کلاس ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم، مولانا ظفر علی خاں، و نیاز محمد خاں اور غلام محی الدین خاں تھے اور ہماری کلاس کے پانچ آدمیوں کے علاوہ ڈاکٹر ناظر یار جنگ تھے، سر تھیوڈور ماریسن خود بہت بڑے شہ سوار تھے، ان کو گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا، اور اسی وجہ سے انھوں نے رائڈنگ اسکول قائم کیا تھا جو اب تک قائم ہے، درمیان میں اس کو بہت ترقی ہوئی تھی اور اب بھی وہ اچھی حالت میں ہے، سر تھیوڈور ماریسن فٹ بال کھیلنے میں بھی بڑے مشاق تھے اور ان کی وجہ سے فٹ بال کلب کو بہت ترقی ہوئی۔ کرکٹ میں ہم لوگوں کا کچھ حصہ نہیں تھا اور نہ ہماری کلاس کا کوئی طالب علم فرسٹ الیون میں کبھی ممبر لیا گیا کرکٹ پر مولانا شوکت علی مرحوم کی پارٹی حاوی تھی، مولانا مرحوم کے زمانہ میں کرکٹ کو بہت فروغ ہوا تھا وہ ایک [illegible] بیسیوں آدمی تھے جو اپنی وہ ایک علیحدہ پارٹی کہتے تھے اور اس پارٹی کے افراد سے ان کے بہت گہرے تعلقات رہتے تھے وہ کرکٹ کے کپتان بھی ہو گئے تھے۔ ان کے زمانہ میں علی حسین صاحب اور احسان الحق صاحب [illegible] ممتاز [illegible]

رکھتے تھے، ایک وقت میں علی گڑھ کرکیٹ ٹیم کی بہت یہاں دھاک تھی جب ہماری کرکیٹ الیون دوسرے مقامات پر کھیلنے کے لئے جاتی تھی تو دور دور کے آدمی کھیل دیکھنے کے لئے آجایا کرتے تھے اسٹر بیک پرنسپل کو ہماری کرکیٹ الیون سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور کبھی کبھی وہ اس کے ممبروں کی بعض فرو گذاشتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے تھے ان دنوں پرنس رنجیت جو بعد میں جام نگر کے مہاراجہ ہوئے، انگلستان میں کرکیٹ کھیلا کرتے تھے اور انہوں نے اس کھیل میں ید طولیٰ اور بڑا نام حاصل کیا تھا اور انگریز ان کی کرکیٹ کے اس قدر مداح تھے کہ بعض شاعروں نے انگریزی میں ان کے کرکیٹ کھیلنے کی تعریف میں قصیدے لکھے تھے، ان مہاراجہ صاحب کو انگریز رنجی کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور اب بھی ان کے نام سے بعض انعامات کرکیٹ کھیلنے والوں کو دیے جاتے ہیں، مسٹر بیک نے ایک مرتبہ اپنی ایک تقریر میں کہا کہ انگلستان میں اس وقت دو ہندوستانی الگ الگ کام کر رہے ہیں، ان میں ایک تو دادا بھائی نوروجی ہیں جو ہندوستان کے سیاسی معاملات میں انگریز قوم پر اثر ڈال رہے ہیں اور دوسرے رنجیت سنگھ ہیں جو برٹش پبلک کو ہندوستان کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ہندوستان کا ایک ایک فرد ناموری حاصل کرنے کے قابل ہے ان دونوں میں سے برٹش قوم پر رنجیت سنگھ کا زیادہ اثر ہے، یہ زمانہ جب انہوں نے تقریر فرمائی تھی ہماری علی گڑھ کرکیٹ کے عروج کا زمانہ تھا۔

کرکیٹ کے علاوہ فٹ بال ٹیم بھی بہت کامیابی کے ساتھ نام پیدا کر رہی تھی، فٹ بال کھیلنے کے لئے دوسری یونیورسٹیوں اور دوسرے کالج سے طالب علم آیا کرتے تھے، ایک مرتبہ رڑکی سے انگریز اور اینگلو انڈین لڑکے فٹ بال کھیلنے آئے انہوں نے یہاں آکر فٹ بال کے میدان میں بہت شد و مد سے اپنا کھیل دکھایا اور کئی ہزار تماشائیوں کو بہت لطف آیا، لیکن ہمارے طلباء نے ان کو ہرا دیا، جب ہمارے طلباء ان کو دھکے دے کر گرا دیتے تھے تو مسلمان بڑے اور خاص ماں جوان کے ساتھ آئے تھے ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری

ہوجاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان فراعون فرنگیوں کو جو لوگ دھکے دیکر گرادیتے ہیں وہ ان سے زبردست ہیں، ہم تو روڑکی میں یہ سمجھا کرتے تھے کہ ان کے مقابلہ میں دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن آج ہم خوش ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائی اس قابل ہیں کہ ان لوگوں کے غرور کو توڑ دیں، یہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے ہیں ہم پیٹ کی خاطر ان کی نوکری کرتے ہیں لیکن یہ ہندوستانیوں کی بہت بے قدری کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ گورا فوج کی ٹیم سے ہمارے طالب علموں کا علی گڑھ میں مقابلہ ہوا، ایک طالبعلم کی ٹھوکر سے ایک گورے کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ کر چورا چور ہوگئی، یہاں سے گورے اُسے اٹھاکر اپنے کیمپ میں لے گئے وہاں اس کی ٹانگ کاٹ دی گئی، لیکن بعد میں اس کا انتقال بھی ہو گیا، ہماری ٹیم کی جو کچھ بھی تنظیم اور قوت تھی وہ سر تھیوڈور ماریسن کے ساتھ تھی ان کے بعد طالب علم اب تک فٹ بال کھیلتے ہیں، لیکن ہماری ٹیم کی ویسی شہرت نہیں ہوئی، جیسی کہ سر تھیوڈور مارلیسن کے سامنے تھی،

یونیورسٹی کے کلبوں میں سٹوڈنس یونین کلب طالب علموں کے لئے بہت بڑی دلچسپی کا کلب تھا، اس میں ہفتہ وار بحث و مباحثہ اور تقریریں ہوتی تھیں اور سال میں جس شخص کی تقریریں اور بحثیں سب سے زیادہ پسندیدہ ہوتی تھیں اس کو ایک میڈل ملا کرتا تھا جس کو کیمبرج اسپیکنگ پرائز کہتے تھے، سب سے اول پرائز صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کو ملا تھا، صاحبزادہ صاحب بیرسٹری کے لئے ولایت چلے گئے تھے وہ قریب قریب ۱۸۹۴ء کے وہاں سے واپس آئے اس دوران میں، اور طالبعلموں کو یہ میڈل ملتا رہا اور سب کے نام یونین کلب کی دیواروں اور تختوں پر لکھے ہوئے ہیں، ۱۸۹۶ء کا میڈل اس خاکسار کو ملا تھا۔

اب تک سالانہ میڈل برابر ملے چلے جاتے ہیں، طالب علم اس میڈل کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس میڈل کو حاصل کرنا ایک امتیاز اور فخر کی بات سمجھی جاتی ہے، اس یونین کلب کی وجہ سے طالبعلموں میں اختلاف بھی پیدا ہوتے ہیں، اس کے

عہدیداروں میں سب سے بڑا عہدہ پریزیڈنٹ کا ہوتا تھا، کالج کا پرنسپل پہلے زمانہ میں اور اب کچھ دن پہلے تک وائس چانسلر پریذیڈنٹ ہوتا تھا، اور طالبعلموں میں سے ایک وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوتا تھا، اس کا انتخاب بڑے معرکہ کا ہوتا تھا، دو پارٹیاں ہو جاتی تھیں اور اپنے امیدوار کے لئے اس قسم کی کوشش کرتے تھے جیسے کہ کونسلوں کے چناؤ کے لئے لوگ کرتے ہیں، انتخاب کے دن سے تین چار روز پہلے سے طالب علم دن رات اسی مشغلہ میں رہتے ہیں وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی بہبودی اور سیاست اور یونیورسٹی کی ترقی و تنزلی ان کے اس چناؤ اور کامیابی پر بنی ہے، اب سے کچھ قبل سے انتخاب نے بدنما شکل اختیار کر لی ہے کہ جب ایک پارٹی کا امیدوار ہار جاتا ہے تو دوسری پارٹی والے ہارنے والے کا جنازہ نکالتی ہے یہ نہایت ہی مذموم طریقہ ہے اور مجھے تعجب ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر یا بعد کے کسی وائس چانسلر نے اس کو بند کرنے کا کوئی عملی اقدام اختیار کیا، انتخاب خوشی کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ ماتمی رسوم ادا کرنے کے لئے، یونیورسٹی کے طلباء خود جب اس برائی کی مضرت محسوس کریں گے تو وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں اس یونین کے انتخاب کی وجہ سے یونیورسٹی میں سخت خلفشار اور ہنگامہ پیدا ہوا۔ طالبعلموں نے وائس چانسلر کے حکم کی وجہ سے جو دونوں پارٹیوں میں سے ایک کے حق میں مفید تھا یونیورسٹی میں اسٹرائک کر دیا اور کئی روز تک طالب علم اپنی کلاسوں میں نہیں گئے، گو کہ وائس چانسلر نے اپنے نزدیک واجبی حکم صادر کیا ہوگا لیکن طالبعلموں نے اس کو ایک پارٹی کی جانبداری پر محمول کیا اور ترک موالات پر آمادہ ہو گئے، بہرحال کام میں کچھ نہ کچھ خرابیاں ہوتی ہیں، گذشتہ طلباء نے اس کلب کو ایک مفید ادارہ بنا دیا تھا اور یونیورسٹی کے طلباء کے لئے بطور وراثت کے چھوڑا ہے۔

ہمارے زمانہ میں سرٹامس آرنلڈ اور شمس العلماء مولانا شبلی نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام اخوان الصفا تھا۔ اس انجمن کے ماہانہ جلسے ہوتے تھے اور ان میں علمی مضامین پڑھے

جاتے تھے اس انجمن کے ممبروں کی تعداد بہت قلیل تھی، لیکن اپنے کام کی اہمیت کے لئے یہ بہت ہی مفید جماعت تھی، ممبروں کو تاریخی اور علمی تحقیقات کا موقع ملتا تھا، بڑی محنت اور کاوش سے وہ پرانی کتابوں کا مطالعہ کر کے مفید واقفیت حاصل کرتے تھے اور اپنے مضامین کو بہت ہی کارآمد علمی واقفیت کا ذخیرہ بنانے کی کوشش کرتے تھے یہ انجمن بہت دنوں تک قائم نہ رہی اور اس کے بند ہونے کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہ تھی کہ اس زمانہ میں اس قسم کی علمی تحقیقات سے عام طور پر دل چسپی کا باعث نہیں رہی تھی، یورپ میں بھی ہزاروں تعلیم یافتہ اشخاص میں سے ایک آدھ ہی عالم ایسا نکل آتا ہے جو علمی اور تاریخی تحقیقات میں دل چسپی رکھتا ہو اور علمی معلومات کے مہیا کرنے میں اپنا وقت دیتا ہو۔

ہمارے کالج میں ٹینس کلب کچھ اچھی حالت میں نہیں تھا جمناسٹک کی درزشوں کے لیے کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اور نہ تیراکی کا تالاب تھا، ڈرل ضرور ہوتی تھی، لیکن ڈرل کے لیے کوئی کلب نہیں تھا، اس زمانہ میں یو۔ ٹی۔ سی کا بھی شعبہ نہیں تھا، غرض یہ کہ ہمارے زمانہ میں جس قدر بورڈنگ کی زندگی تھی اس کی حالت ابتدائی منظروں سے تعلق رکھتی تھی، اس کے بعد کالج اور یونیورسٹی کی زندگی میں بہت دل چسپی کے سامان پیدا ہو گئے جو اس وقت بھی قائم ہیں، لیکن ایک بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ کے طلبار میں جو خصوصیت اور انسیت کے تعلقات کالج سے و نیز آپس میں پیدا ہو جاتے تھے، اس قسم کے تعلقات طالب علموں کی افراط کی وجہ سے اب دیکھنے میں نہیں آتے۔

سرسید رہ کی خدمت میں مجھ کو سب سے زیادہ حاضری کا موقع ملتا تھا کیوں کہ میں نے سرسید رہ کی تصنیفات اور مضامین کا بہ کثرت مطالعہ کیا تھا اور مجھے مرحوم سے ایک دلی عقیدت ہو گئی تھی، سرسید رہ بھی مجھ پر بہت مہربانی کرتے تھے اور کبھی کبھی کھانے

پر بھی بلا لیا کرتے تھے، سر سید ہی نے مجھ کو اخبارات میں مضامین لکھنے سکھائے اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک شخص ایرانی النسل جن کا نام وردی تھا اور جو وردی اصفہانی کے نام سے مشہور تھے وہ کانگریس کے بہت گرویدہ تھے اور سر سیدؒ کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے، ان کے مضامین فارسی میں ہوتے تھے اور ان کو میں بخوبی سمجھ سکتا تھا ایک مرتبہ سر سید نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو اس مضمون کو پڑھو اور غور کرو کہ تم اس کا جواب دے سکتے ہو یا نہیں، میں نے مضمون پڑھا اور عرض کیا کہ جو کچھ ارشاد ہو لکھ دوں گا میں نوٹ کئے لیتا ہوں، موصوف نے مجھے چند باتیں بتائیں اور کہا کہ ان پر خاص زور دینا، میں نے ان کو نوٹ کر لیا اور جا کر ایک مضمون لکھا اور تیسرے روز پیش کیا، اس میں بہت سی غلطیاں تھیں جن کو مرحوم نے خود اپنے قلم سے ٹھیک کیا، میں نے وہ مضمون صاف کر کے اخبار میں بھیج دیا، جب وہ مضمون شائع ہوا تو وردی اصفہانی صاحب نے جواب الجواب لکھا کیونکہ وہ مجھ کو نہیں جانتے تھے کہ میں کون ہوں اس لئے انہوں نے تمہید میں لکھا کہ "مسٹر عبداللہ لمی دانم کہ ماشر ہستی یا متعلم ہستی" اور اس کے بعد سر سیدؒ کی پولیٹیکل پالیسی پر خوب حملے کئے۔ سر سیدؒ ان کو پڑھ کر خوب ہنسے اور فرمایا کہ ان کا جواب بہت کمزور ہے اس وقت کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے آئندہ جب وہ مضمون لکھے گا اس وقت جواب دینا، لیکن نہ معلوم وردی صاحب پر کیا اثر ہوا کہ اس کے بعد سر سیدؒ کے خلاف کوئی مضمون نہیں لکھا، یہ میرا پہلا مضمون تھا، اس کے بعد میں خود ہی اخبارات میں مضمون لکھنے لگا۔ سر سید میرے مضامین پڑھ کر خوشنودی کا اظہار فرمایا کرتے تھے،

ایک مرتبہ کسی موضوع پر سر سیدؒ نے مضمون لکھا اور مجھے ان کی رائے سے سخت اختلاف تھا، میں نے اپنے نام سے تو موصوف کے مضمون کا جواب نہیں دیا، بلکہ ایک گمنام خط مضمون کے جواب میں لکھ دیا۔ اس کے بعد سر سیدؒ نے اخبار میں لکھا کہ کسی دوست نے میرے مضمون کا جواب لکھا ہے لیکن اس کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں ہوئی کہ انہوں نے اپنا نام کیوں نہیں

لکھا ہے ہم کو اس مضمون میں راستی اور معقولیت معلوم ہوتی ہے میں اپنے دل میں بہت خوش ہوا کہ میرے مضمون کی بہت قدر ہوئی اور اگر سرسید رہ سے جاکر اقرار کروں گا کہ وہ خط میں نے لکھا تھا تو وہ مجھ سے خوش ہوں گے، چنانچہ میں نے جاکر عرض کیا کہ وہ مضمون میں نے لکھا تھا، اپنا نام اس لئے نہیں لکھا کہ یہ بات میری گستاخی سمجھی جائیگی کہ میں حضور والا کے مضامین سے مخالفت کرتا ہوں، فرمایا کہ اچھا تم نے یہ گمنام خط لکھا تھا، یہ سخت بد اخلاقی میں شامل ہے، کہ گمنام خط لکھے جائیں، ابھی اسی وقت تہیہ کرو کہ آئندہ گمنام مضامین نہیں لکھو گے، میں نے توبہ کرلی اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی بھی گمنام مضمون نہیں لکھوں گا اور میں نے آج تک اس عہد کی پاس داری کی ہے اور کبھی گمنام مضامین اخبارات میں نہیں بھیجے ۔

ہمارے ملک کے سامنے ایک عظیم الشان کام ہے ایک اچھی قومی زندگی کی تعمیر کا کام۔ اس میں ضرورت ہے کہ قوت کا ایک ایک شمہ خوشی خوشی اس کام میں لگا دیا جائے ۔علی گڑھ جس طرح کام کرے گا۔ علی گڑھ جس اسلوب سے سوچے گا علی گڑھ ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے جو پیش کش دے گا اس سے متعین ہوگا ہندوستانی قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام۔ ہندوستان علی گڑھ کے ساتھ جو سلوک کرے گا اس پر ہاں بڑی حد تک اس پر منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

سر رضا علی

مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں میرا داخلہ

چودہ جولائی ۱۸۹۵ء کو کندرکھی مراد آباد سے علی گڑھ پہونچا اور دوسرے دن کالج میں داخل ہو گیا، علی گڑھ سے مجھے وہ وظیفہ ملا جو ہونہار غریب طلبا کو دیا جاتا ہے، کالج کی فیس، کمرہ کا کرایہ اور کھانے پینے کا سب خرچ ملا کر اور رقم وظیفہ خرچ کرنے کے بعد مجھے صرف سات روپے کالج کو دینے پڑتے تھے، رہنے کو کچی بارک میں ستاون نمبر کا کمرہ ملا اور بی، اے پاس کرنے تک میں اسی کمرہ میں رہا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بانی کالج کی روح کو دعا دی، جولائی کے اخیر یا اگست کے شروع میں کالج کی سالانہ تعطیل ہوئی تو میں کندرکھی پہونچا۔

اکتوبر کے آخر میں کالج کھلنے پر میں علی گڑھ پہونچا، جب تک مراد آباد کے اسکول میں رہا فٹ بال اور ٹینس کھیلتا رہا، باقاعدہ کھیلنے والوں میں نہ تھا تاہم اکثر کھیلتا تھا میرے پاس بہت سی یادداشتیں اور روزنامچے موجود ہیں، ۹ر دسمبر ۱۸۹۷ء کی یادداشت جو مراد آباد میں لکھی تھی اس کا ترجمہ یہ ہے "جس قدر زیادہ وقت مل سکے پڑھنے لکھنے میں صرف کرنا چاہیے، کھیل کے لئے صرف ایک گھنٹہ یعنی شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کافی ہے، علی گڑھ میں کسی کھیل سے تعلق نہ رکھا، علی گڑھ کے کھلاڑیوں کے بہت سے قصے سنے تھے، ڈر ہوا کہ

ایسا نہ ہو کہ فٹ بال وغیرہ کا شوق پڑھنے کے ذوق پر غالب آجائے میری طبیعت کا ڈھنگ یہ ہے کہ جس کام میں لگ جاتا ہوں اُسے پورے انہماک کے ساتھ کرتا ہوں لیکن ایک وقت میں دو کام اس طرح انجام نہیں دے سکتا کہ نتیجہ خود میری نظر میں قابلِ اطمینان ہو اب غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً جو کچھ ہوا بہتری اسی میں تھی، مجھے اخبار اور کتابیں پڑھنے کا شوق تھا اس مناسبت سے بجائے فٹ بال اور کرکٹ کے میدان کے کالج یونین کو میں نے اپنی طبیعت کا جولاں گاہ بنایا، نومبر کا مہینہ تھا، مجھے گھر سے آئے چند ہفتے گذرے تھے، ایک دن یونین میں اخبار پڑھنے پہونچا، سب طالب علم خاموشی سے بیٹھے اخبار اور رسالے پڑھ رہے تھے، یونین میں اس زمانہ میں پنجاب آبزرور اور سول کرانیکل کے علاوہ الہ آباد کا پانیر، لکھنؤ کا انڈین ڈیلی ٹیلی گراف اور ایڈوکیٹ کلکتہ کے اسٹیٹس مین اور انگلش مین دہلی کا مارننگ پوسٹ اور بمبی کے ٹائمز آف انڈیا اور بمبی گزٹ آتے تھے۔

میرے زمانہ میں علی گڑھ میں کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے والوں کی خاص قدر تھی، ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلبار کا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال نہ اساتذہ کو تھا نہ ٹرسٹیوں کو،

مولوی عزیز مرزا مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم اپنے دور کے بہترین علمی اور ادبی مذاق رکھنے والے طالبعلم تھے، ہم عصر ان دونوں صاحبوں کی بڑی قدر کرتے تھے مگر کالج کے ارباب حل وعقد کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے رہے۔ غلام حسین مرحوم بھی جب تک علی گڑھ میں رہے مورد عتاب رہے، مولانا محمد علی کی جو تھوڑی بہت قدر ان کی طالب علمی کے زمانہ میں تھی وہ ان کی ذاتی قابلیت کے باعث نہ تھی، بلکہ مولانا شوکت علی (کرکٹ کے مشہور کپتان) کے بھائی ہونے کی وجہ سے تھی، مسٹر مارلسین نے ایک حد تک اور نواب محسن الملک نے اکثر ہونہار طلبار کی قدر ان کی علمی قابلیت کے بموجب کی دونوں کا یہ بڑا احسان ہے۔

میری خوش قسمتی ہے سید سجاد حیدر، سردار محمد حیات خاں، حیدر حسن مرحوم تینوں کی

پارک میں رہتے تھے۔ بڑے صاحب مطالعہ تھے، کرکٹ فٹ بال وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا
تینوں حضرات علی گڑھ کی زندگی کے گہرے نقاد تھے۔ حیدر حسن اور سجاد حیدر بڑے بذلہ سنج تھے
محمد حیات کی شگفتگی مزاج کا اظہار خاص خاص دوستوں کی سوسائٹی میں ہوتا تھا، بظاہر وہ
بددماغ معلوم ہوتے تھے، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ بڑے خوددار تھے اور عزتِ نفس کو تمام باتوں
پر مقدم رکھتے تھے لیکن بے تکلف دوستوں کے مجمع میں ان کی خوش طبعی کے جوہر کھلتے تھے
۱۸۹۹ء کی بڑی تعطیل جولائی میں شروع ہوئی، ایف اے کے امتحان کی تاریخ ۱۲ جنوری ۱۹۰۰ء مقرر
تھی، میں تعطیل میں تو نہیں گیا، امتحان کی تیاری کے لئے علی گڑھ میں ٹھہر گیا، کہ گھر جانے
میں یہ بھی خطرہ تھا کہ والدہ صاحبہ رخصتی کا تقاضا کریں، حیدر حسن، سجاد حیدر اور محمد حیات
تینوں بی۔ اے میں تھے، یہ سب بھی تعطیل میں علی گڑھ ٹھہرے رہے، ہم سب ایک ہی بارک
میں رہتے تھے، کمرے قریب قریب تھے، تعطیل میں گہرے مراسم ہوگئے، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا
سب ساتھ ہوتا تھا، جب مراسم بڑھے تو مجھے ان تینوں کی قدر معلوم ہوئی، سجاد حیدر انگریزی
اور اردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے، انشاپردازی کی سنہری لڑیوں میں موقع
محل سے ہمیشہ لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے، مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا،
حیدر حسن کو ناولوں کا شوق تھا، انگریزی زبان کا اچھا ناول شاید ہی کوئی پڑھنے سے باقی
بچا ہو، سکندرہ کے رہنے والے تھے، جب مجھ سے بے تکلفی ہوگئی تو مذہبی تذکروں میں یہ
شعر سنایا کرتے تھے۔

شیعہ ہمارے شہر میں ایک نام کو نہیں
ہے رافضی سے پاک ہمارا سکندرہ

بڑے آزاد خیال تھے، سچ تو یہ ہے ہم سب اسلامی فرقوں کے باہمی امتیاز کی حدود سے کہیں
آگے نکل گئے تھے، محمد حیات کے مطالعہ میں بیشتر تاریخ، سیر، سفرنامے اور ادبی مذاق کی کتابیں رہتی تھیں
انگریزی خوب لکھتے تھے اور بولتے بھی خوب تھے، موصوف کا سیاسی رجحان اس زمانہ میں کانگریس

کی طرف رہتا، ان پر ہی کیا موقوف ہے، اکثر طلبا جو علمی ذوق یا سیاسی معاملات میں دلچسپی رکھتے تھے کانگریس کی عزت کرتے تھے اور جانتے تھے کہ ملکی پولیٹیکل حقوق کے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کانگریس اور تنہا کانگریس ہے، دسمبر ۱۸۹۹ء لکھنؤ میں مسٹر رومیش چندر دت کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس ہوا تھا تو محمد حیات لکھنؤ جاکر اس میں شریک ہوئے اور ہفتوں تک ہم ان کی زبان سے اجلاس لکھنؤ کے حالات سنتے اور آپس میں پولیٹیکل مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے رہے، میرا ارادہ تعطیل کے زمانہ میں علی گڑھ ٹھہر کر امتحان کی تیاری کرنے کا تھا، مگر یہ چار درویشوں کی انجمن ایسی قائم ہوئی کہ سارا وقت خوش گپی کی نذر ہو گیا، تعطیل ختم ہونے کے ذرا پہلے ایک روز کمرے میں جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کتابوں کی الماری میں جا بجا جالا لگا ہوا ہے، اب مجھے پریشانی ہوئی، امتحان کے صرف دو مہینے رہ گئے تھے، خدا کا نام لے کر تیاری شروع کر دی اور دوستوں سے ملنا جلنا بالکل چھوڑ دیا، میں اخبار پڑھنے کا عادی تھا، اور اسی زمانہ میں جنوبی افریقہ کی لڑائی میں ڈچ قوم کے لوگ جن کو اس زمانہ میں بوئر BOER کہتے تھے بڑی بہادری سے لڑ رہے تھے اور انگریزی فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے، سردار کچنر اور لارڈ رابرٹس کے جنوبی افریقہ جانے کی خبر میں نے اخبار میں نہیں پڑھی بلکہ کئی دوستوں کی زبانی سُنی تھی، اخبار بینی میں نے چھوڑ دی تھی، امتحان سے دو تین ہفتہ پہلے ہم کو تیاری کے لئے وقت دیا گیا اور پڑھائی ختم کر دی گئی، میں روزانہ صبح کے ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر صاحب باغ چلا جاتا تھا اور مغرب کے وقت وہاں سے اپنے کمرہ پر واپس آتا تھا، وقت معینہ پر امتحان ہوا اور میں امتحان سے فارغ ہو کر اپنے وطن کندرکھی چلا گیا۔

میں کندرکھی سوا برس بعد پہونچا تھا، والدہ صاحبہ نے رخصتی کا تقاضا کیا، میں نے کہا کہ امتحان کا نتیجہ آجانے دیجئے، فروری کے تیسرے ہفتہ میں امتحان کا نتیجہ معلوم ہوا، سب سے پہلی اطلاع سجاد حیدر کے خط سے ہوئی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ تم بیس بیسے ایف اے ہو گئے

انگریزی کا فقرہ یہ تھا:

YOU ARE AN F.A. THOUGH AND THOUGH.

مارچ ۱۹۰۰ء کے وسط میں علی گڑھ پہونچ کر میں بی اے میں داخل ہو گیا، میں ایف
اے دوسرے درجہ (سکنڈ ڈویژن) میں پاس ہوا تھا، اس زمانہ میں ایسے طلبار کی تعداد جو
دوسرے درجہ میں ایف. اے پاس کریں بہت کم ہوتی تھی۔ تب مجھے دس روپیہ ماہوار کا وظیفہ بربنائے
قابلیت ملا، ایف، اے میں فارسی بدرجہ مجبوری لی تھی، بی، اے میں تین مضامین کا لینا ضروری
تھا، انگریزی لازمی تھی، اس کے سوا جو دو اور مضمون لے رکھے تھے ان میں ایک اقتصادیات
ECONOMICS تھا اور دوسرا سیاسیات یعنی پولیٹیکل سائنس، دونوں مضمون دلچسپ
تھے، یہ زمانہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے انتہائی عروج کا تھا،

بی اے کے پہلے سال کا بیشتر وقت اردو ناگری کے قضیہ اور بہار اور
بنگال کے دورے کی نذر ہوا، جنوری ۱۹۰۱ء میں کالج کھلنے کے بعد میں نے باقاعدہ درجوں میں
شرکت اور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔

مارچ ۱۹۰۱ء میں کالج میں ایک شورش ہوئی تھی جس کے باعث کالج کی فضا کچھ عرصہ تک
مکدر رہی، نومبر ۱۹۰۱ء میں جب یونین کے انتخاب کا وقت قریب آیا تو سر تھیوڈر ماریسن
نے یہ طے کیا کہ ایک سال کے لیے انتخاب کا حق طلبار سے چھین لیا جائے اور بجائے انتخاب
کے یونین کے عہدہ داروں کا تقرر بحیثیت پرنسپل سر تھیوڈر ماریسن کریں، چنانچہ موصوف
نے محمد ظریف کو جو ادبی مذاق رکھنے کے ساتھ نہایت خاموش طبیعت کے طالب علم تھے
وائس پریسیڈنٹ مقرر کیا، سکریٹری کا نام اس وقت یاد نہیں رہا، کیبنٹ یعنی مجلس وزرار
میں چھ ممبر ہوا کرتے تھے، ان چھ میں سے ایک جگہ پر مجھے وزیر مقرر کر کے موصوف نے میری
عزت افزائی فرمائی، یہ تقرر مجھے اس وجہ سے گراں گذرا کہ اگر انتخاب عمل میں آتا تو یونین کے
ممبر وائس پریسیڈنٹ یا کم از کم سکریٹری کے عہدہ کے لئے مجھے منتخب کرتے، میں اس وقت

بی۔اے کے دوسرے سال کا طالب علم تھا، اور امتحان میں چند ماہ باقی تھے، محمد ظریف صاحب بہت اچھے آدمی تھے مگر مجھ سے ایک درجہ نیچے تھے، ان سب امور کو پیش نظر رکھ کر میں نے کیبنٹ کی ممبری سے اپنا استعفیٰ سر تھیوڈر ماریسن کی خدمت میں بھیجدیا۔ میری یہ ڈھٹائی موصوف کو ناگوار گذری اور دوران گفتگو میں اونچ نیچ سمجھا کر انہوں نے چاہا کہ میں اپنا استعفیٰ واپس لے لوں، مگر میں اپنی رائے پر قائم رہا اور استعفیٰ میں نے واپس نہیں لیا۔ بی۔اے کا امتحان ۱۹۰۳ء میں ہونے والا تھا اور اب تک میں نے سرگرمی کے ساتھ امتحان کی تیاری شروع نہیں کی تھی، یونین کے قضیہ سے نجات پاکر میں نے امتحان کی تیاری شروع کر دی، بی۔اے کا امتحان اس زمانہ میں الٰہ آباد میں ہوا کرتا تھا، مگر الٰہ آباد میں طاعون کا زور شور ہونے کی وجہ سے یہ طے پایا کہ علی گڑھ کے طلباء امتحان میں بمقام لکھنؤ شرکت کریں، شیخ شوکت علی مرحوم میرے ہم جماعت اور دوست تھے یہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے انہوں نے ہم سب کے قیام کا انتظام قیصر باغ میں کیا۔ اور محمد ادریس مرحوم، نصیر الدین حیدر، عبدالوہاب اور میں علی گڑھ سے روانہ ہو کر لکھنؤ پہنچے اور امتحان میں شریک ہوئے، امتحان کیننگ کالج میں ہوا، اس زمانہ میں کالج جس عمارت میں تھا وہ قیصر باغ میں بارہ دری سے جانب شمال بنی ہوئی تھی۔

دوران سفر کا ایک قصہ یاد آیا جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم چار یا پانچ طلباء کا گروہ علی گڑھ سے لکھنؤ جا رہا تھا امتحان دینے کے لئے، صبح کو کانپور اسٹیشن پر اترے جہاں لکھنؤ جانے کے لئے ٹرین بدلی جاتی ہے کتابوں کے علاوہ باورچی خانہ کا سامان اور برتن وغیرہ بھی ہمارے ساتھ تھے، ٹکٹ کلکٹر نے ہم کو ٹوکا اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ ہم نے سامان کا محصول ادا نہیں کیا ہے تو اس نے سامان تلوایا، معلوم ہوا کہ جتنا سامان ہم بغیر محصول ادا کئے لے جا سکتے تھے اس سے زیادہ سامان ہمارے ساتھ تھا اس دور سے نیز سفر اور قیام کا کل انتظام میرے سپرد تھا، ٹکٹ کلکٹر مجھ کو ایک بنگالی بابو کے پاس لے گیا اور اس کو بتایا کہ ہمارے پاس کتنا سامان زیادہ ہے، بنگالی بابو نے مجھ سے محصول مانگا اور میں نے وہ رقم ادا کر دی۔ غالباً

تین یا چار روپے دیئے تھے، اس نے رسید لکھ کر بے تکلف میرے حوالہ کردی، میں نے رسید دیکھی، تو معلوم ہوا کہ جتنا سامان زیادہ تھا ٹھیک نصف بنگالی بابو نے رسید میں درج کیا تھا اور اسی طرح جو رقم میں نے ادا کی تھی وہ بھی ٹھیک آدھی رسید میں لکھی تھی میں نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جو رقم مجھ سے وصول کی ہے وہ پوری رسید میں نہیں لکھی بلکہ صرف آدھی رقم رسید میں درج کی ہے، بنگالی بابو کا حلیہ مجھے آج تک یاد ہے عینک لگائے ہوئے تھے خوب بڑی داڑھی تھی، داڑھی کے بال کالے تھے، مگر کہیں کہیں سفیدی آگئی تھی، اس دیانت کے پتلے نے غور سے میری طرف دیکھ کر کہا، آپ اطمینان رکھیئے اب آپ کو کوئی پریشان نہ کرے گا اگر کوئی پوچھے یہ رسید دکھا دیجیئے، وہ فوراً سمجھ لے گا کہ سامان کا محصول ادا کردیا ہے اور دوبارہ سامان "تلوانے کی ضرورت نہ پڑے گی جی تو چاہتا تھا کہ فوراً اسٹیشن ماسٹر صاحب کے پاس جاکر اس بگلہ بھگت بنگالی کی پول کھولوں، مگر ریل کے وقت میں گنجائش کم تھی، میں نے سوچا کہ اگر اس جھگڑے میں دیر ہوگئی اور لکھنؤ والی ریل نکل گئی تو شیخ چلی روغن کے پیچھے اصل سود سے ہاتھ دھونا پڑے گا اس لیے بدرجہ مجبوری خاموشی اختیار کی۔

بی۔ اے کے امتحان سے فارغ ہو کر علی گڑھ آیا اور پھر کندرکھی چلا گیا۔ آخر جون ۱۹۰۲ء میں نتیجہ آیا جس سے مجھے دوسرے درجہ میں اپنے بی۔ اے پاس ہونے کا حال معلوم ہوا اور جولائی کے شروع میں کالج بند ہونے سے پہلے علی گڑھ پہونچ گیا، میں نے ایل ایل بی اور ایم۔ اے دونوں درجوں میں اپنا نام لکھایا، قانون کے پروفیسر پہلے مولوی سید کرامت حسین تھے۔ جو جنوری ۱۹۰۸ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے، پروفیسری سے مولوی صاحب کے استعفیٰ دینے پر ان کی جگہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کا تقرر شروع ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا، ایم۔ اے کی تعلیم کا کالج میں خاطر خواہ انتظام نہ تھا، فارسی میں آسانی سے ایم۔ اے کر لینا ممکن تھا، مگر یہ سستی ڈگری حاصل کرنے پر میری طبیعت مائل نہ ہوئی، میں نے

اقتصادیات سے ایم۔اے کی ڈگری لینا چاہی، مضمون اقتصادیات کے سب سے بڑے ماہر اس زمانہ میں ہمارے صوبہ میں سرتھیوڈر مارسین سمجھے جاتے تھے مگر موصوف کی مصروفیات اس قدر زیادہ تھیں کہ وہ ایک طالبعلم کی خاطر گھنٹہ یا دو گھنٹہ پڑھانے کا وقت نہ نکال سکتے تھے اس لیے یہ طے پایا کہ مسٹر ٹول (TOWLE) جو سال ڈیڑھ سال پہلے ولایت سے علی گڑھ پروفیسر ہو کر آئے تھے، مجھے ہفتہ میں چار دن پڑھایا کریں وظیفہ بربنائے قابلیت دینے کے بارے میں جو برتاؤ سرتھیوڈر مارسین نے میرے ساتھ کیا، اس کا احسان مندی کے ساتھ تذکرہ کرنا میرا فرض ہے، موصوف نے چالیس روپے ماہوار کا اسکالر شپ مجھے عنایت فرمایا تھا، یہ بات یاد رہے کہ سرتھیوڈر مارسین۔ سے یونین کی کیبنٹ سے استعفےٰ دے کر جو اختلافات میں نے پیدا کر لیا تھا، اُسے ابھی پورا سال بھر نہیں ہوا تھا سیاسی جذبہ کے ماتحت انگریز اس ملک میں کچھ بھی کریں مگر مجھے یہ کہنے میں ہرگز تامل نہیں ہے، کہ جو مسائل سیاسی پہلو سے خالی ہوں ان میں انگریزوں کا شعار اور طریق کار عام طور پر انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔

نومبر ۱۹۰۲ء میں یونین کے انتخاب کا وقت آیا، یونین کا اس وقت نام سڈنس یونین تھا اور یہ نام مسٹر سڈنس کی یادگار میں رکھا گیا تھا، مسٹر سڈنس علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے، قواعد کی رو سے یونین کا پریذیڈنٹ کالج کا پرنسپل ہوتا تھا، سب سے بڑا انتخابی عہدہ یونین کی وائس پریذیڈنسی تھی، اس کے بعد سکریٹری کی جگہ، ان دونوں عہدوں پر ہر سال بذریعہ انتخاب تقرر عمل میں آتا تھا، انتخاب کے وقت پرنسپل یا سینئر پروفیسر موجود رہتے تھے، اور انتخاب ان کی زیر نگرانی ہوتا تھا، انتخاب دو برس کے بعد ہو رہا تھا، جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہو چکا ہے، سنہ ۱۹۰۱ء میں ہڑتال کی فضا کے رد ہونے کے باعث انتخاب کے حق سے طلبا ایک سال کے لیے محروم کر دیئے گئے تھے نومبر ۱۹۰۲ء کو انتخاب ہوا اور یونین کے ممبروں نے زبردست کثرت رائے سے مجھے وائس پریذیڈنٹ

منتخب کیا۔ مجھے وائس پریزیڈنٹ مقرر ہونے سے خوشی ہوئی جس کی ایک وجہ یہ بھی کہ سر تھیوڈر ماریسن کو معلوم ہو گیا کہ میرے زمانہ کے طلبار اور ساتھی میری بابت کیا رائے رکھتے ہیں اور مجھے کیسا سمجھتے ہیں، انجمن الفرض اس زمانہ کی ایک بڑی اہم اور مفید انجمن تھی، یہ انجمن اس زمانہ میں قائم ہوئی تھی جب مسٹر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج کے پروفیسر تھے تحریک علی گڑھ سے حقیقی دلچسپی ہونے کے علاوہ موصوف اردو کی مشہور کہاوت جیسا دیس ویسا بھیس پر عمل کرنے تھے۔ کالج کے جلسوں میں بعض اوقات عبا و قبا پہن کر شریک ہوتے تھے اور ان کی اس ادا نے طلبار کو گرویدہ کر لیا تھا، میں ڈیڑھ سال پہلے انجمن الفرض کا خادم یعنی ممبر مقرر ہو چکا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۲ء کے آخری ہفتہ میں دربار ہونے والا تھا اور انجمن الفرض نے یہ طے کیا تھا کہ دہلی میں انجمن مذکور کی سرگرمیوں اور دوکان کا انتظام دربار کے موقع پر میرے سپرد کیا جائے اور میں جن خدام الفرض کو اپنا شریک بنانا چاہتا ہوں ان سے مدد لوں۔

۱۸۹۸ء میں میرے علی گڑھ میں داخل ہونے کے قبل تصنیف و تالیف کا شوق مولوی شبلیؒ صاحب سے علی گڑھ چھڑا چکا تھا مسٹر آرنلڈ علی گڑھ سے لاہور جا چکے تھے۔ فارسی ہم کو مولوی عباس حسین صاحب پڑھاتے تھے، موصوف کی خوشنما صورت بلا کی ظرافت کی حامل تھی، ضلع جگت کے بڑے شائق تھے، درس شروع ہونے اور ختم ہونے کے وقت میں درس کے بعد شاگردوں سے ہمیشہ ضلع بولتے اور دوران درس میں بھی اگر موقع ہاتھ آجاتا تو ضلع بولنے سے نہ چوکتے تھے، رعایت لفظی اسی طرح کی ہوتی تھی جس کی نوعیت ذیل کے شعر سے معلوم ہوگی۔

کدو کی دوستی ایک دم میں توڑ دی   کریلے بے گنوں کو کیا کر سیلے

مولوی صاحب شیعوں کے پیش نماز بھی تھے اور شیعہ لڑکے ان کی امامت میں اکثر نماز پڑھتے تھے جمعہ کی نماز ہمیشہ شہر میں پڑھاتے تھے اُن کا خیال تھا کہ ایک مسجد میں دو جمعے نہیں

ہو سکتے، قاری بہت اچھے تھے، ان کے والد مولوی جعفر علی صاحب اپنے زمانہ کے بڑے مشہور قاری تھے۔

مولوی عباس حسین کی حاضر جوابی کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے، امیر حبیب اللہ خاں مرحوم شاہ افغانستان ۱۶ جنوری ۱۹۰۷ء کو کالج کے معائنہ کے لئے تشریف لائے، مخالفوں نے طلبا۔ کالج کی لامذہبی کی داستانیں سنا کر شاہ مرحوم کے کان بھر رکھے تھے، اعلیٰ حضرت طلبا کا امتحان خود لینا اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ دینیات کی تعلیم کا کیا حال ہے، سب سے پہلے شیعہ طلبا کی ایک جماعت مولوی عباس حسین کی قیادت میں پیش ہوئی، اعلیٰ حضرت نے ایک طالب علم سے دریافت فرمایا، اسلام کے بنیادی اصول بیان کرو، اس نے جواب دیا، اول توحید، دوسرے عدل، تیسرے نبوت، چوتھے امامت، پانچویں معاد، جواب سن کر جب اعلیٰ حضرت کو تعجب ہوا تو محسن الملک نے بتایا یہ جماعت شیعہ طلبا کی ہے، فرماں روائے افغانستان نے فرمایا، سنی طلبا کو پیش کرو، مولوی عباس حسین کو اس ارشاد سے موقع مل گیا، یہ ادب گذارش کی خدا نے اعلیٰ حضرت کو بادشاہ بنایا ہے، ظل اللہ کے نزدیک شیعہ سنی دونوں یکساں ہیں مولانا کی حاضر جوابی قابلِ داد تھی، مگر کابل کی بے آب و گیاہ و بے آب پہاڑیوں کے بسنے والے نے جو جواب دیا وہ حقیقتاً موتیوں میں تولنے کے قابل ہے، فرمایا، آخوند مجھے شیعہ سنی بلکہ ساری رعایا یکساں عزیز ہے مگر بات یہ ہے کہ امتحان اس وقت ہی قابلِ اطمینان ہو سکتا ہے جب امتحان لینے والے کی واقفیت امتحان دینے والے سے زیادہ ہو۔" اعلیٰ حضرت کا لاجواب سن کر مولانا خوش ہو گئے اس کے بعد سنی طلبا کی باری آئی، اعلیٰ حضرت نے با اطمینان دینیات کا امتحان لیا، پھر ایک طالب علم کو اپنے قریب بلا کر کہا، قرآن مجید میں سے کچھ یاد ہو تو پڑھ کر سناؤ، جس کا کلام پڑھ کر سنانے کی فرمائش کی تھی اس کے کارخانے دیکھیے وہ طالب علم خوش الحان قاری نکلا، اس نے مصری لہجہ میں سورہ آل عمران کا ایک رکوع پڑھ کر سنانا شروع کیا، اعلیٰ حضرت پر رقت طاری ہو گئی، اور یہ کیفیت ہوئی کہ رکوع ختم ہونے

تک داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، پھر اعلیٰ حضرت اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے، بار بار جوش سے فرماتے تھے " بدگو جو کچھ کہتے ہیں جھوٹ ہے، غلط ہے، افترا ہے، بہتان ہے اب علی گڑھ کی طرف سے مفتریوں کی زبان بند کرنے کے لیے سب سے پہلے میں موجود ہوں۔"

مولوی خلیل احمد صاحب عربی پڑھاتے تھے، سنبھل ضلع مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ بڑے فاضل اجل تھے تاریخی اور علمی معلومات کا ذخیرہ اس قدر وسیع تھا کہ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے بغداد کی گلیوں میں گھوم کر ابھی واپس آئے عروج کے زمانہ میں خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں جو ممالک شامل تھے ان کے جغرافیہ کے ماہر تھے مگر کند ذہن تھے، نہ خوش بیانی تھی نہ کلام میں روانی، پرانی کتابوں کے عاشق تھے، بعض اوقات ان کے [illegible] کتابوں پر شوربے کے دھبے بھی پڑ جاتے تھے، زمانہ کی بدمذاقی اسے بے احتیاطی اور پھوہڑ پن پر محمول کرے، مجھے اس میں بھی ان کی سچی محبت کی جھلک نظر آتی ہے خود کھاتے تھے تو کتابوں کو کیسے بچا کر رکھتے، صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ازل میں تقسیمِ حسن کے وقت حاضر نہ تھے بلکہ اس وقت علم و فضل میں اپنے حصے کی تلاش میں مشغول تھے۔

مولوی عبداللہ صاحب سنی دینیات کے ڈین تھے، مگر سنی شیعہ سب ان کے درس میں شریک ہوتے تھے، بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ لڑکوں کے دلوں میں جو شبہات دینیات کے درس کے وقت پیدا ہوتے تھے ان کو معلوم کرنے کا مولوی صاحب کو کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آتا تھا، شبہات رفع کرنا تو بڑی چیز ہے اگر کوئی لڑکا کوئی سوال کرتا تو اس اختصار کے ساتھ اس کا جواب دے کر جیسا چاہیے [illegible] گویا ہر طرح سے سوال کو ٹالتا ہے اپنے بیان کا سلسلہ جاری رکھتے، یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ مولوی صاحب قصداً گریز کرتے تھے ان کے نزدیک جو کچھ جواب میں ارشاد فرماتے تھے وہ سائل کی تشفی کے لیے بالکل کافی تھا اگرچہ کبھی سائل کو شک باقی

رہ جائے تو اس کا ذمہ دار خود تھا۔ اصل یہ ہے کہ دینیات کی تعلیم اس زمانہ میں ان علمار سے دلوانا جن کو طلبار کے شکوک و شبہات کا کچھ اندازہ نہیں ہے، اسلام میں چرچ (CHURCH) قائم کرنے کی بنیاد ڈالنا ہے۔

پروفیسر جادب چندر چکرورتی ریاضی پڑھاتے تھے، شاگرد محبت اور عقیدت سے ان کو بابو صاحب کہتے تھے، بابو صاحب نے ایسا مزاج پایا تھا جیسے سوئٹزرلینڈ کے شہر جنوا کی مشہور جھیل جس میں سوائے طوفان کے کوئی چیز تموّج پیدا نہیں کر سکتی ایف اے کی پہلی جماعت کے طلبار کے ساتھ (جن کو مسٹر ماریسن پہلے سال اول کے وحشی کہا کرتے تھے) ایسا شریفانہ برتاؤ کرتے تھے گویا ہم میں سے ہر طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد علمی تحقیق و تفتیش کے منازل طے کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ضیار الدین صاحب ایف۔ اے کے طلبار کو منطق پڑھاتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کوئی طالب علم منطق میں کمزور نہ رہ جائے، ریاضی پڑھانے میں بھی یہ گر پیش نظر رکھتے تھے جو مضمون وہ پڑھاتے تھے اس کے نتیجے ہمیشہ بہت اچھے رہتے تھے، ایف۔ اے میں میری ریاضی پر جو توجہ ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اس کے لیے ہمیشہ ان کا احسان مند رہوں گا۔ سب سے جونیر پروفیسر زماں مہدی خاں صاحب تھے جو تاریخ پڑھاتے تھے، ڈاکٹر ضیار الدین کے انگلستان جانے کے بعد منطق کی تعلیم کا کام بھی زماں مہدی خاں صاحب کے سپرد کر دیا گیا تھا، مسٹر ٹیننگ انگریزی کے پروفیسر تھے، مسٹر ٹول، مسٹر کارڈز بروان اور مسٹر کارنا ۱۹۰۱ء میں پروفیسر ہو کر انگلستان سے آئے تھے، مسٹر کارنا اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے، بقیہ دو صاحبوں نے پروفیسر کی خدمات انجام دیں۔

۱۹۰۲ء میں زیادہ تنخواہ کی جگہ ملنے پر مسٹر ٹیننگ علی گڑھ چھوڑ کر چلے گئے، اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ ۱۸۹۹ء میں جب مسٹر بیک کا انتقال ہوا ہے تو مسٹر ماریسن پروفیسری سے استعفیٰ دے چکے تھے، بیک صاحب کے انتقال کے بعد ماریسن صاحب کو پرنسپلی کا عہدہ پیش کیا گیا جسے انہوں نے منظور کر لیا، ان دونوں صاحبوں میں اختلاف کی وجہ

یہ تھی کہ سرسید رح کے انتقال کے بعد بیک صاحب کالج کے تمام انتظامی معاملات پر قابض ہو گئے تھے۔ مارلیسن صاحب کو اس پالیسی سے اتفاق نہ تھا وہ چاہتے تھے کہ ان معاملات میں جو قانوناً سکریٹری اور [illegible] کے اختیار میں ہیں پرنسپل کی طرف سے مداخلت نہ کی جائے۔

گرچہ یاراں فارغند از یاد ما

از من ایشاں را ہزاراں یاد باد

ملنساری رواداری جو ہم نے اپنے زمانہ میں علی گڑھ میں پائی اس کی مثال نہ علی گڑھ جانے سے پہلے کہیں دیکھی تھی، نہ علی گڑھ چھوڑنے کے بعد آج تک کہیں نظر آئی۔

یونیورسٹی کا زمانہ طالب علمی کا وہ زمانہ ہے جب دماغ کی نشوونما سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ سر تھیوڈر مارلیسن اپنے تجربہ کی بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ طالب علم کے دماغ کے اٹھان کا تناسب یہ ہے کہ اگر ایف۔ اے کے دو سال میں ڈیڑھ فٹ کی بلندی پر پہونچتا ہے تو بی اے کے دو سال کی بلندی ساڑھے تین فٹ اور چار فٹ کے درمیان ہوتی ہے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد یہ تناسب پھر نیچے ڈھلتا ہے اور ایم۔ اے کے دو سال کی اونچائی ایک سے لے کر ڈیڑھ فٹ تک ہوتی ہے زیادہ نہیں ہوتی۔

علی گڑھ میں مختلف فرقوں کے طلبا کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے۔ سنی، شیعہ [illegible] کا [illegible] کوئی امتیاز نہ تھا، مولوی طفیل احمد صاحب اس وقت ہماری برادری کے بزرگوں میں [illegible] ۱۸۸۸ء میں پڑھنے کے لیے علی گڑھ گئے تھے اور ۱۸۹۳ء تک کالج میں تعلیم حاصل کی۔ مولوی صاحب سے چار پانچ برس پہلے ان کے بڑے بھائی سید [illegible] پڑھنے کے لیے آچکے تھے، مولوی صاحب نے علی گڑھ پہونچ کر بڑے [illegible] گفتگو میں شیعوں کے لیے رافضی کے لفظ کا استعمال کیا، احمد حسین صاحب نے [illegible] میں چھوڑ دو، یہ علی گڑھ ہے، یہاں شیعوں کو شیعہ کہتے ہیں، احمدی فرقہ

نیا فرقہ تھا جس کے بارے میں ہم طالبعلموں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے بانی مرزا غلام احمد صاحب قادیانی آریوں کے مقابلہ میں ناموس اسلام قائم رکھنے میں مشغول و مصروف ہیں، احمدی طالبعلم میرے زمانہ میں کوئی نہ تھا، اگر ہوتا تو غالباً اس کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کیا جاتا جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ کرتے تھے، ہم آپس میں تذکرے بھی آزادی سے کرتے تھے کہ شیعوں کے بارے میں سنی کیا رائے رکھتے ہیں اور شیعہ سنیوں کو کیا سمجھتے ہیں، رافضی اور خارجی لقب تو اتنے پرانے ہو گئے تھے کہ مصداق شعر

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

ان میں جدت رہی تھی نہ لذت، کچھ دن پہلے غالباً مراد آباد میں میں نے یہ سنا تھا کہ سنی شیعوں کو کھٹمل اور شیعہ سنیوں کو پسو کہتے ہیں، میں نے دوستوں اور ساتھیوں کو اس اہم انکشاف سے خبردار کیا اور دونوں خطابوں کو ہماری سوسائٹی میں بہت مقبولیت ہوئی۔

محمد ادریس صاحب میرے بڑے عزیز دوست تھے، علی گڑھ میں شروع سے آخر تک میرا اور محمد ادریس مرحوم اور نصیر الدین حیدر کا ساتھ رہا، عبدالوہاب صاحب کالج میں اچھے خاصے بھلے آدمی تھے، کالج چھوڑنے کے بعد اے ڈبلیو زبیری ہو گئے) امتیاز علی صاحب، انتظار علی صاحب، محمد سبطین صاحب، محمود حسن خاں صاحب، برکت علی صاحب بھی اول سے آخر تک ہمارے ہم جماعت رہے، محمد ادریس بہت شگفتہ مزاج آدمی تھے، ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد وکالت شروع کئے ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ ۱۹۰۷ء میں پیغام اجل آپہونچا خدا غریق رحمت کرے. نصیر الدین حیدر کے والد خان بہادر سید جلال الدین حیدر صاحب بنارس کے کوتوال تھے، سجاد حیدر صاحب یلدرم نصیر الدین کے بھائی ہیں اور اردو کے نامور انشاپرداز ہیں، ان دنوں ترکی کے والد رشید اسے تھے، ترکی زبان سے بھی کچھ واقفیت حاصل کر لی تھی، چند سال نواب راجہ صاحب محمود آباد کے سکریٹری رہے، ڈپٹی کلکٹری سے پنشن

بیٹے کے بعد اب موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے سکریٹری ہیں، نصیر الدین خاں بہادر سید علی جان صاحب کی کوتوالی بنارس کے قصے سنایا کرتے تھے وہ بڑے نام ور کوتوال تھے، پچھلی دفعہ ۱۹۶۰ء میں بنارس جانے کا اتفاق ہوا، اس وقت تک سید علی جان کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے، چھوٹے طبقہ کی عورتیں ان کے گیت بھی گاتی تھیں، کئی سال بعد مجھے جونپور میں موصوف سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، نصیر الدین کا انٹرنس کے امتحان میں سارے صوبہ میں دوسرا نمبر تھا، مگر علی گڑھ کے ماحول میں پڑھنے والوں کی قدر نہ تھی، نصیر الدین پر اس کا یہ اثر ہوا، کہ پڑھنے لکھنے میں ڈھیل دی اور پھر کسی امتحان میں کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا۔

انتظار علی بنارس میں آبکاری کے انسپکٹر تھے، اب پنشن لے لی ہوگی، محمد سبطین چوبیس گھنٹے میں سے بارہ چودہ گھنٹے پڑھنے والے طالب علموں میں تھے، فارسی کی دستگاہ اچھی تھی، شعر بھی کہتے تھے، عرصہ دراز سے پرتاب گڑھ میں وکالت کرتے تھے، محمود حسن خاں پڑھنے لکھنے میں محمد سبطین کے حریف تھے، شام کو بلاناغہ فٹ بال بھی کھیلتے تھے، بھوپال میں کئی دفعہ ملاقات ہوئی، ریاست میں خاصا بڑا عہدہ تھا۔

برکت علی پنجابی تھے، دراز قامت، دبلے پتلے، پکا گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، فٹ بال بھی کھیلتے تھے، اور پڑھنے میں دھیان تھا، ایک روز محمد ادریس مرحوم کو شرارت سوجھی، برکت علی صاحب سے کہنے لگے کیوں بھائی برکت علی پنجابی میں پیڑو کو کیا کہتے ہیں، برکت علی اردو بولتے تھے، مگر میرا خیال ہے ان کی مادری زبان پنجابی تھی، پوچھنے لگے جی کیا کہا، ادریس نے کہا پیڑو کو پنجابی میں کیا کہتے ہیں، منٹ بھر تک برکت علی کچھ سوچتے رہے، پھر بڑے بھولے پن سے جواب دیا "جی ہمارے پنجاب میں نہیں ہوتا" پھر سب ہنسنے لگے، غریب برکت علی کو آخر تک پتہ نہ چلا کہ ادریس مذاق کر رہے ہیں، پیڑو کے لفظ سے برکت علی صاحب ناواقف معلوم ہوتے تھے۔

شاکر علی صاحب بیرسٹر ہیں اور گورکھپور میں بیرسٹری کرتے ہیں، وہ مجھ سے اور ادریس صاحب سے

مرحوم سے ایک درجہ اوپر تھے، ادریس کے بڑے بھائی محمد ابراہیم صاحب سجاد حیدر کے دوست تھے، جب ادریس علی گڑھ آئے ہیں تو محمد ابراہیم کالج چھوڑ چکے تھے، مگر بھائی کا دوست ہونے کے تعلق سے جب ادریس علی گڑھ کالج میں داخل ہونے کے لیے آئے تو سجاد حیدر کے پاس ٹھہرے، ایک قصہ سناؤں جس سے معلوم ہوگا کہ اس دور کے علی گڑھ کا کیا رنگ تھا۔

۱۸۹۵ء کی بات ہے، ادریس ابھی ابھی علی گڑھ پہونچے ہیں، سجاد حیدر کے کمرے میں بیٹھے ہیں، کچھ اور طالب علم بھی وہاں موجود ہیں جن میں شاکر علی بھی ہیں، شاکر بڑے منہ پھٹ تھے، ادریس سے پوچھا، آپ کا نام، ادریس نے جواب دیا محمد ادریس، کوئی دو منٹ تک شاکر خاموش رہے، اس کے بعد ایک چپت غریب ادریس کو رسید کیا، ادریس نے کوئی آدھا منٹ غور کیا کہ اس تواضع کا جواب زبان سے دوں یا ہاتھ سے، پھر سوچتے کہ اگر تشدد کا جواب تشدد سے دیا تو شاکر کا تو کچھ نہ بگڑے گا ان سے یہاں سب لوگ واقف ہیں بدنامی میری ہوگی کہ آتے ہی ہاتھا پائی شروع کر دی، زہر کے گھونٹ پی کر ادریس نے بگڑ کر کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے، مجھ سے آپ سے تو بے تکلفی نہیں ہے، ابھی ابھی پہلی ملاقات ہوئی ہے" شاکر نے مسکرا کر کہا "میں کب کہتا ہوں کہ میری تمہاری بے تکلفی ہے، اسی لیے تو میں نے یہ حرکت کی اب بے تکلفی ہوجائے گی" شاکر کا خیال صحیح نکلا اس دن سے دونوں بے تکلف دوست ہو گئے۔

ہم سب کچی بارک میں رہتے تھے اب اس کی جگہ عالیشان عمارت کھڑی ہے جسے عثمانیہ ہوسٹل کہتے ہیں، کرکٹ کپتان علی حسن صاحب اور فٹ بال کے کپتان عبدالمجید خاں صاحب تھے، دونوں کو علی گڑھ سے بڑی محبت تھی، کرکٹ اور فٹ بال کی کپتانی اس زمانہ میں بڑی چیز تھی، ہر موقعہ پر دونوں پیش پیش رہتے تھے۔ پھر بھلا علی گڑھ چھوڑنے کی کیا جلدی تھی دونوں میں اپنی اپنی جگہ بڑی خوبیاں تھیں، علی حسن افیون کے صاحب ہو گئے تھے، متھرا کے سید رضا علی اور مسٹر شوکت علی رامپورا تا ہنوز سترہ اٹھارہ برس بعد ملا بھی افیون کے صاحب یعنی سب ڈپٹی اوپیم ایجنٹ تھے۔ پھر علی حسن پولیس میں چلے گئے، کپتان پولیس کے عہدہ سے پنشن لی۔

عبدالمجید خاں صاحب سے دو برس ہوئے مشہد میں ملاقات ہوئی، ماشاءاللہ ان پر ساٹھا سو پاٹھا کی مثل صادق آتی ہے، ۲۵ سال کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی مگر انھوں نے مجھ کو اور میں نے ان کو بلاتکلف پہچان لیا، کچھ دیر خوب لطف سے گذری، عرصہ دراز تک زراعتی بنکوں کے جن کو زمینداری بینک بھی کہتے ہیں ذمہ دار افسر پنجاب اور ریاست حیدرآباد میں رہے اور قابلِ قدر خدمات انجام دیں اب بڑے پیمانہ پر ریاست بہاول پور میں کھیتی کرتی ہے زمین کا ایک بہت بڑا قطعہ مل گیا ہے، اس کے تردد کے سوا اور کوئی فکر نہیں ہے۔

ظفر عمر صاحب نئی بارک میں رہتے تھے فٹ بال خوب کھیلتے تھے، عبدالمجید خاں کے علی گڑھ چھوڑنے پر فٹ بال ٹیم کے کپتان ہوئے، سر سید میموریل فنڈ کی امداد کے لئے ایک فنڈ حکام کالج کی اجازت سے انہوں نے قائم کیا، کچھ دنوں ریاست بھوپال میں ملازمت کی، پھر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوئے بڑے چوکنے افسر تھے، بدقسمتی سے ۱۹۱۶ء میں شکار میں حادثہ پیش آیا جان تو خیر رہی مگر عمل جراحی کے بعد مولانا شبلی رہ کی برادری میں داخل ہو گئے، کپتان پولیس کے عہدہ سے پنشن لی اب علی گڑھ میں قیام ہے، حالت دن یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کی فکر میں سرگرم رہتے ہیں، سرگذشت کی ایڈیٹری میں مرزا ابراہیم بیگ مرحوم کے جانشین ہیں، ظفر عمر صاحب کے رخصت ہونے کے پہلے ایک قصہ بھی سن لیجئے، ظفر عمر جب پیدا ہوئے تو ظفر علی نام رکھا گیا ان کے والد کے کوئی شیعہ دوست ملنے آئے اثنار گفتگو میں دوست نے بچہ کا نام دریافت کیا، نام معلوم ہونے پر کہنے لگے کہ یہ عجیب لطف ہے کہ سنی بھی نام اہلِ بیت ہی کے نام پر رکھتے ہیں، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بات ازراہِ طنز کہی تھی یا بطور خوش طبعی ظفر کے والد نے بگڑ کر کہا کہ اگر یہ بات ہے تو آج سے میرے لڑکے کا نام ظفر عمر ہے، چنانچہ یہی نام قرار پایا۔

بدایوں کے اعزاز عالم صاحب بھی میرے ہم جماعت تھے، خاموش آدمی تھے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گذارتے تھے محرم کی مجالس بالائے قلعہ ایک وکیل صاحب کے مکان

پر ہوا کرتی تھی، ایک مرتبہ ہم پانچ چھے طالب علم مجلس کی شرکت کے لیے گئے، جگہ بھر چکی تھی، اتنی گنجائش نہ تھی کہ سب ایک جگہ بیٹھتے جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا، اعزاز عالم نے اعلیٰ درجہ کے ایک ممبر کے سامنے جگہ تاکی اور ایک صاحب کے ٹھیک آگے اطمینان سے جا کر بیٹھ گئے، وہ صاحب خوش مزاج معلوم ہوتے تھے، دریافت کرنے لگے کہ صاحب کا دولت خانہ کہاں ہے، اعزاز عالم نے پیچھے پھر کر جواب دیا بدایوں، یہ سن کر ان صاحب نے اس طرح سر ہلایا گویا وہ اس بات کے متوقع تھے اور طنز آمیز لہجہ میں کہا، بجا ارشاد ہوا، کیوں نہ ہو، یہ تو آج سے چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے، کالج چھوڑنے کے بعد انہوں نے محکمہ سررشتہ تعلیم میں ملازمت کی اور چند سال ہوئے ہیڈ ماسٹری سے پنشن لی، ان کے بڑے بھائی اکرام عالم صاحب ہم سے ایک درجہ اوپر تھے اس زمانہ میں خشخاشی داڑھی رکھتے تھے جو بفضلہ اس وقت تک موجود ہے، دنیا کی رفتار میں فرق آیا ہو مگر ان کی ڈاڑھی آج بھی ویسی ہی کالی ہے جیسے کالا بھونرا، اکرام عالم پہلے بدایوں کے کامیاب وکیل تھے، آٹھ دس سال سے بریلی میں وکالت کرتے ہیں، دونوں بھائیوں نے اپنے لڑکوں کو اچھی تعلیم دی ہے، خاں بہادر مقصود علی خاں صاحب اور زماں مہدی خاں صاحب ہم سے تین درجہ اوپر تھے، تینوں نے ۱۸۹۹ء میں بی۔ اے پاس کیا، مقصود علی خاں ڈپٹی کلکٹری کے امتحان مقابلہ میں جو سر انٹانی میکڈانل لفٹیننٹ گورنر نے قائم کیا تھا بیٹھنے والے تھے مگر کم عمری کے باعث گورنمنٹ نے اجازت نہ دی، دوسرے سال بیٹھے اور پہلا نمبر آیا، ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے، چند سال ہوئے کلکٹری سے پنشن لی،

نعمت اللہ نے علی گڑھ، فیض آباد اور لکھنؤ میں وکالت کی، پھر الٰہ آباد ہائی کورٹ کی ججی پر تقرر ہوا، اپنے زمانہ کے قابل ترین ججوں میں سے تھے، صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کے ممبر ہوئے اور بڑی بے لاگ رپورٹ لکھ کر پیش کی، تعجب ہے کہ موصوف کو نائٹ کا خطاب نہ ملا، جو عام طور پر چیف جسٹس کے سوا ایک یا دو اور تجربہ کار ججوں کو بھی گورنمنٹ دیتی ہے، خطابوں کی وقعت کم اور بہت کم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بسا اوقات گورنمنٹ کی بارگاہ سے

غیر مستحقوں کو خطابات عطا ہوئے اور مستحق ان سے محروم رکھے جاتے ہیں، کلکتہ ہائی کورٹ میں ججی کے زمانہ میں سید امیر علی مرحوم کے ساتھ بھی یہی طریقہ برتا گیا تھا جب سے ہائی کورٹ کی ججی سے پنشن لی ہے نعمت اللہ لکھنؤ چیف کورٹ میں وکالت فرماتے ہیں، ریاست کشمیر کی پریوی کونسل کی ممبری کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

زماں مہدی خاں نے اپنے وطن پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں کامیابی حاصل کی، نیک نام اور زوردار افسر تھے، ڈپٹی کمشنر ہو گئے تھے، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا ۱۹۳۱ء کا سالانہ اجلاس روہتک میں آپ ہی کی مساعی جمیلہ کے باعث منعقد ہوا تھا میری ان کی آخری ملاقات لاہور میں ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت ان کا قصد پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہونے کا تھا۔ علی گڑھ کے بڑے فدائی تھے خدا غریقِ رحمت کرے۔

محمد فائق صاحب مرحوم اور سید ابو محمد صاحب (خاں بہادر) مجھ سے ایک سال بعد کالج میں آئے تھے، محمد فائق بڑے نیل جول کے آدمی تھے خاں بہادر مولوی مقبول عالم صاحب وکیل بنارس کے عزیز تھے کالج میں ہردلعزیز رہے، یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے، وکالت کا امتحان پاس کر کے چند سال تک فیض آباد میں وکالت کی، قومی کاموں سے ہمیشہ لگاؤ رہتا تھا مگر موت اچھے بُرے کا امتیاز نہیں کرتی، جوانی میں چل بسے خدا اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے غالباً ابو محمد کی ڈاڑھی کے باعث ان کے ادبی ذوق کا صحیح اندازہ کرنے میں دیر لگی، انگریزی ادب اور فارسی ادب دونوں میں اس وقت بھی مذاقِ سلیم رکھتے تھے، یونین میں تقریر انگریزی میں کرتے تھے اور خوب بولتے تھے، علی گڑھ کا جو وفد ۱۹۱۰ء میں ایران گیا تھا اس کے ممبر تھے بعد سے ان کو ڈاکٹر ضیاء الدین سے تعلق ہوا، بی۔اے پاس کرنے کے بعد کچھ دنوں تک تحصیلداری پر رہے، پھر ڈپٹی کلکٹر ہوئے، ریاست رامپور میں تین سال تک ریونیو منسٹر رہے، پھر کلکٹری پر ترقی پائی، زمانہ سے صوبہ کے پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہوئے، قلمی اور نادر کتابوں اور شاہی فرمانوں کے

جمع کرنے کا شوق ہے، شہنشاہ عالمگیر سے اس بارے میں اتفاق رائے نہیں رکھتے کہ شکار کارِ بے کاراں است (یعنی شکار بے کاروں کا کام ہے)

ولایت علی مرحوم اور نواب علی صاحب غالباً ایک ساتھ علی گڑھ پہونچے، نواب علی خاموش آدمی ہیں، بارہ بنکی میں وکالت کرتے ہیں، ولایت علی نے بمبوق کلب قائم کیا اور خود بمبوق کے نام سے شہرت پائی، خوش طبعی اور لطیف بذلہ سنجی میں بمبوق اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، تحریر میں بلا کی شوخی ہوتی تھی، کامریڈ میں جو مضمون مرحوم نے لکھے تھے ان سب کو کشتِ زعفران سمجھنا چاہیے، ناممکن ہے کہ آپ مضمون کی چار سطریں پڑھیں اور بغیر ختم کئے چھوڑ دیں، مثلاً بمبوق کا ایک مضمون پٹواری کے اوپر ہے، پٹواری کی شان زندگی یہ ہے کہ ہر بات اور ہر فعل ذو معنی ہو، مضمون میں بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ پٹواری کس طرح بیک وقت زمیندار کا تابعدار ہے کاشتکار کا ہمدرد، قانون گو کا معتمد، تحصیلدار کے یہاں کا حاضر باش اور حاکم پرگنہ کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے، سب جانتے ہیں کہ اس کے اندراجات غلط ہوتے ہیں اور وہ سوائے اپنے کسی کا دوست نہیں ہے مگر لطف یہ ہے کہ کوئی کچھ نہیں کرسکتا، بمبوق کے سارے مضامین بڑے پُر لطف ہیں جس میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

عین عالمِ شباب میں وہ سفر پیش آیا جو بالآخر سب کو پیش آیا ہے، مرحوم کا لڑکا انور جمال ہونہار اور صاحب سلیقہ ہے صحافت نگاری شغل ہے۔

سید مصطفےٰ حسین رضوی صاحب ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ آئے، غضب کی جلت پھرت تھی، کالج میں اس زمانہ میں دو پارٹیاں تھیں جن کے وجود کا احساس عام طلبا کو صرف یونین کے انتخابات کے زمانہ میں ہوتا تھا، مصطفےٰ حسین ایک پارٹی میں تھے دوسری پارٹی میں میں تھا، میں جس پارٹی میں تھا اس کا نام خواص کی پارٹی اور مصطفےٰ حسین جس پارٹی میں تھے اس کا نام عوام کی پارٹی تھا، یہ دونوں نام غلط تھے، خواص اور عوام دونوں کے دونوں ہر ایک پارٹی میں

تھے، دراصل ہر پارٹی کا نام وہ قرار پاتا ہے جس نام سے مخالف پارٹی اس کو پکارتی ہے
جن حضرات کی نظر انگلستان کی تاریخ پر ہوگی ان کو یاد ہوگا وگ WHIG اور ٹوری
پولیٹیکل پارٹیوں نے یہ نام کس طرح پائے تھے، بعینہٖ یہی حالت ہمارے ناموں کی تھی ۱۹۰۵ء
میں بڑے زور و شور کا انتخاب ہوا اور ہم ہار گئے، کالج کے ایک اسسٹنٹ پروفیسر اور
اسکول کے بہت سے ماسٹر انتخاب میں ووٹ دینے آئے تھے، تقریباً ان حضرات نے ووٹ
ہماری پارٹی کے خلاف دیئے، اصل بات یہ ہے کہ اس انتخاب میں یہ سوال نہ تھا کہ کس پارٹی
کے امیدوار زیادہ موزوں نہیں بلکہ عام طلبا کی طرف سے اس انتخاب میں اس پالیسی کے خلاف
اظہار ناراضگی کیا جا رہا تھا جو کرکٹ ٹیم کے کپتان اور ٹیم کے اور ممبروں کا اقتدار بڑھ جانے
میں کالج کے سرکاری حلقوں میں عرصہ سے برتی جا رہی تھی، ہوسٹ اور نہ ہوسٹ وارم
اور نزوارم میں ہمیشہ جھگڑا رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، ہماری پارٹی میں سب سے زیادہ ووٹ
عبدالمجید صاحب کے آئے تھے جو یونین کی وائس پریزیڈنٹی کے امیدوار تھے، مرحوم
مدراس کے رہنے والے تھے، بڑے خوش مزاج اور خوش خلق تھے، گوری چٹی رنگت، لمبا
قد، بدن خوب گٹھا ہوا، کالج میں ان کا لقب سولجر (فوجی سپاہی) تھا، بڑے ہر دل عزیز
تھے، مرحوم کے ایک سو آٹھ ووٹ تھے، میں وزارت (کیبنٹ) کی چھ جگہوں میں سے ایک
کا امیدوار تھا، سولجر کے بعد سب سے زیادہ میرے ووٹ تھے، یعنی ایک سو تین، دوسری
پارٹی کے امیدوار خواجہ غلام السبطین صاحب (خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم کے چھوٹے
بھائی) ساٹھ ستر ووٹ کی کثرت سے وائس پریزیڈنٹ مقرر ہوئے، انتخاب کے زمانہ میں
جن حربوں سے کام لیا جاتا ہے اس کا بھی ایک قصہ سن لیجئے، انتخاب سے دس دن پہلے میں
بنگال کے دورے سے واپس آیا تھا جو کامیابی مجھے بنگال اور اس سے پہلے اردو ناگری
کے جھگڑے میں صوبجات متحدہ میں ہوئی تھی، اس کے باعث کالج میں میری کچھ تھوڑی
بہت آؤ بھگت ہونے لگی تھی جس زمانہ میں دونوں پارٹیاں ووٹ حاصل کرنے کی کوشش

میں لگی ہوئی تھی، دورانِ تذکرہ میری زبان سے نکل گیا کہ ہمارے مخالفوں کو تمیز ہے نہ سلیقہ، وہ تو پہننے کے کپڑے مٹکوں میں رکھتے ہیں، بس پھر کیا تھا مخالفوں کے لفظ سے غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے، کیوں کہ بقول آتش مصرعہ، یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا) بات کا بتنگڑ بنا ڈالا، جب ہماری پارٹی کو شکست ہوئی، تو ہمارے ایک ممتاز مخالف نے طنزاً کہا، بنگال کی شہرت ... رضا علی کے کچھ کام نہ آئی، اب جو غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو جو شکست ہوئی اور ہمارے مخالفوں کو جو کامیابی ہوئی اس کا وہ استحقاق رکھتے تھے، کالج کے پرنسپل کی پالیسی یہ ہونا چاہیئے کہ سب طلبار کے ساتھ انصاف اور ناطرف داری کا برتاؤ کرے، اگر کسی جماعت کی بے جا رو رعایت کی جائے گی تو طلبار کی نظر میں پرنسپل کی وہ وقعت اور دل میں وہ اعتبار نہ رہے گا جو معلّم و متعلّم کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم رہنے کا کھلا راز ہے"۔

اس کامیابی نے مصطفےٰ حسین رضوی کے دماغ کو چوتھے آسمان پر پہونچا دیا، اس طرح اکڑ کر چلتے تھے گویا سارا کالج ان کے ذاتی روپیہ سے بنا ہے، ہماری پارٹی ان سے متنفر تھی اور میں تو ان کی صورت سے بے زار تھا لفظ رضوی کو مصطفےٰ نے اپنے نام کا جزو کر لیا تھا، ان پر ہی کیا موقوف ہے، انگلستان کی تقلید میں ہم نہ سید ہیں نہ شیخ، نہ مغل ہیں اور نہ پٹھان، کچھ رضوی اور زیدی اور جعفری اور نقوی ہو گئے ہیں، کچھ صدیقی اور عثمانی اور قریشی، اور زبیری بن گئے ہیں، کچھ نے چغتائی اور تیموری کے بھیس میں اپنا جنم لیا ہے، پٹھانوں کا طرۂ امتیاز اب تک خان رہا ہے جو اس قدر معزز لقب ہے کہ لفظ صاحب یا بہادر بڑھا کر اسے گورنمنٹ نے اپنے خطابات کی فہرست میں شامل کر لیا ہے اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ بھی پرانی کینچلی چھوڑ نیا روپ بدلیں گے۔

یوم کا خطاب میسکر زمانہ سے پہلے ایجاد ہوا تھا، میسکر زمانہ میں غالباً ساتویں یوم کا ہمائے سعادت ہمارے سروں پر سایہ فگن تھا، تو م کا پیارا لقب اور اڑ ننگ بڑ تنگ تڑ تنگ

مہتم بالشان خطابات میری آنکھوں کے سامنے مستحقین کو عطا کئے گئے، قوم کا خطاب میرے زمانہ میں دو صاحبوں کو دیا گیا اور سچ تو یہ ہے کہ دونوں مجسم قوم ہیں، دونوں نے سیاست میں نام حاصل کیا، قوم نمبر ایک، ایک بہت بڑی اسلامی ریاست کی خدمت انجام دے رہے ہیں، نقش دوئم نے تحریکِ خلافت کے زمانہ میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور ثابت کر دیا کہ ذاتی مفاد کو قربان کرنے کے معاملہ میں مسلمان کسی اور قوم سے پیچھے نہیں ہیں، پھر کانگریس کے دورِ حکومت میں ایک صوبہ میں وزیر رہے اور بن باپ کی بچی یعنی ہندوستانی زبان کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس بچی کی نگرانی اب بھی کرتے ہیں، قوم نمبر ایک اور قوم نمبر دو، دونوں بڑے جوشیلے اور سچے مسلمان ہیں، آج دونوں کا دائرہ عمل اس قدر مختلف ہے کہ باہمی ملاقات میں ایک دوسرے سے یوں کہہ سکتے ہیں، مصرعہ۔

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق

او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

دونوں یونیورسٹی کے دلدادہ و شیدا ہیں اور اکثر علی گڑھ آتے رہتے ہیں، آج زمانہ اڑنگ بڑنگ، تڑنگ کے خطابوں کی قدر نہ کرے، مگر صرف وہ خوش نصیب جنھوں نے ان تینوں بھائیوں کو دیکھا تھا ان خطابوں کی قدر کر سکتے ہیں، اڑنگ کا قد چھ فٹ سے اوپر تھا، بڑنگ بھائی سے ڈیڑھ انچ کم، ان سے ایک انچ کم تڑنگ، ہاتھ پاؤں کے خوب مضبوط، بڑی بڑی آنکھیں ایسی چمکتی تھیں جیسے اندھیری رات میں جگنو، چہرے کی گہری رنگت بھی لیے قدرے کھلتی تھی تینوں کا چہرہ پُر رعب تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ اب کسی مہم سے واپس آئے ہیں ذرا ان تینوں کو برابر کھڑا کیجئے اور اڑنگ بڑنگ تڑنگ بہ آوازِ بلند جلد جلد کہیئے اگر سودا کے پُرشکوہ قصیدہ کے مطلع کا مزہ نہ آجائے تو بات نہیں،

مصطفےٰ حسین نے رضوی کے نام سے شہرت پائی، ایک اور خطاب بھی موصوف کا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ جاننے والے اسی خطاب سے ان کو جانتے ہیں، خطاب کا کیا تذکرہ کروں، خطاب

بڑا نادر لوکھا تھا ان چاروں لفظوں کا سر کاٹنے یا پاؤں اور پھر سر کو سر یا پاؤں کو پاؤں سے ملا دیجیے ان ہی میں سے خطاب نکل آوے گا خطاب اٹکل پچو نہ تھا بلکہ اس کے حرف میں وسیع معنی پنہاں تھے، ہائے کیا زمانہ تھا اور کیا صحبتیں تھیں۔ شعر

کیا دن مزے کے تھے کہ جو راتوں کو صبح تک
میں تھا تری جناب تھی دستِ سوال تھا

ہماری صحبتوں میں معشوق کا نہ تھا تو دستِ سوال کہاں سے پھیلاتے، مگر فرہاد کو کوہکنی میں اور قیس کو صحرا نوردی میں وہ لطف نہ آیا ہوگا جو ہمیں علی گڑھ میں حاصل تھا، پریوں کی چاندنی راتوں میں بھارا ٹہلتے ہوئے قلعہ جانا، محمد حیات خاں کا زرڑے مبر واری رے کرتی کلا پاٹوں کی گانا اور ہم سب کا ترنم کے ساتھ مناجات کے یہ شعر پڑھنا،

• جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں آج وہ غریب الغربا ہے۔

جو سماں بندھتا تھا اس کا لطف کبھی گوہر جان اور انور جان کے گانے میں بھی نہ آیا، مراد آباد کے خاں بہادر قاضی شوکت حسین، نواب مرزا خاں داغ کے شاگرد تھے، کہتے تھے کہ ایک مرتبہ نواب کلب علی خاں مرحوم کی صحبتوں کا ذکر ہو رہا تھا داغ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے فرمانے لگے رام پور میں مجھے پچھتر روپیہ ماہوار ملتے تھے ایک نوکر تھا اور چھوٹا سا مکان، حیدر آباد میں اب ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ ہے، خسرو دکن کی قدر دانی سے نوکر چاکر، سواری شکاری سب کچھ ہے، رہنے کے لئے محل عنایت ہوا ہے، بڑی شان و شوکت ہے، ملنے والوں کا مجمع لگا رہتا ہے مگر مصرعہ،

وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ

کلب علی خاں دور کی تصویر آنکھوں میں پھرتی ہے، بعینہٖ یہی حالت میری ہے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے زندگی بڑے لطف سے کٹی اور کٹتی ہے اور تو اور غالب کا یہ شعر ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

پورے طور پر یہ شعر حال پر صادق نہ آتا ہو لیکن میری زندگی میں اس کی بھی جھلک موجود ہے، میں شراب نہیں پیتا مگر یہ کمی اس طرح پوری ہوئی کہ سیاسی زندگی میں اور خاص کر اس زمانہ کی سیاسی زندگی میں بجائے خود ہر روز ایک بوتل کا نشہ ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جینے کا مزہ بھی اس ہی وقت تک ہے جب تک بقول ریاض انسان کی یہ حالت رہے کہ مئے نہ پیئے اور جھومتا جائے۔

یہ سب مزے چکھے اور خوب چکھے تاہم علی گڑھ کا لطف علی گڑھ کے ساتھ گیا اور باتوں کو جانے دیجئے، تنہا ایک بات کو لیجئے، علی گڑھ میں دوستی اور محبت کے اندر کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی، علی گڑھ چھوڑنے کے بعد دوست بہت سے ملے مگر دوستی کا پتہ بہت کم چلا، زمانہ کی رفتار کہیئے، یا ہماری پرانی تہذیب یا شائستگی کے زوال کا اثر، دوستی اور خودغرضی عموماً مترادف الفاظ ہو گئے ہیں، اکثر انگریزی داں اصحاب، وضع داری کے نام پر ٹھٹھا مار کر ہنستے ہیں، مگر یاد رہے کہ وضع داری وہی جنس ہے جس کا نام انگریزی میں کیرکٹر ہے،

عبدالمجید قریشی

علی گڑھ میں میرے شب و روز

اس مادر علمی کے آغوش میں آنے سے قبل ہی میں اس کی شہرت اور عظمت سے کچھ کچھ آشنا ضرور تھا۔ کیوں کہ میرے بڑے بھائی فضل حق قریشی مرحوم ۱۸۹۵ء میں فارغ التحصیل ہو کر زندگی کی تگ و دو میں شریک ہو چکے تھے اور میرے منجھلے بھائی مولوی عبدالعزیز قریشی میرے علی گڑھ میں وارد ہونے کے وقت بی۔اے کے آخری سال میں تھے لیکن بمصداق آنکہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ مجھ پر تو اس درسگاہ کی زندگی کا اتنا گہرا نقش پڑا کہ میں دنیا و مافیہا کو فراموش کر کے اسی کا ہو کر رہ گیا۔

بہ بست دیدۂ مجنوں ز خویش و بیگانہ

چہ آشنا نگہے بود چشم لیلیٰ را

ایک ہی برس کے قیام کے بعد میرے قلب کی یہ کیفیت ہوئی کہ مجھے اس مادر علمی سے جدائی شاق ہونے لگی اور اس کی ہر ادا مجھے بھانے لگی۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

آج سے بہتر سال پہلے کا واقعہ ہے کہ میں ۵؍مئی ۱۹۰۳ء کو اس مدینۃ العلم میں داخلہ

کی سعادت حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا ۔ علی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو مجھے دو قسم کی سواریاں نظر آئیں بند گھوڑا گاڑی یا شکرم سے تو میں واقف تھا لیکن یکہ پہلے پہل میں نے وہیں دیکھا ریل کے اس سفر میں جس سنیئر طالب علم کی رہنمائی اور سرپرستی کے سپرد کیا گیا تھا ان کا نام عبدالرحیم پراچہ تھا اور وہ مادر علمی میں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور میرے ہموطن تھے۔ درس گاہ تک پہنچنے کے لیے ریلوے اسٹیشن سے یکے کی سواری ہی انھوں نے تجویز فرمائی۔ یہ تہل سواری بہت ہی دلشکن ثابت ہوئی۔ خدا خدا کر کے جب ہم کچی بارک کے مشرقی پھاٹک پر پہنچے جو مارسین کورٹ کے مغربی سرے پر تھا تو کچی بارک کو دیکھ کر معاً مجھے خیال آیا کہ اغلباً یہ رائڈنگ اسکول کا اصطبل ہے جہاں ہم آگئے ہیں کیونکہ ہم اس سے پہلے کھپریل کی چھتیں میں نے اصطبلوں پر ہی دیکھی تھیں لیکن جب میرے یہاں اور شیخ عبدالغنی مرحوم (جو بعد میں گوردھا کے کامیاب وکیل ہوئے) ہمارے استقبال کو آئے تو میری مایوسی کی انتہا نہ رہی اور میں نے اپنے دل میں کہا "یا وحشت کیا یہ بارکیں غریب الوطن طلباء کی رہائش کے لیے تعمیر کی گئی ہیں"۔ اس وقت مادر علمی کی عمارتوں کی کل کائنات بس اتنی ہی تھی کہ کالج کے طلباء کے لیے ایک طرف کچی بارک اور دوسری جانب پکی بارک تھی۔ کچھ پھوس کے بنگلے بھی اس قطعہ زمین پر کالج کے طلباء اور اساتذہ کی رہائش کے لیے تھے۔ کالج کی جامع مسجد بن چکی تھی مگر اس کی تکمیل ابھی بہت کچھ باقی تھی اور پکی بارک کے عین وسط میں شرقاً غرباً اسٹریچی ہال لٹن لائبریری اور چند پختہ عمارتیں تھیں جو کلاس کے طور پر استعمال ہوتی تھیں اور ایک عمارت میں ایم اے او کالج کے آنریری سکریٹری کا دفتر تھا۔ پکی بارک کے جنوب مشرق جانب ڈائننگ ہال تھا اور شمال مشرقی پہلو میں چند اور پختہ کمرے تھے جن میں پرنسپل کا دفتر تھا اور سائنس اور ریاضی وغیرہ کے لیکچر ہوتے تھے۔ انھیں کمروں میں نام نہاد لیبارٹریز بھی تھیں۔ سائنس کی تعلیم ایف ایس سی تک ہوتی تھی مگر آلات سائنس

اتنے کم تھے کہ تجربوں کی نوبت شاذ ہی آتی تھی۔ بی ایس سی کی تعلیم ابھی جاری نہیں ہوئی تھی۔ اسکول کے طلباء کے لئے دو بورڈنگ ہاؤس تھے مارسین کورٹ اور ظہور وارڈ نظام میوزیم ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں عمارتوں کے اعتبار سے درسگاہ میں کوئی دلکشی نہ تھی۔ اس کم درج بالانشیں ہونے کا مزہ ضرور تھا۔ نووارد ہوتے اور مادر علمی کی اصلی روح سے ناآشنا ہونے کی بدولت مجھ پر مایوسی طاری تھی۔ اس کیفیت قلب کے زیر اثر میں داخلہ کے لئے پرنسپل صاحب کے دفتر میں تھیوڈر مارسین صاحب کے سامنے پیش ہوا اور منجملہ اور کاغذات کے اپنے بڑے بھائی کا تعارفی خط پرنسپل صاحب کے سامنے رکھا چونکہ میں کسی قدر دیر کر کے داخلے کے لئے پہنچا تھا اور بورڈنگ ہاؤس بھر چکے تھے پرنسپل صاحب نے فوری طور پر داخلہ میں تامل کیا اور مجھے کچھ دن انتظار کرنے کا حکم صادر فرمایا اس حکم کو سُن کر میں نے فرط انبساط سے الجھی ہوئی انگریزی میں (ایک انگریز سے بات کرنے کا پہلا اتفاق تھا) ان سے پوچھا کہ اجازت ہو تو میں پنجاب واپس چلا جاؤں۔ کیوں کہ ابھی تو وہ ہال داخلے ہونے والے ہیں۔ پرنسپل صاحب یہ سُن کر ہنس دیئے اور فرمایا ہرگز نہیں "ہمارا کام اقامت کی مشکل کو حل کرنا ہے طلبا کو بھگانا نہیں! چند دن اپنے بھائی کے پاس قیام کرو"

الغرض ایک ہفتہ کے اندر ہی قیام کا مسئلہ حل ہو گیا اور میں سرسید ہال برادری میں شامل ہو گیا۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب میں جستہ جستہ اس مادر علمی کی ان خصوصیات کو پیش کرتا ہوں جو میرے دامن دل کی کشش کا موجب بن کر میرے پاؤں کی زنجیر ہو گئیں۔ ان میں سب سے مقدم تو اس درس گاہ کی اقامتی خصوصیت تھی۔ اساتذہ اور طلباء یہاں ایک بڑے خاندان کی صورت میں ایک ہی ماحول اور ایک ہی سرزمین پر قیام پذیر تھے جہاں اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، سوتے جاگتے اساتذہ کی نگاہ طالب علم پر رہتی تھی اور طالب علم کی نگاہ اساتذہ پر۔ اب تو علی گڑھ شہر اور

یونیورسٹی کے درمیان کا علاقہ سب کا سب عمارتوں سے معمور ہے لیکن اس زمانے میں شہر اور کالج میں کافی فصل اور کھلے میدان تھے۔ شہر سے الگ تھلگ ہمارا یہ خانہ ان آباد تھا۔ طلبار کو شہر یا ریلوے اسٹیشن پر جانے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا جو بغیر معقول وجہ کے مشکل سے ملتا تھا۔ دوسری خصوصیت اساتذہ کی شفقت اور ہمہ وقتی توجہ تھی جو طلبار کے دل میں ایک طرف ان کا رعب اور دوسری طرف ان کی اہمیت اور عزت کا جذبہ پیدا کرتی تھی جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔ میری طالب علمی کے ابتدائی دور میں کالج کے پرنسپل مارلین صاحب تھے۔ یہ شفقت اور اخلاق کے مجسم پیکر تھے آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ان کا حافظہ اتنا قوی تھا اور طلبار میں ان کی دلچسپی اتنی گہری تھی کہ ان کو تقریباً ہر طالب علم کا نام یاد رہتا تھا۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ اس زمانے میں ہر طالب علم کے لئے دن میں دو نمازوں کی حاضری ضروری تھی اور مغرب کی نماز کی حاضری لازمی۔ آخرالذکر قید اس لئے لگائی گئی تھی کہ ہر طالب علم کھیلوں سے فارغ ہو کر مغرب کی نماز کے لئے مسجد پہونچ جائے۔ پرنسپل صاحب اس پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ مغرب کی نماز سے ذرا قبل وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کالج میں آمد و رفت کی سڑکوں پر نکل جاتے تھے اور جہاں ان کو کوئی طالب علم دیر کر کے لوٹتا ہوا نظر آتا تھا وہ دور ہی سے اس کا نام لے کر للکارتے تھے۔ یہ للکار سن کر جہاں فوری ہیبت طاری ہو جاتی تھی وہاں دوسرے دن دفتر میں حاضر ہو کر جواب دہی کا خوف بھی بھوت بن کر سر پر سوار ہو جاتا اور رات کی نیند حرام کر دیتا تھا۔ پرنسپل صاحب اور ان کی میم صاحبہ نے ایک ہفتہ وار انجمن قائم کر رکھی تھی جس میں چند اساتذہ اور کچھ سربرآوردہ طلبا شامل کئے جاتے تھے۔ ہر ہفتے کسی علمی اخلاقی یا معاشی مضمون پر کوئی رکن اپنا مقالہ پڑھتا تھا اور اس پر بحث ہوتی تھی اس میں بعض تنظیمی معاملات بھی سامنے آجاتے تھے۔ پھر کافی یا چائے کا دور چلتا تھا یہ کالج کی ایک معرکۃ الآرا انجمن تھی اور اس کی

رکنیت قابلِ فخر بھی جاتی تھی۔ میں بی۔ اے میں آنے کے بعد اس انجمن کا رکن بنا۔ مارلیسن صاحب کے بعد جو پرنسپل آئے انہوں نے بھی اس انجمن کو قائم رکھا۔ آرچ بولڈ صاحب کے جانے کے بعد یہ انجمن ختم ہو گئی۔

تعلیم کے ابتدائی دور کے اساتذہ میں سے مجھے اپنے محترم استاد پروفیسر چکرورتی خاص طور پر یاد ہیں۔ وہ ایک سچے خادم علم اور خوگر اخلاق حسنہ تھے۔ بنگالی وضع کا سوٹ پہنتے تھے۔ کوٹ کا کالر بند ہوتا تھا۔ بھاری سی ریش تھی سر پر ٹوپی شاذ و نادر پہنتے تھے ریاضی کے ماہر تھے اور اس خشک مضمون کی مشکلات چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔ مولوی ابوالحسن صاحب اور پروفیسر عبدالحئی علی الترتیب طبعیات اور کیمسٹری کا درس دیتے تھے۔ میں بی اے کے آخری سال میں تھا کہ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد بھی ولایت سے واپس آگئے اور ہمیں درس دینا شروع کیا۔ اس دور کے مذہبی اور اخلاقی علوم کے نادر نمونے مولوی عبداللہ انصاری مرحوم ناظم دینیات سنی مولوی عباس حسین صاحب ناظم دینیات شیعہ اور مولوی خلیل احمد اسرائیلی صاحب استاد عربی فارسی تھے جن کے پاس حاضر ہو کر دل خوش ہوتا تھا۔ شیعہ سنی یا وہابی جھگڑے اس دور میں کبھی سننے میں نہیں آئے۔ جھگڑوں کا پیش آنا تو کجا مجھے تو طالب علمی کے زمانے میں یہ علم بھی نہ ہو سکا کہ میرے دوستوں میں کون شیعہ ہے اور کون سنی اور کون وہابی۔

تیسری خصوصیت مادرِ علمی کا ڈائننگ ہال تھا جہاں بیماری کی حالت کے سوا دونوں وقت کھانے پر حاضری لازمی تھی یہ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانا اخوت اور تنظیم کے مواقع میسّر کرتا تھا۔ ڈائننگ ہال کا انتظام اور باورچی خانے کی دیکھ بھال ایک نگراں استاذ کے زیر ہدایت خود طلباء کا ایک گروہ ہی کرتا تھا جو ڈائننگ ہال کے مانیٹر کہلاتے تھے ان میں سے ایک سینئر مانیٹر ہوتا تھا جو تقسیم فرائض کرتا تھا۔ یہ عہدہ ایک ممتاز عہدہ تھا۔ ۱۹۰۷ء میں میں سینئر مانیٹر تھا۔ یہاں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس سے باورچی خانے کے ملازمین کی

چالاکی آپ پر واضح ہو گی۔ کچھ مدت سے یہ شکایت چلی آ رہی تھی کہ کھانا اچھا بھی نہیں ہوتا اور مقدار بھی کم ہوتی ہے میں نے اس شکایت کا حل تلاش کرنے کے لئے یہ کیا کہ فی طالب علم جو ہر جنس کی تعداد مقرر تھی وہ سو طالب علموں کے لئے وزن کرائی اور پکانے کے لئے باورچیوں کے سپرد کی۔ اس کا اہتمام کر دیا گیا تھا کہ باری باری ایک دو مانیٹر برابر باورچیوں کے سر پہ سوار رہیں تاکہ رسد میں کمی نہ ہونے پائے۔ صرف مغرب کی نماز کے وقت ہم باورچیوں کے پاس سے ہٹے اور وہ بھی کہیں دور نہیں گئے وہیں قریب میں نماز پڑھی جب کھانا پک کر تیار ہوا تو کیفیت کے اعتبار سے تو وہ یقیناً بہتر تھا لیکن کمیت میں کوئی فرق نہ تھا۔ کیفیت کا بہتر ہونا تو ظاہر تھا کہ کم تعداد کے لئے کھانا اچھا پکتا ہے لیکن اصل بے ایمانی تو کمیت میں فرق آنے پر پکڑی جاتی اس میں باورچی حق بجانب اور شکایتیں ناکام ہوئیں۔ تجربے کے ناکام ہو جانے پر منتظمین باورچی خانہ تو خوش تھے اور ہم انگشت بدنداں۔ کئی دن بعد ایک ملازم کو انعام کا لالچ دیا تو معلوم ہوا کہ جس وقت ہم لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت پکتے کھانے کے کرچھے بھر بھر کر باورچیوں نے دہکتے ہوئے چولہوں میں جھونک دیئے تھے۔ سزاً بہت سا عملہ الگ کیا گیا مگر جو نیا عملہ آیا وہ اپنے نئے کمالات ساتھ لایا اور کھانے کی شکایت اکثر رہی۔

چوتھی خصوصیت اس درسگاہ کی طلباء کا سٹوڈنٹس یونین تھا جو طلباء میں خطابت، حاضر جوابی اور تنظیم انتخابات کی فضیلتیں تخلیق کرتا تھا۔ اس کا نظم و نسق بھی دو ایک اساتذہ کی نگرانی میں طلباء ہی کرتے تھے۔ طلباء کی جو جماعت منتخب ہو کر آتی تھی اس میں وائس پریسیڈنٹ، سکریٹری اور لائبریرین کے عہدے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ کچھ ارکان کی کیبنٹ بھی ہوتی تھی اور یہ اپنے جلسے بہت کامیابی سے کرتے تھے۔ جب میں کالج میں داخل ہوا تو اس وقت کالج کے طلباء دو بڑی جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے بعینہ ایسے ہی جیسے ہاؤس آف کامنز میں کنزرویٹو اور لبرل۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں تقسیم کا دار و مدار امیدوار کی قوت خطابت اور ہر دلعزیزی پر تھا۔ کبھی کبھی کچی اور

پی بارک کے اہالیان میں رسہ کشی ہو جاتی تھی۔ لیکن انتخابات کے بعد سب ایک ہو جاتے تھے میں بھی ایف، ایس، سی کے دوسرے سال میں تھا کہ عبدالحمید خاں مرحوم کی منسٹری میں کیبنٹ ہو گیا۔ بی اے کے آخری سال میں یونین کا سکریٹری منتخب ہو گیا۔ نائب صدر اس وقت تصدق احمد خاں شروانی تھے۔ اب گو ایسے یونین ہر درسگاہ میں قائم ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کی ابتدا کا سہرا ہماری مادرِ علمی ہی کے سر ہے اور جس قدر متانت اور تنظیم کے ساتھ یہ ادارہ علی گڑھ میں کامیاب رہا ویسی حسن و خوبی اور ضبط عمل برسہا برس کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے۔ ہر منسٹری کی کامیابی کا اندازہ تین چیزوں سے لگایا جاتا تھا (۱) منسٹری نے اپنے ایک سال کے عرصہ میں طلبا ر میں سے کتنے نئے مقرر پیدا کئے (۲) مشاہیر ہند کے مقرروں میں سے کتنے یونین میں تقریر کرنے آئے اور اعزازی رکن بنے (۳) کتنے کامیاب مباحثے سال میں ہوئے اور یونین کے بجٹ سشن میں حزب مخالف کو کیسی ناکامی ہوئی۔

۱۹۰۹ء میں جب کہ میں ابھی ایم اے کا طالب علم تھا ایک دن یکایک شام کے چار بجے کے قریب محترم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کا حکم پہنچا" پروفیسر چکرورتی رخصت پر جا رہے ہیں اور تم کو کل صبح سے ان کی جگہ کالج میں جا کر ریاضی کی تعلیم دینا ہوگی۔ جاؤ اور پروفیسر چکرورتی سے ان کا ٹائم ٹیبل وغیرہ لے لو" یہ حکم آنکھوں کے سامنے تھا اور پاؤں کے نیچے سے زمین نکلی جا رہی تھی۔ خام تعلیمی حالت میں یہ ذمہ داری اور وہ بھی اپنی درسگاہ میں قبول کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن حکم استاد ٹالا جاتا تو کیوں کر۔ ٹائم ٹیبل کا معائنہ کیا تو پہلی کلاس جس کا سامنا دوسرے دن کرنا تھا وہ بی اے کی آخری سال کی کلاس تھی جس میں کرنل حید رخاں، خورشید احمد محمد فاروق دیوانہ وغیرہ تھے۔ یہ سب طلبا ر بورڈنگ میں میرے ہمعصر تھے اور میری کوتاہیوں سے آگاہ۔ ان کے سامنے جا کر ان کو پڑھانے کی ہمت کروں تو کیسے اس زمانے میں ایم اے کے مضامین میں شامل ہونے والے طلبا بہت کم ہوتے تھے۔ یہی بی اے کے طالب علم سنیر سمجھے جاتے تھے۔ ان کو یہ کیسے گوارا

ہو سکتا تھا کہ ان کو درس دینے کے لئے ایک ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جس سند ابھی ایم۔ اے کی سند بھی حاصل نہیں کی تھی لیکن بالآخر راستہ ہموار ہو گیا۔ کئی برس بعد کرنل حیدر خاں نے اپنی ایک تقریر میں اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا "قریشی صاحب کو ہم نے ایک کامیاب استاد بنایا اور انھوں نے ہم کو ایک کامیاب طالب علم" اب اور واقعات کو بشرط فرصت دوسرے موقع کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید وقت
ماہم چناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

حکیم احمد شجاع

میرا علی گڑھ کالج

۱۹۰۹ء میں جب میں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا تو میرے بزرگ میرے مستقبل کے متعلق آپس میں مشورے کرنے لگے۔ ہمارے خاندان کے دیرینہ کرم فرما سردار محمد اسمٰعیل جان جو ان دنوں حکومت کابل کی طرف سے ہندوستان میں سفیر اور لاہور میں مقیم تھے۔ میری ہوشمندی اور ارادت سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے بہ کمالِ مروّت یہ مشورہ دیا کہ مجھے کابل بھیج دیا جائے۔ کابل میں ان کا اثر اور اقتدار ایسا تھا کہ وہ افغانستان میں میرے اکتسابِ علم و ہنر اور بعد میں میرے لئے کسی معقول سرکاری ملازمت کا آسانی سے انتظام کر سکتے تھے۔ انکی سے کابل بھیجنے کی علت غائی یہ تھی کہ کسی نوعمر ہندوستانی لڑکے کا کابل میں جاکر افغانی رعایا بن جانا۔ اور رفتہ رفتہ حکومت کا اعتبار حاصل کر لینا زیادہ آسان تھا۔ یہ تجویز دیکھنے کو بڑی خوش آئند تھی مگر حب امین الدین کی محبت نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ ان کے خاندان کا اکلوتا وارث محض مرتبے اور دولت کے لالچ میں اپنے وطن مالوف سے باہر بھیج دیا جائے اس تامل کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے دونوں عمزاد بھائی حکیم شہباز دین اور حکیم امین الدین ابھی تک اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ اور ان کے خاندان کی بقا کی امیدیں ایک میری ہی ذات سے وابستہ تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارا خاندان ابتدا ہی سے مناصبِ جلیلہ پر فائز اور اعمالِ کثیر پر قادر ہونے کے باوجود استغ

کی قسمت سے کچھ اس درجہ بہرہ رہا ہے کہ ہمارے خاندان کے افراد کو ہمیشہ امیری کے طمطراق سے فقیری کی بے نیازی زیادہ بھاتی رہی۔ میرے جدِّ امجد عبدالحمید انصاری عرب فاتحان سندھ کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ اس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ حاکم بھٹنیر نے ان کو اپنی فرزندی میں قبول کیا اور ان کی شجاعت اور فراست سے خوش ہو کر اپنی ریاست کی حکومت اور قلعہ بھٹنیر کی افواج کی قیادت اُن کے سپرد کر دی۔ رفتہ رفتہ اس نوجوان عرب نے سندھ کا بہت بڑا علاقہ فتح کر لیا۔ اُن کا مزار ملتان کے قریب تلنبہ میں ہے۔ ان کی اولاد میں سے ہمارے ایک نامور بزرگ شیخ اسحاق گزرے ہیں جنھوں نے شہنشاہ اکبر کے دربار میں بڑی عزت پائی۔ اور حکیم اتون مسیحی سے یونانی طبابت کا فن سیکھا۔ اس دن سے آج کے دن تک طبابت ہمارے خاندان کا بڑا سرمایۂ امتیاز و اقتدار رہی ہے۔ انہیں کی اولاد میں سے ایک بہت باخدا اور نامور طبیب شیخ نور محمد ہوئے ہیں۔ جو ضلع منٹگمری کے مشہور قصبے شیر گڑھ میں آ کر حضرت دیوان مائر کی سعیت سے مشرف ہوئے۔ انہوں نے شیر گڑھ کے دربار پر انوار کا انتظام کچھ اس خوبی سے کیا کہ نواب امانت خاں صوبہ دار لاہور ان کے حسن کارکردگی سے خوش ہو کر ان کو اپنے ہمراہ لاہور لے آئے۔ اور صوبہ داری کے تمام فرائض ان کے سپرد کر دیئے۔ شیخ نور محمد کے پوتے حکیم عبداللہ مومن انصاری جن کا ذکر گریفن کی مشہور کتاب "پنجاب چیفز" میں ہے صوبۂ کشمیر کے قاضی القضات اور بعد میں صوبہ دارِ لاہور کے دربار کے ایک معزز رکن ہوئے۔ کچھ عرصہ کے لئے میرے نامور جدِ امجد کشمیر کی صوبے داری پر اور بعد میں لاہور کی صوبے داری پر بھی فائز رہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں شاید ہی کوئی بڑا عہدہ ہو جو ہمارے خاندان کے زیرِ تصرف نہ رہا ہو۔ سکھوں کے دورِ اقبال میں ہمارے خاندان کا اقتدار اور اثر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس تمام اقتدار اور اثر کے باوجود ہمارے خاندان کے افراد کا انکسار اور استغنا بھی ضرب المثل ہے۔ غرض مستقبل کی امید دلی کے سنہری نظارے میرے بزرگوں کی آنکھوں کو مسحور نہ کر سکے۔ مگر ایم۔ اے۔ اور کالج کی زندگی کے وہ خواب جو میر ضمیر الحسن

بجھے دکھا رکھے تھے۔ اور سرسید علیہ الرحمۃ کی قائم کی ہوئی اس علمی اور اسلامی درسگاہ کی دلکشی کے وہ نقشے، جو انھوں نے میری نظر میں جما رکھے تھے ایسے بے حقیقت نہ تھے کہ اب میرے اور علی گڑھ کے درمیان کوئی شکل حائل ہو سکتی۔

میں ۱۹۰۹ء میں علی گڑھ کالج کی فسٹ ایر کی کلاس میں داخل ہو گیا اور خوش قسمتی سے سرسید کورٹ میں رہنے کی جگہ بھی مل گئی۔ اللہ اللہ یہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا کبھی آپ نے چراغ کو بجھنے سے پہلے دیکھا ہے۔ وہ لو بھی دیکھی ہے جو خاموش ہونے سے پہلے شمع کے قلب وجگر سے اُٹھتی ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ علی گڑھ میں اس وقت مسلمانوں کے اقتدار کے چراغ کی یہ آخری بھڑک تھی اور اسلامی تہذیب کی شمع کی آخری چمک سرسید کے بعد نواب محسن الملک اور سید محمود اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور علی گڑھ کی عنانِ سیادت اسلامی عظمت کے اس آخری سرمایہ دار کے ہاتھ میں تھی جو وقار الملک کے لقب سے آج تک مشہور ہے اور جس کی خودداری، صمیمیتِ عزم، حق پرستی اور شریعتِ اسلامی کی پابندی، ہندوستان میں اسلام کا آخری وقار اور ملتِ اسلامیہ کا آخری اعتبار تھیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد بیرسٹرایٹ لا جن کی صورت اور سیرت کی خوبیاں ملا کمٹ فریب اور علی گڑھ کالج کے لئے جن کا ایثار ہماری قومی روایات کا طغرائے امتیاز ہے۔ بھیکم پور، چھتاری، دتاولی، پہاسو اور طالب نگر کے معزز خاندانوں کے وہ تمام نامور افراد جن کی ذاتی سخاوتوں اور خاندانی فیاضیوں کا احسان علی گڑھ کالج کی گردن پر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مسٹر آرچ بولڈ علی گڑھ کالج کے پرنسپل جن کا نواب وقار الملک سے اصولی اختلاف اکبر کے اس مشہور شعر کا محرک ہوا ہے

کالج کے در پہ لکھ دے کوئی آب گولڈ سے
ختم ہو سکے نہ سکریٹری آرچ بولڈ سے

مگر جن کے علم کی عظمت کے آگے ہر مخالفت سر در گریباں تھی اور جن کی شرافت کے سامنے ہر مخاصمت خانہ ویراں۔ جن کے اس عشق پیچاں کو علی گڑھ کالج کے در و دیوار سے

تھا۔ یہ ضرب کنعان نشانہ اور حسن کی اس محبت پہ جوان کو علی گڑھ کالج کے طلبہ سے تھی ہزار یعقوب قربان۔ مولوی عبدالباقی کالج کے برسر پروفیسر لڈ الحسن جو اس زمانے میں نواب وقار الملک بہادر کے سکریٹری تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ریاضیات کے پروفیسر، ڈاکٹر ہار وونڈ عربی زبان کے جرمن پروفیسر، مولانا عباس حسین السنۂ مشرقیہ کے استاد، پروفیسر ڈیوڈ اختر لوفی سید محمود کو رٹ کے اور پروفیسر تھیوڈر اور ڈان سر سید کورٹ کے پروفیسر۔ مولانا سلیمان اشرف معلم دینیات۔ پروفیسر انیل اور پروفیسر پروس۔ پروفیسر محمد شفیع۔ غرض کس کس کے نام گنوائے جائیں۔ اس وقت یہ آسمانِ علم و فضل روشن ستاروں سے بھرپور تھا اور درخشاں نجوم و کواکب سے معمور۔

مسٹر محمد علی (آکسن) اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی جو بعد میں اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے ہندوستان کی سیاسیات کے رہنما ہوئے۔ سرکاری ملازمت کی پابندیوں کو اپنے حسب حال نہ پاکر اور اپنے اپنے بلند مرتبت عہدوں سے سبکدوش ہو کر علی گڑھ میں مقیم ہو چکے تھے مولانا شوکت علی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری ہونے کی حیثیت سے بھوس والے بنگلے کے قریب ایسوسی ایشن کے دفتر میں رہتے تھے۔ اور مسٹر محمد علی ممتاز ہاؤس کے قریب ایک چھوٹے سے کچے بنگلے میں اقامت گزیں تھے۔

یہ جگہ علی گڑھ کی سیاسیات کے ذکر کے لئے موزوں نہیں تاہم اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ علی گڑھ کی لیلیٰ کے کئی دیوانے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے عشقِ صادق کا دعویدار اور اپنے جذبِ کامل کے اثر کا امیدوار تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو سر سید کی ذات سے دیوانہ وار محبت تھی اور نواب محسن الملک بہادر کے وقت میں ان کے دستِ راست تھے۔ اپنی کوٹھی "آفتاب منزل" میں میر ولایت حسین کے ساتھ بیٹھ کر کالج کے انحطاط اور تنزل کا دکھڑا رویا کرتے تھے اور دن رات اسی فکر میں غلطاں رہتے تھے کہ علی گڑھ کالج کا تعلیمی اور سیاسی دستور اس مقصد سے الگ نہ ہو جائے جو سر سید کا نصب العین تھا۔ مولانا

شوکت علی اور مسٹر محمد علی اپنی اپنی جگہ علی گڑھ کالج کے طلبہ کی توجہ کے حقدار اور ایک نئے تعلیمی اور سیاسی نصب العین کے علمبردار بنے بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج کا دستور اساسی کچھ ایسے سانچے میں ڈھل جائے کہ اس کے طلبہ ہندوستان کی قومی تحریکوں اور اپنے وطن کے سیاسی ارتقاء میں اسی آزادی اور سرگرمی سے حصہ لے سکیں جس آزادی اور سرگرمی سے دوسری اقوام کے طلبہ حصّہ لے رہے ہیں۔ اِدھر نواب وقار الملک اِن دونوں قوتوں کے درمیان لبا اوقات متصادم بھی ہو جایا کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج کی ناؤ کو اس گرداب بلا سے بچانے میں دن رات ناخدائی کی وہ مصیبتیں جھیلتے رہتے تھے جن کا صحیح اندازہ صرف وہی ملّاح لگا سکتے ہیں جن کی کشتی کو کسی طلاطم خیز بھنور سے دوچار ہونا پڑا ہو۔

کالج کے طلبہ میں اس وقت سید آل حسن اور سید احمد علی جو اپنے اپنے زمانے میں کرکٹ کے کیپٹن ہوئے، سید نور الدین ہاکی کے کیپٹن، سید مسعود الحسن فٹ بال کے کیپٹن، ملک عبدالقیوم یونین کے وائس پریسیڈنٹ، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالرحمٰن سندھی، محمد حاذق ڈائننگ ہال کے مستقل مانیٹر، ضیاء الحسن علوی، ظہیر الدین شمس، فضل متین، محمد شعیب، سلام الدین خاں، خواجہ فیروز دین، لارڈ حیات، قاضی مقبول حسن، ممتاز حسن خاں، ظہیر زاہدی، ضیاء الحسن، استاد مقصود حسین، لارڈ اسحاق، کریم حیدر لودھی، شفقت، اشفاق اور بھوندو ٹری نمایاں اور گراں قدر اہمیت رکھتے تھے۔ ان کے کمرے فرقۂ باطنیہ کے حلقوں کی طرح ان کے ارادت کیش طلبہ کا مرجع بنے رہتے۔ مجھے ان سب کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اور اپنی اپنی جگہ سب مجھ پر مہربانی فرماتے تھے۔

ہز ہائنس نواب سر محمد حمید اللہ خاں موجودہ فرمانروائے بھوپال، نواب سر احمد سعید خاں جو بعد میں یوپی کے گورنر ہوئے اور اب حیدر آباد دکن کے مدار المہام ہیں اور سر سکندر حیات خاں جو بعد میں پنجاب کے گورنر اور پھر اسی صوبے کے پہلے وزیر اعظم ہوئے۔ اسی زمانے میں علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں اپنی نامور والدہ کے ایما کے مطابق جو اس وقت سربر آرائے بھوپال تھیں۔ اس سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے کہ کبھی کسی کو اس بات کا پتہ نہ چلا کہ وہ ایک عظیم الشان ریاست کے ولی عہد اور اس کے آئندہ تاجدار ہیں۔ مجھے ان کے ہم جماعت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سردار سکندر حیات خاں تو ۱۹۰۹ء ہی میں انگلستان چلے گئے اور صاحبزادہ احمد سعید خاں قریب قریب اسی زمانے میں اپنی ریاست کے امور کے انصرام میں منہمک ہو گئے۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں کی تعلیم اور جسمانی تربیت کا قوام کچھ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ جہاں وہ لکھائی پڑھائی میں بہت ہوشیار تھے وہاں ہر قسم کے کھیل کود میں بھی بڑے چاق و چوبند تھے اور اس وجہ سے انہوں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بلا تامل ولکلف قانون کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ علی گڑھ کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی رہے۔ اس زمانے میں علی گڑھ کالج کی ٹیم کا کپتان ہونا ایک ایسا اعزاز تھا جو آسانی سے ہاتھ نہیں آتا تھا اور جس پر جتنا بھی فخر کیا جاتا، بجا تھا۔

صاحبزادہ حمید اللہ خاں اتنے ہنس مکھ اور ملنسار تھے کہ سب انھیں اپنا دوست سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ سب کے دوست تھے۔ مجھ پر بڑی مہربانی فرماتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے۔ میں ونسینٹ سمتھ کی لکھی ہوئی "تاریخ ہند قدیم" پڑھ رہا تھا اور سانچی استوپ کا تذکرہ میرے زیر مطالعہ تھا۔ صاحبزادہ حمید اللہ خاں اس طرف آنکلے۔ فرمانے لگے "تم سانچی استوپ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی کیوں نہ لو" میں نے کہا "سانچی استوپ ہے کہاں" مسکرا کے فرمایا "اپنی ریاست میں"۔ میں نے کہا "ضرور حاضر ہوں گا"۔ ارشاد ہوا "تو وعدہ ہے بھول نہ جانا"۔ یہ بات ۱۹۱۱ء کی ہے۔ میں ۱۹۲۲ء میں بمبئی سے واپس آ رہا تھا جب بھوپال کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو بھوپال کا نام سنتے ہی میرا ذہن زمانۂ ماضی کی کئی منزلیں طے کر گیا اور مجھے اپنا وعدہ یاد آیا۔ جو میں نے اس مملکت کے آئندہ تاجدار سے کیا تھا۔ میرے ایک نہایت عزیز دوست اور پیشاور کے

رئیس آغا محمد وسیم جان میرے رفیقِ سفر تھے۔ ان سے بھوپال اترنے کے لئے کہا۔ انہوں نے وجہ دریافت کی۔ میں نے کہا۔ پھر عرض کروں گا۔ عابد میرا اپنا ملازم میرے ساتھ تھا اس سے اسباب اتارنے کے لئے کہہ دیا۔ اس وقت رات کے کوئی بارہ بجے کا عمل تھا گرمی کے موسم میں بارش ہو رہی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس اسٹیشن کے قریب ہی موجود ہے۔ ہم دونوں رفیقِ سفر اور عابد بارش میں بھیگتے بھاگتے ریسٹ ہاؤس کی طرف چلے۔ یہ ریسٹ ہاؤس اسٹیشن سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ گھپ اندھیری رات۔ اس بارش اور پھر ہماری ناواقفیت۔ غرض بڑی مشکل سے ریسٹ ہاؤس کے بیرے کا پتہ چلا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ یہ عمارت اس زمانے میں کچھ خستہ حال سی کھڑی تھی۔ کمرے میں گرمی۔ برآمدے میں بوچھاڑ اس پر قیامت یہ تھی کہ پلنگ کے گدیلے میں کھٹملوں کی بھرمار۔ کبھی اندر کبھی باہر۔ غرض جوں توں کرکے رات کٹی۔ صبح ہوتے ہی میں نے صاحبزادہ ولی عہد بہادر کو اپنی حاضری کی اطلاع پہنچانے کی غرض سے ایک عریضہ لکھا اور اسے بیرے کے حوالے کر دیا۔ کچھ یوں ہی سا ناشتہ کر کے میں اور آغا وسیم جان سو گئے۔ ناگہاں آنکھ کھلی باہر ایک شور سنائی دیا۔ میں گھبرا کے اٹھا۔ اور کمرے سے باہر نکل آیا اور اس وقت میرے بدن پر صرف ایک بنیان تھی اور میں پنجابی طرز کا تہمد باندھے ہوئے تھا۔ باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چاروں طرف سرکاری پیادے اور سپاہی دوڑ رہے ہیں۔ ایسے جیسے کسی بڑے بھاری مجرم کی تلاش ہو رہی ہو۔ سامنے دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کے بلند قامت اور تنومند بزرگ فوجی وردی زیب تن کئے نظر آئے۔ ظاہری وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کوئی بہت بڑے سرکاری عہدیدار یا فوج کے افسر ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا وہ صاحبزادہ کرنل عبدالقیوم خاں علیا حضرت کے چیف آف دی اسٹاف تھے۔ کرنل صاحب کی زبان پر بس ایک جملہ برابر جاری تھا "میاں کے مہمان" "میاں کے مہمان" بیرے نے میری طرف اشارہ کیا۔ کرنل صاحب نے مجھ سے کڑک کر پوچھا "میاں کے مہمان کہاں ہیں" میں کچھ سمجھ نہ سکا اور حیرت سے اُن کا منہ تکنے لگا۔ آخر کرنل صاحب نے وضاحت فرمائی "میں حکیم احمد شجاع سے

ملنا چاہتا ہوں"۔ میاں ان کا انتظار فرما رہے ہیں۔ وہ میاں کے مہمان ہیں۔ ان کے لئے میاں کا موٹر اور ان کے سامان کے لئے ٹرانسپورٹ کا ٹرک حاضر ہے"۔ اب جو میں نے اپنی ہیئت کذائی پر نظر ڈالی اور پھر اپنے استقبال کے ساز و سامان کی طرف دیکھا تو مجھے اپنی حالت پر بڑا رحم آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں یہ کہتا ہوں کہ میں حکیم احمد شجاع ہوں تو میرے استقبال کے اس سارے اہتمام کی توہین ہو جاتی ہے۔ بلا تامل مزید عرض کی" اطلاع کئے دیتا ہوں سرکار"۔ کمرے میں جا کر میں فوراً لوٹ آیا اور عرض کی" فرماتے ہیں کپڑے پہن کر حاضر ہوتا ہوں آپ تشریف رکھیے"۔ کرنل صاحب ریسٹ ہاؤس کی ایک ٹوٹی پھوٹی کرسی پر بیٹھ گئے۔ آغا وسیم جان دروازے کے چک کے پیچھے کھڑے ہنسی کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر نہا دھو کر اور کپڑے پہن کر ہم دونوں باہر نکلے۔۔۔۔۔۔ کرنل صاحب نے مجھے دیکھا تو حیران ہو گئے۔ مگر زمانے کے اس سرد و گرم چشیدہ شریف انسان نے نہ اس وقت جتایا۔ اور نہ پھر کبھی یاد دلایا کہ اس نے حکیم احمد شجاع کے ملازم کو پہچان لیا تھا۔

ہمارا سفر مختصر تھا۔ اس لئے ایک ایک سوٹ کیس اور ایک ایک بستر کے سوا ہمارے ساتھ اور کچھ نہ تھا۔ مگر میں نے ٹرانسپورٹ کے ٹرک کی لاج رکھنے کے لئے عابد سے کہا" تم سامان کے ساتھ آؤ"۔ راستے میں کرنل صاحب نے موٹر روک کر ہمیں بھوپال تال کا نظارہ دکھایا۔ اس وقت۔۔۔۔۔۔ ٹرانسپورٹ کا ٹرک ہمارے پاس سے گزر گیا۔ ٹرک بالکل خالی نظر آتا تھا۔ اور عابد ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھا۔ میں بہت خوش ہوا کہ کرنل صاحب کی نگاہ اس وقت تال کے پار مصروف سیر تھی۔

مہمان خانے میں پہونچے تو دیکھا کہ میری خاطر مدارات کے ایسے اہتمام ہو رہے ہیں جیسے کوئی شہزادہ کسی شہزادے سے ملنے آ رہا ہے۔ اس وقت فطرت بھی اپنی ساری حسین کار فرمائیوں کے ساتھ اس منظر کو دلفریب بنانے میں مصروف نظر آتی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، شاداب سبزہ، کھلے ہوئے پھول، مہمان خانہ اس وقت اِندر کا اکھاڑا نظر آتا تھا۔

اور ہر طرف سے صرف ایک ہی جملے کی گونج سنائی دے رہی تھی "میاں کے مہمان" میاں کے مہمان" اس تواضع کی تفصیلات کے لئے جو میرے دو تین روز کے قیام کے دوران میں میرے سامنے آسائشوں اور نعمتوں کا خوانِ کرم بچھاتی رہی، یہ جگہ نہیں مگر میں اس بیان کو یہ کہے بغیر ختم نہیں کرنا چاہتا کہ عزت و عظمت کا وہ زندہ پیکر جسے اس کی رعایا "میاں" کے محبوب لقب سے پکارتی تھی۔ اور جسے ہم کالج میں صاحبزادہ حمیداللہ خاں کہا کرتے تھے۔ مجھ سے گیارہ برس کے بعد بھی اسی سادگی، اسی محبت اور اسی بے تکلفی سے ملا۔ اور جب تک میں اس کے پاس بیٹھا رہا اس نے مجھے یہ بات یاد تک نہ آنے دی کہ جس پرانے ہم جماعت سے میں اس وقت ہم کلام ہوں وہ اس سرزمین کا آئندہ فرمانروا ہے۔ بھوپال دیکھے اور تاجدار بھوپال کی مہمان نوازی کا لطف اٹھائے اب مدتیں ہو گئیں لیکن جب کبھی اس طرف کا دھیان آتا ہے تو حافظ کا یہ شعر زبان پر جاری ہو جاتا ہے ؎

گرچہ دوریم از بساطِ قرب ہمت دور نیست
بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوانِ شما

اُس زمانہ میں علی گڑھ میں کچھ ایسے طالب علم بھی تھے۔ جو بظاہر بہت خاموش نظر آتے تھے۔ مگر صاحب نظر دیکھ سکتے تھے کہ ان کی اس متانت کے پردے میں ارادت کی استواری اور طبیعت کی غیر معمولی صلاحیت چھپی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ملک عمر حیات جو آجکل اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل ہیں۔ خان بہادر شیخ فضل الٰہی جو آجکل گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے پنجاب میں کنٹرولر آف سپلائز ہیں۔ شیخ عبدالحمید جو آج کل لاہور کارپوریشن کے چیف آفیسر ہیں خان بہادر نوابزادہ امین اللہ جو آجکل نارتھ ایسٹرن ریلوے میں ڈسٹرکٹ کمرشل آفیسر ہیں۔ شیخ محمد امین ایم ایل اے (پنجاب)، محمد زماں خاں جو آجکل پوسٹ ماسٹر جنرل پنجاب ہیں۔ سید محمد علی جو بعد میں ریلوے بورڈ کے ممبر ہوئے۔ ملک غلام محمد جو آجکل حیدرآباد دکن میں وزیر مالیات ہیں" کی شخصیت ایسی وقعت اور اہمیت رکھتی ہیں کہ ان میں سے ایک ایک کے فضائل اور کمالات کا بیان جداگانہ تبصرہ اور تجزیہ چاہتا ہے مگر یہ جگہ ان تفصیلات کے لئے نہیں۔ ان عزیز القدر دوستوں کے نام اس لئے گنوائے ہیں کہ یہ تذکرہ ان کے ذکر جمیل سے

خاندان رہے۔

اولڈ بوائز کو جو اہمیت علی گڑھ کالج میں حاصل ہے۔ وہ شاید کسی دوسری درسگاہ کے اولڈ بوائز کو حاصل نہیں۔ اسی بنا پر مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی علی گڑھ میں رہتے تھے اور اسی بنا پر صاحبزادہ آفتاب احمد، مولوی عبداللہ اور مسٹر تصدق حسین شیروانی نے علی گڑھ ہی کو اپنا گھر بنا لیا تھا ان کے علاوہ اکثر اولڈ بوائز جن میں سے کچھ کالج کے ٹرسٹی بھی تھے۔ وقتاً فوقتاً علی گڑھ کالج میں آتے رہتے تھے۔ ان میں مسٹر ظفر عمر "نیلی چھتری" کے مشہور مصنف، خان بہادر مولوی ظفر حسین، سید محمد علی، سید علی حسن اور شیخ احسان الحق، جب کبھی آتے تھے۔ تو کالج کے طلبہ کی سرگرمیوں میں بڑی محبت اور شفقت سے حصّہ لیتے تھے۔

احمد بخش حجام جنھیں سرسید کے بال اور ناخن تراشنے کا فخر حاصل تھا اب بھی اپنے اصلاحی کام میں بڑی چابکدستی سے مصروف رہتے تھے جب وہ میرا خط بنانے آتے تو خط بناتے بناتے ان اولڈ بوائز کی ساری داستان حیات سنا جاتے تھے۔ سوہن لال پوسٹ مین جب کبھی کسی اولڈ بوائے کو سرسید کورٹ میں دیکھ پاتا تو اسے اس کے نام ہی سے پکارتا۔ "ظفر میاں، احسان میاں آج آپ کا کوئی خط نہیں۔ کل آئیگا۔ خدا جانے ان اولڈ بوائز کو دیکھ کر کسی پرانے زمانے میں زندگی بسر کرنے لگتا تھا یا اس کا ذہن اس حقیقت کو سمجھنے سے انکار کردیتا تھا کہ یہ اولڈ بوائز اب وہ لڑکے نہیں سوہن لال جانتا تھا۔ احمد بخش اور سوہن لال جب تک زندہ رہے علی گڑھ کالج سے وابستہ رہے۔ ان کی یہ بات کچھ ایسی ہمیشگی کی صورت اختیار کرگئی ہے کہ اب بھی ہم لوگ جب کالج میں جاتے ہیں تو سرسید کورٹ کے برآمدے میں احمد بخش کے استرہ تیز کرنے کی کھٹ کھٹ اور سوہن کے کھڑکی والے جوتے کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

علی گڑھ پہنچا تو سب سے پہلے اپنے بہنوئی دیوان سید محمد کا تعارفی خط لے کر آفتاب

وقار الملک بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ نواب وقار الملک بہادر کو خواجگانِ چشت کی بارگاہ سے بڑی عقیدت تھی۔ خط پڑھتے ہی سروقد کھڑے ہو گئے۔ مجھکو فرش پر نہیں آنکھوں پر بٹھایا۔ پہلے اپنا مہمان ٹھہرایا۔ پھر کالج میں میرے داخلہ کا خود ہی بندوبست فرمایا۔ جب تک میں علی گڑھ کالج میں رہا نواب وقار الملک بہادر نے میری نگرانی ایک مشفق سرپرست کی طرح فرمائی۔ اور میری تعلیم و تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا۔ جمعہ کی نماز سے پہلے جب وہ مسجد کے دروازے پر طلبہ کے استقبال کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو مجھے اپنا آدمی بھیج کر بلوا لیا کرتے تھے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد ولایت میں میرے بھائی حکیم امین الدین کے ہم سبق اور ہم جماعت تھے۔ بھائی کا خط لے کر جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھ سے اس طرح ملے جیسے کوئی اپنی بچھڑی ہوئی اولاد سے ملتا ہے۔ وہ مجھ سے فوراً بے تکلف ہو گئے۔ اپنے بچوں کو بلایا اور ان سے کہا "بھائی سے ملو" انہوں نے اپنے گھر کے دروازے مجھ پر اس طرح کھول دیئے گویا وہ گھر میرا گھر تھا اور اس کی تمام آسائشیں میری ہی منتظر تھیں۔ ان کے بیٹوں میں شمشاد احمد اس زمانے میں ولایت میں تھے شہزادہ احمد کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کی ہمشیرہ کے بیٹے امیر احمد اور طفیل احمد بھی آفتاب منزل ہی میں رہتے تھے۔ اس دودمانِ عالی کی مروت اور محبت کی یاد آج تک میری زندگی کا سرمایۂ نشاط ہے شہزاد احمد جو بعد میں ریاست گوالیار میں صوبے داری کے معزز عہدے پر فائز ہوئے اور خورشید احمد جو جنکل اجمیر مارواڑ کے چیف کمشنر ہیں، ایسے دوست ہیں کہ اگر ان کو اپنے جسم کی جان کہتا ہوں تو ان کی محبت کی توہین ہوتی ہے اور اگر انھیں اپنی جان کی روح کہتا ہوں تو میری محبت تسکین نہیں پاتی غرض میں جب تک علی گڑھ میں رہا اس گھر کی نوازشوں نے مجھے کبھی بھولے سے بھی یہ بات یاد نہ آنے دی کہ میں گھر سے دور ہوں، اور وطن سے باہر۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو مسلمانوں کے تعلیمی معاملات سے اس قدر شغف تھا کہ اگر اسے عشق کی دیوانگی کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ وہ ہر روز صبح کے وقت ہوا تو دو گھنٹے تک آفتاب منزل کے برآمدے میں یا لان میں ٹہلتے رہتے اور اپنے کسی نہ کسی لکچر کی تیاری کرتے۔ اکثر

مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لوگ انہیں اپنے آپ سے بڑی بلند آواز میں باتیں کرتے دیکھ کر حیران ہوگئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ باتیں نہ ہوتی تھیں۔ ان کے کسی لکچر یا خطبے کی عبارت ہوتی تھی۔ جسے وہ اس طرح ادا کرتے تھے گویا وہ اسے کسی مجمع کثیر کے سامنے ایک یگانہ انداز تخاطب سے پڑھ رہے ہیں۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ وہ سرسید کے نصب العین کے پیرو تھے۔ سرسید کی سیاسی پالیسی کوئی راز سربستہ نہیں انہوں نے کہا کہ غدر کے بعد کا سارا الزام ناحق ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ اور مسلمان جن کے سر میں ابھی تک حکومت کا خمار باقی ہے اور علماء جن کی مذہبی عصبیت اور قدامت پرستی ان کو مغربی تہذیب کی نئی روشنیوں پر چلنے سے روک رہی ہے۔ ان تمام عواقب و نتائج سے بے پروا ہیں جو حکومت کی بے اعتباری اور غداری کے الزام کے جلو میں ناگزیر ہوتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ جب تک مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری اقوام سے پیچھے ہیں۔ ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند رہیں گے اور جب تک یہ دروازے بند ہیں ان کی اقبال مندی ایک امید موہوم اور ان کے اقتدار کی بحالی ایک ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ۱۸۷۵ء میں انہوں نے ہندوستان کے مشہور نیک دل گورنر جنرل لارڈ لیٹن کی تائید و امداد سے علی گڑھ کالج کی بنا ڈالی۔ ان کی نظر میں اس وقت علی گڑھ کالج کی تاسیس کے صرف دو مقصد تھے۔ ایک تو مسلمان کے لئے جدید علوم کی ایک عظیم الشان درسگاہ کا قیام اور دوسرے اس درسگاہ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے روزی کا انتظام صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد اسی مسلک کے پیرو اور اسی نصب العین کے حامی تھے مگر مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی جن کے دل میں کانگریس کی سرگرمیاں دیکھ کر آزادی اور حریت کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے اور اس بات کے آرزو مند تھے کہ علی گڑھ کالج کی تعلیم کا اب محض یہی مقصد نہ رہے کہ وہ حکومت کے لئے اچھے ملازم تیار کرے۔ اور مسلمان نوجوانوں کی فطرت کی تعمیر اب اسی ڈھنگ پر نہ ہو کہ وہ سرکاری ملازمت ہی کو اپنی ترقیوں کی معراج سمجھیں۔ نواب وقار الملک کا مسلک ان دونوں زاویہ ہائے نگاہ کے بین بین تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج میں زمانۂ حاضرہ کے مقتضیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی دینیات کی تعلیم کا بھی کچھ ایسا بندوبست ہو جائے کہ علی گڑھ کالج کے طلبا کی فطرت خالص اسلامی

رنگ میں رنگ جائے۔ سرکاری ملازمت کے وہ مخالف نہ تھے لیکن اس مغربیت کے دشمن ضرور تھے۔ جو علی گڑھ کالج کے طلبہ کی سرشت میں رفتہ رفتہ رچ رہی تھی۔ اور اس صاحبیت کو بنظر پسندیدگی نہ دیکھتے تھے جو علی گڑھ کالج کے اُن فارغ التحصیل طلبہ میں نظر آتی تھی جو محض علی گڑھ کالج میں تعلیم پانے کی بدولت بڑے بڑے سرکاری عہدوں پہ فائز ہو گئے تھے۔ ان کو حریت اور آزادی کے جذبے سے بھی نفرت تھی مگر وہ اس رجحان اور میلان کے شدید مخالف تھے۔ جو مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی کو کانگریس کی طرف لے جارہا تھا۔ جب تک وہ علی گڑھ کالج میں برسر اقتدار رہے انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اسی طرف مبذول رکھی کہ علی گڑھ کالج کے طلبہ کی فطرت پر مغربی دہریت اور نیچریت کا رنگ نہ جمنے پائے۔ ان کی زندگی اخلاقِ اسلامی کا عکس ہو۔ اور ان کا ظاہر و باطن ہندوستان کی پرانی تہذیب کا پرتو۔

مختلف نظریات کی اس تمام کشمکش میں علی گڑھ کالج کے طلبہ کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی نئی تہذیب کی چکاچوند سے ان کی آنکھیں خیرہ، مادیت کی انا دیت سے ان کے قلب مسحور اور مذہب کے تصنع اور عبادت کے تکلف سے ان کی روح بیزار تھی۔ غرض اس تمام ذہنی جدوجہد کا وہی نتیجہ ہوا جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ فطرت انسانی نہ کبھی کسی دستور و آئین کی پابند رہی ہے نہ رہے گی۔ ہر انسان کی طبیعت کی افتاد اس کے انفرادی ماحول کا نتیجہ، اُس کے عنصری تقاضات کا ثمرہ اور اس کی ذاتی استعداد اور صلاحیت کا حاصل ہوا کرتی ہے اور پھر یہی طبیعت کی افتاد اس کی تقدیر کی معمار اور اس کے مستقبل کی مصور بن جاتی ہے،

حاصل کلام یہ ہے کہ ہم میں سے بعض طلباء کچھ تو اپنی فطرت کے تقاضے سے اور کچھ نواب وقار الملک بہادر کی مثال کی تقلید کی بدولت اور بعض محض ان کی نظر میں قبولیت حاصل کرنے کی غرض سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔

ہم میں سے چند طلبہ ایسے بھی نکل آئے جو مولانا شوکت علی اور مسٹر محمد علی کا جی خوش کرنے کے لئے کانگریس کے ہیروں کا سا لباس پہننے لگے۔ اور طرح طرح کے ترامے شن

سُن کر سر دُھننے لگے۔ کسی کو مجھ سے اختلاف ہو یا اتفاق۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ اس زمانے میں ڈاکٹر ضیاءالدین احمد نے علی گڑھ کالج کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بیرونی رسوخ اور اپنے اندرونی اثر سے کام لے کر انہوں نے علی گڑھ کالج کے طلبہ کی ایک ایسی منظم جماعت قائم کی۔ جو ان دونوں قسم کی یورشوں کے سدّباب کے سلسلے میں علی گڑھ کالج کی سپر بن گئی۔ اِس جماعت کے طلبہ اس زمانے میں خوشامدی، غدار، غلام، حکومت پرست، نیچری، دہریئے اور نہ معلوم کن کن ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ مگر علی گڑھ کالج کی تاریخ شاہد ہے کہ اگر یہ لوگ اس وقت چھاتی پر پتھر رکھ کر سرسید کی اس عظیم الشان امانت کو جس کا نام علی گڑھ کالج ہے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کرتے تو علی گڑھ کالج یا تو دیوبند کے مدرسہ دینیات کی ایک شاخ بن جاتا یا شانتی نکیتن کا ایک اسلامی شعبہ۔

میں نسٹ ایر کے امتحان میں اپنی جماعت میں اوّل رہا اور جوبلی اسکالرشپ کے شرف سے مشرف ہوا۔ خان بہادر چودھری خوشی محمد اور خان بہادر ملک زمان مہدی کے بعد میں تیسرا پنجابی تھا۔ جسے یہ اعزاز نصیب ہوا۔

اِس زمانے میں بہت سی مجلسی تحریکوں اور جغرافیائی زاویۂ پسندیوں کے ردِّ عمل کے طور پر علی گڑھ کالج میں پنجاب اور یو پی کے طلبہ کے درمیان بہت سی بدگمانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان بدگمانیوں نے آخر کار کھلی مخاصمت اور عملی مخالفت کا روپ دھار لیا   یہ میں نے اس لئے کہا ہے کہ یہ مخاصمت اور مخالفت حقیقت میں محض چند فتنہ پرداز، کج نگاہ اور کج باطن لوگوں کا بنایا ہوا ڈھونگ تھا۔ چنانچہ کچھ پنجابی اور یو پی کے طلبہ نے یہ ڈھونگ دیکھا تو آتے ہی سچ مچ اپنے اپنے دشمن کا قلعہ سمجھنے لگے۔ جس کو مسمار کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے کے دشمن نظر آنے کی کوشش کرتے تھے ملک عبدالقیوم ایک پنجابی طالب علم کی وائس پریسیڈنٹی کا معاملہ ایک چنگاری بن گیا۔ جس نے علی گڑھ کالج کی زندگی کے خرمن عافیت میں آگ لگا دی۔ یو پی کے طلبہ نے خود غرض امیدواروں کی اکساہٹ سے عبدالقیوم کی مخالفت محض اس بنا پر کرنی شروع کر دی کہ وہ

پنجابی تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی پنجابی طلبہ نے بھی یوپی کے امیدوار کی مخالفت شروع کردی۔ یہ ایک لمبا اور دردناک قصہ ہے مگر اس آڑے وقت بھی ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد کی دانائی اور ژرف شناسی کام آئی۔ انہوں نے جونیر سٹوڈنٹس یونین کے نام سے ایف۔ اے۔ کے طالب علموں کی ایک جماعت مرتب کی۔ جو سینیر سٹوڈنٹس کے پھیلائے ہوئے اس زہر سے اُن نوواردوں کو محفوظ رکھے۔ میں اس یونین کا وائس پریذیڈنٹ مقرر ہوا۔

الیکشن میں ملک عبدالقیوم کامیاب ہو گئے۔ کچھ دنوں تک شکوہ شکایت کا بازار گرم رہا۔ آخر پرانے دوستوں اور ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والوں کی محبت کی آنکھیں کھل گئیں۔ فتنہ پردازوں نے جو بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا رکھا تھا۔ آن کی آن میں گر گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں یوپی اور پنجاب کے طلبہ آپس میں بغل گیر ہو کر داغ کا یہ شعر اور مصرع پڑھتے تھے ع۔

"بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر"

مدت تک کالج کے در و دیوار اس مصرعے کی بازگشت سے گونجتے رہے۔

یہ بات کچھ موزوں نظر نہیں آتی کہ علی گڑھ کالج کا ذکر تفصیل سے ہو اور صرف متین اور سنجیدہ موضوعات ہی پر اکتفا کیا جائے۔ علی گڑھ کالج کی زندگی کا وہ لطیف پہلو جس کا تعلق طلبہ کے باہمی ارتباط سے ہے وہ حسین اور دلفریب منظر ہے جس کی یاد بادۂ دوشینہ کا خمار ہے اور بہار رفتہ کا سرور۔ اس لئے اگر اس دور شباب کی مختصر داستان بیان بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔

مجھے علی گڑھ لے جانے کے سلسلے میں جو لوگ محرک ہوئے۔ ان میں میرے دو پرانے دوست خواجہ فیروزالدین اور حسن محمد حیات پیش پیش تھے۔ خواجہ فیروزالدین خواجہ رحیم بخش کے صاحبزادے ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ وہ اب لاہور میں قانون کی پریکٹس کرتے ہیں اور ان کا شمار پنجاب کے مشہور اور بہت کامیاب بیرسٹروں میں ہوتا ہے۔ حسن محمد حیات میرے بھائی کے ایک بہت ہی عزیز دوست مولوی عبدالغنی سے پنشن لے کر جا چکے ہیں اور آج کل بھوپال کی لیجسلیٹو کونسل

کے سکریٹری میں حب علی گڑھ گیا تو شروع شروع میں انہیں دونوں دوستوں کی وساطت سے کالج کے نام ہر آوردہ طلبہ سے متعارف ہوا۔ جب تک میں کالج میں رہا یہ دونوں دوست میرے ہم جلیس اور ہمدم رہے۔ ان دو مخلص اور عزیز دوستوں کے علاوہ ملک عبدالقیوم بیرسٹر ایٹ لا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور حال تک پنجاب یونیورسٹی کے لاء کالج کے وائس پرنسپل ہیں۔ علی گڑھ کے قیام میں میرے لئے بڑی آسودگی اور خوش حالی کا وسیلہ بنے رہے۔ خواجہ فیروز دین، ملک عبدالقیوم اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے جب عبدالقیوم ولایت چلے گئے تو ممتاز حسن خاں ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ اس بہانے سے ممتاز حسن کا تعارف جن مسرت انگیز اور کیف پرور تعلقات کا ذریعہ بنا۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔ اس لڑکپن کے زمانے میں میرے ان دوستوں نے جس نگہداشت، جس محبت اور سچی غمگساری کے ساتھ میری خبر گیری کی۔ اس کی تفصیل معرض بیان نہیں ہو سکتی ایسا معلوم ہوتا ہے اس عالم غربت میں ایک یتیم بچے کی سرپرستی کے لئے خدا نے یہ رحمت کے فرشتے بھیج دیے تھے۔ حسن محمد حیات، خواجہ فیروزالدین اور ملک عبدالقیوم نے بڑے بھائیوں کی طرح میری حفاظت کی اور میں ایسی بلاؤں سے محفوظ رہا جو اکثر نو عمر اور ناتجربہ کار طلبہ کے سر پر منڈلاتی رہتی ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کپتان احمد علی کے ماموں جو آگرے میں طبابت کرتے تھے اپنے بھانجے سے ملنے علی گڑھ آئے۔ ہم لوگوں نے ان کی طبابت کی شہرت سنی تو اپنے اپنے دکھ درد کی کہانی لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مجھے یہ شوق تھا کہ میری قوت حافظہ اس قدر تیز ہو جائے کہ جو کچھ پڑھوں، ازبر رہے۔ جب میں نے ان سے یہ اچھوتے شوق بیان کیا تو انہوں نے میرے لئے ایک شربت تجویز فرمایا۔ جس کا جزو غالب میرا گمان ہے اور شربت کے رنگ سے پتہ چل سکتا تھا شاید زعفران تھا۔ اس شربت کی تیاری پر کوئی دس روپے اٹھے۔ دس روپے طالب علمی کے زمانے میں قارون کی دولت کی حیثیت رکھتے تھے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اس شربت کے استعمال کے ساتھ میری قوت حافظہ کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں میں نے یہ شربت بڑی کفایت اور نگہداشت سے پینا شروع کیا۔ شفقت جو اپنے وقت کے مشہور بولر اور کرکٹ کے کھلاڑی

تھے۔ ان ہی دنوں میں آل انڈیا کرکٹ ٹیم کا میچ کھیل کر انگلستان سے واپس آئے تھے وہ اگرچہ مجھ سے کوئی بیس برس بڑے تھے لیکن خوبی قسمت سے میرے کلاس فیلو تھے۔ اس لئے نہیں کہ انہوں نے دیر سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ انھوں نے بیس برس تک ایف اے کا امتحان کبھی پاس کر کے ہی نہیں دیا۔ انہوں نے جب اس شربت کے خواص کا چرچا سنا تو بن دیکھے اس پہ مٹے۔ اور سمجھے کہ یہی اکسیر ان کی قوت حافظہ کا علاج ہے۔ جس کی توانائی وہ امتحان کے اکھاڑے میں کئی بار آزما چکے تھے۔ ایک دن میرے کمرے میں تشریف لائے اور مجھ سے اس شربت کے متعلق پوچھا میں ان کی نیت سے واقف نہ تھا۔ شربت کی تعریف کر بیٹھا انہوں نے اسے دیکھنے پر اصرار کیا جب شربت کا زعفرانی رنگ دیکھا تو اس پر سوجان سے نثار ہو گئے۔ فرمایا" ذرا ہم بھی اس کے دو ایک گھونٹ پیئیں" میں نے عرض کی " بسم اللہ" شربت پیا تو کہنے لگے " سبحان اللہ یہ تو بڑے مزے کی چیز ہے اگر اس کا فائدہ بھی ایسا ہی ہے۔ جیسا اس کا مزا ہے تو کیا کہنے۔ خیر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں اور وہ دونوں اکٹھے اینشنٹ ہسٹری کی کلاس میں جایا کرتے تھے۔ اینشانٹ ہسٹری کو وہ انٹ سنٹ ہسٹری کہتے تھے۔ اس لئے اس کی طرف کچھ زیادہ راغب نہ تھے۔ صرف حاضری لگوا کر کلاس سے باہر چلے آیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کی عمر اکثر پروفیسروں کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے ان سے کوئی کچھ نہ کہتا تھا۔ میں اب جو شربت پیتا تو ہر روز یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا کہ بوتل بڑی سرعت سے خالی ہوتی چلی جا رہی ہے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس وقت جب میں اینشنٹ ہسٹری کی کلاس میں ہوتا تھا تو بھائی شفقت میرے کمرے میں آ کر اپنی قوت حافظہ کو تیز کرنے کا سامان کیا کرتے تھے۔ اب میں حیران تھا کہ اس متاعِ نایاب کو جو کسی امیر زادے کی دولت کی طرح یار لوگوں کے ہاتھوں یوں رائیگاں لٹ رہی تھی۔ اس دست برد سے کیسے بچاؤں۔ آخر ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ کالج کے ہسپتال کے ڈاکٹر شفاعت اللہ خاں مجھ پر بہت مہربانی کرتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کونین کے باقاعدہ استعمال کے ارادے کا اظہار کیا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑے اور دس گرین روزانہ کے حساب سے دس دن کی خوراک سو گرین کونین میرے حوالے کر دی

کمرے میں واپس آتے ہی میں نے وہ موگرین کرین پڑیا شربت کی بوتل میں اُلٹ دی۔ اور اُسے ہلا کر طاق میں رکھ دیا۔ اب جو دوسرے دن میں کالج سے اپنے کمرے میں آتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شفقت میرے بستر پر پڑے زور زور سے کراہ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور ان کا ہاتھ ہے کہ سینے پر اوپر نیچے برابر حرکت کئے جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا "خیر تو ہے؟" کہنے لگے تمہارا شربت پرانا ہو کر زہریلا ہو گیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ فرمانے لگے۔ آج اس کا مزا ہی کچھ بدلا ہوا ہے۔ زہر کی طرح کڑوا ہے۔ دو گھونٹ کیا پئے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ حلق میں انگارے رکھے ہیں جب میں نے ان سے کہا "کہ آپ ان دو گھونٹوں میں کم از کم پچاس گرین کوئین نوش فرما گئے ہیں"۔ تو وہ سر پیٹ کر رہ گئے اور فرمانے لگے "ارے بے وقوف دو چار ہی روز میں تو میری شادی ہونے والی ہے اور کوئین کا تم جانتے ہی ہو اعصاب پر کیا اثر ہوتا ہے۔

بنگال کے ایک مشہور خاندان کے نورِ نظر سید شمس الہدیٰ ہمارے ساتھ پڑھتے تھے وہ اتنے سیدھے سادے نہ تھے۔ جتنے نظر آتے تھے۔ دولت کا لالچ ان کو اس درجہ تھا کہ وہ ہمیشہ اسی دُھن میں رہتے کہ کسی نہ کسی طرح بے شمار دولت ان کے ہاتھ لگ جائے۔ ان کی اس کمزوری کا پتا کیسے ظہیر شمسی کو چل گیا کہ گرمی کی چھٹیوں میں ظہیر شمسی اپنے والد کے پاس شملے چلے جایا کرتے تھے اب کے ظہیر چھٹیوں سے کچھ روز پہلے ہی شملے چلے گئے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ میں کپتان احمد علی کے کمرے کی طرف جا نکلا۔ ان کے کمرے کے سامنے اکثر ان کے دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ مگر آج اس جمگھٹے کے انہماک کی کچھ اور ہی شان تھی تپائی پر ایک اخبار رکھا تھا جسے شمس الہدیٰ بڑے غور سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے اردگرد احمد علی، حیات، فیروزالدین، حسن شاہ، محمود حسین کاظمی، احمر اور مقبول حسن ایسے بیٹھے تھے جیسے کوئی آرمی ہیڈ کوارٹر میں ملٹری اسٹاف کے افسر آئندہ جنگ کے نقشے پر غور کر رہے ہوں۔ میں ذرا ہٹ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں شمس الہدیٰ اس طرح چلا اُٹھے جس طرح

کوئی نیند سے چونک کر بڑبڑانے لگتا ہے" آخر شالا بیار کی قسمت بھی جاگا؟" احمد علی نے اپنے مخصوص انداز میں ہونٹوں میں مسکرا کر کہا "اس میں کیا شک ہے" ادھر سے مقصود حسین نے تائید کی "اب تو رادی چین ہی چین لکھتا ہے" شمس الہدیٰ نے پھر کچھ سوچ کر کہا "مگر یہ شالا کے فوٹو کا بات ٹھیک نہیں" مقبول حسن پوچھنے لگے "کیوں" شمس الہدیٰ نے جواب دیا "ارے ہم شالا کالا ہے" احمد علی نے بڑے استعجاب سے پوچھا "آپ کالے ہیں" اور پھر خود ہی جواب دیا "آپ تو سانولے ہیں سانولے" مقبول حسن زور سے چلا اٹھے "سانولے سلونے" شمس الہدیٰ نے جواب دیا "مگر شالا بیار رنگ فوٹو میں ہمیشہ کالا ہی آتا ہے" حیات بولے "اس کا انتظام ہو جائے گا"

میں حیران تھا۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ ذرا بڑھ کر چپکے سے حیات سے پوچھا تو انہوں نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ اشتہاروں کے کالم میں ایک اشتہار تھا جس کے اردگرد سرخ نیلی پنسل سے اتنے خط کھینچے ہوئے تھے کہ اچھا خاصا چوکھٹا بن گیا تھا۔ اشتہار کسی کریم بھائی۔ ابراہیم بھائی کی طرف سے تھا اور اس کی عبارت کچھ اس مضمون کی تھی۔

"بمبئی کے ایک متمول تاجر کی اکلوتی بیٹی کے لیے کسی شریف مسلمان خاندان کے خوبصورت، پڑھے لکھے اور نوجوان صاحبزادے سے رشتے کی ضرورت ہے لڑکی اپنے باپ کے کاروبار کی مختار اور ان کے جزوکل کی مالک ہے۔ سرسری اندازے کے مطابق وہ کوئی پچاس لاکھ روپے کی جائداد کی وارث ہوگی۔ درخواست کے ساتھ فوٹو کا بھیجنا ضروری ہے"

ایک بار پھر جو پڑھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہ کریم بھائی ابراہیم بھائی۔ دو زکا تیج شہر میں رہتے ہیں۔ دماغ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ادراک و فہم کی بہت سی منزلیں طے کر گیا اتنے میں چاروں طرف سے تجویزیں پیش ہونے لگیں۔

"تصویر اگر گھر میں کھینچیں تو زیادہ مناسب ہے"

"جی نہیں۔ آغا حیدر کے والد ایسی تصویر کھینچتے ہیں کہ مانی و بہزاد کو مات کر دیتے ہیں۔

"ارے تصویر کو مارو گولی۔ پہلے درخواست کا مضمون تو لکھو۔"

"میری رائے میں اگر سیٹھ کریم بھائی کو پہلے علی گڑھ بلالیا جائے اور اُن کی خوب خاطر مدارات کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ درخواستیں تو بے شمار آئیں گی"

"ارے بھئی! پچاس لاکھ کی جائداد کا معاملہ ہے۔"

اتنے میں شفقت تولیئے سے منہ پونچھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے اور ایک انداز تبختر سے فرمانے لگے۔ "پچاس لاکھ روپے! ——— ارے بھئی ان کمپنی والوں کے تو جہاز چلتے ہیں ہم جس جہاز میں ولایت گئے تھے کیا عجب ہے کہ یہ انھیں سیٹھ صاحب کا ہو۔ ظالم نے سارا جہاز ہمارے حوالے کردیا اور لطف یہ ہے کہ کوڑی کمایہ کی نہ لی۔

شمس الہدیٰ کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہونے والے خسر کے جہاز میں بیٹھے بحر اوقیانوس کی سیاحت فرما رہے ہیں۔ آخر یہ قرار پایا کہ ادھر تو درخواست اور فوٹو بھیجا جائے۔ اُدھر سیٹھ کریم بھائی کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی جائے۔ اس کے بعد سیٹھ کریم بھائی کی خاطر مدارات کی تفصیلات پر بحث ہوئی۔ اور یہ فیصلہ ہوا کہ انھیں شہر میں مولوی حمیدالدین کے ہوٹل میں ٹھہرایا جائے اور چونکہ یہ بات مناسب نہیں کہ ایسا عالی قدر مہمان تنہا کھانا کھایا کرے اس لئے شمس الہدیٰ کے سب دوست دونوں وقت ان کے ساتھ طعام میں شریک ہوا کریں۔ مقبول حسن نے یہ تجویز بھی کی کہ جب سیٹھ کریم بھائی واپس شملے جائیں شمس الہدیٰ اپنی بیوی کے لئے کوئی تحفہ ضرور بھیجیں۔ اس پر شمس الہدیٰ بول اُٹھے "شالا ابھی سے بیوی" اس پر سب بول اُٹھے "دریں چہ شک" تحفے کی نوعیت کے بارے میں شمس الہدیٰ کو مقبول حسن کی یہ بات بہت پسند آئی کہ فی الحال ایک درجن ریشمی رومال بھیج دیئے جائیں۔

چار پانچ دن کے بعد روز کا تیج شملے سے شمس الہدیٰ کو اُن کے دعوت نامے کا جواب وصول ہوگیا۔ سیٹھ کریم بھائی اگلے ہی روز علی گڑھ پہونچ رہے تھے۔ شمس الہدیٰ کے احباب

کی اس دن کی سرگرمیاں منبط تحریر میں نہیں آسکتیں۔ دوسرے دن سیٹھ کریم بھائی ایک شکرم میں بیٹھے سرسید کورٹ کے دروازے پر پہونچ گئے اور ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ شکرم کی چھت پر ان تمام بکسوں، سوٹ کیسوں، پورٹ مینٹوؤں، اور ہولڈ الوں سے لدی ہوئی تھی۔ جو شلفت اپنے ہمراہ ولایت سے لائے تھے۔ سیٹھ کریم بھائی پہ جو نظر پڑی تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی مولوی حمید الدین ہوسٹل والے سیٹھوں کا لباس پہنے ایک بڑی سی گول عینک لگائے ہاتھ میں چھڑی اور چھتری تھامے سیٹھ کریم بھائی ابراہیم بھائی بنے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ ہم لوگوں نے تین دن تک شمس الہدیٰ کے خرچ پر طرح طرح کے کھانے کھائے اور جب شمس الہدیٰ کی بیوی کے تحفہ کی تقسیم ہوئی تو ایک ایک ریشمی رومال سب کے حصے میں آیا۔ سیٹھ کریم بھائی کے واپس جانے کے بعد شمس الہدیٰ بہت دن تک دولت کے خواب دیکھتے رہے اور اپنی درخواست کے جواب کے منتظر رہے۔ شاید یہ بھانڈا کبھی نہ پھوٹتا مگر ان ریشمی رومالوں نے جو حسن شاہ، فیروز دین، اور مقبول حسن جیبوں سے لٹکائے پھرتے تھے۔ چغلی کھائی۔ بیچارہ شمس الہدیٰ اب بھی کچھ نہ سمجھا مگر اس کے بنگالی دوستوں نے تمام واقعے کی روئیداد پرنسپل صاحب تک پہنچا دی۔ وہاں سے یہ معاملہ نواب وقار الملک تک پہونچا اور اس ناٹک کے چیف کیریکٹر بہت دن تک ان کی نظر میں معتوب رہے۔

آہ اب وہ زمانہ کہاں۔ مگر اس کی یاد ہے کہ آج تک باقی ہے۔

خلیدن ہائے نشتر ہا براستخوان غالب

پس از مدت بہ یادم داد لذت ہائے مژگاں را

"قوموں کی زندگی تحریکوں سے ہے تحریکیں ہیں تو قومیں بھی زندہ ہیں وہ زندگی کے تقاضوں کو سمجھتی اور ان کے پیش نظر مختلف سمتوں میں قدم اٹھاتی ہیں یوں ان کے مستقبل کا رخ متعین ہو جاتا ہے۔ تحریکیں گویا وہ اقدامات ہیں جو زندگی کی پیش رو حرکت کے باعث ناگزیر ہو جاتے ہیں"

(اقبال)

ریڈیکل

کچی بارک

مثل مشہور ہے کہ "جھونپڑوں میں رہنا اور خواب محلوں کے"۔ چنانچہ رہتے تو ہیں کچی بارک
میں مگر کہیں گے یہی کہ ہم ایس ایم کورٹ میں رہتے ہیں کیونکہ کچی بارک کا لفظ زبان پر لانا کسر
شان اور ذاتی ہتک خیال کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ جن کمروں کے مجموعوں کے لئے یہ لفظ استعمال
کیا جاتا ہے وہ حقیقتاً ہر طرح سے آن عمارات کے ہم پلہ اور برابر ہیں جن میں کرلین کے سپاہی یا
باڈی گارڈ کے جوان پہرا دیا کرتے ہیں اور بابو گڑھ کے ان اصطبلوں سے جن میں گھوڑے آرام
کیا کرتے ہیں کسی طرح کم نہیں ہو سکتے چنانچہ اثبات تشبیہ کے لئے جہاں کچی بارک کا کچا نقشہ نگاہ
کے سامنے آیا فوراً شک دور اور شبہہ کافور ہوا اور پیر ہوائی منزل پر چڑھتے ہی مغرب کے سمت
ذرا نظر اٹھائی تو اول کھپریل نظر آئی جو کہیں سے سرخ اور کہیں سے زمردی ہے گویا کہ اس میں
بھی کوئی خاص کاریگری ہے پھر کمروں کے سامنے نیم کے درختوں کی ایک قطار ہے جس سے بارک
میں عجیب رونق اور بہار ہے ذرا اور نیچے نگاہ دوڑائیے تو تین پگڈنڈیاں یاد دکھائی دیں گی جن کو
اگر کچی بارک کی گرینڈ ٹرنک روڈز ۔۔۔۔۔۔ کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ اس میں کوئی مبالغہ
نہیں بلکہ کچی بارک کا میدان انہیں سے سجا ہے "مرلی منزل" کے سامنے جس کو اصطلاح کالج
میں جیتا آرٹس کہتے ہیں، ان پگڈنڈیوں کا اتصال ہوتا ہے جہاں پر علی الصباح طلباء کا

ایک انبوہ کثیر اور جم غفیر نظر آتا ہے اور اکثر اصحاب لوٹا یعنی بدھنا ہاتھ میں لیے اس کے سامنے پیچ و تاب کھاتے ہیں کیونکہ تمام ڈبلیاں پُر ہوتیں اور امیدواروں کی زبان سے "کوئی . . . خالی نہیں" کی صدا گشت لگاتی ہے۔ یہی سبب ہے جس سے باہر کھڑے رہنے والوں کو ایک گونہ بے قراری اور اضطراب ہوتا ہے۔ یہ بیچارے مجبوری اور بیکسی کی صورت بنائے اِدھر اُدھر ٹہلتے رہتے ہیں کبھی تو فرش پر پاؤں مارتے ہیں اور کبھی بیت الخلا کی دیواروں کو کھٹ کھٹاتے ہیں اور ڈبلیوں کے خالی ہوتے ہی مصیبت زدہ امیدوار نمبروار داخل ہونے لگتے ہیں وہ بھی مسلسل۔

برسات کے موسم کا سین بھی قابل تحسین ہوتا ہے۔ کچی بارک کا صحن جو بفضلہ تعالیٰ کسی قدر نشیب میں واقع ہوا ہے بارش ہونے پہ پانی سے لبالب بھر جاتا ہے اور برسات کی خورد مخلوق یعنی مینڈک بھی ساتھ ساتھ آ ٹپکتے اور جگہ بجگہ اس صوبائی جھیل میں جو نفاست و وسعت میں سانبھر جھیل سے مقابلہ کرتی ہے جابجا کدکڑے اور غوطے لگاتے نظر آتے ہیں۔ اور بہ ہنگام شب یعنی رات کے وقت عجیب و غریب نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ اُن کی غیں غیں کی آواز سے ناک میں دم آ جاتا ہے اور شب کا آرام حرام ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں . . . . بارش کے دنوں میں ایک اور منظر بھی قابل دید ہوتا ہے یعنی کچی بارک کا میدان آب باراں سے لبریز ہوتا ہے اور یہاں کے باشندوں کو "مرلی منزل" جانے کی ضرورت نہیں بیش ہوتی ہے تو بیچارے مصیبت کے مارے ایک ہاتھ میں تو لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں کسی مہذب . . . . . کی طرح پاجامے کے پائنچے اوپر اٹھائے اور شانۂ مبارک پہ چھتری لگائے شڑ پڑ کرتے چلے جاتے ہیں اور نہایت ہی ناپ تول کر قدم رکھتے ہیں کہ کہیں پاؤں پھسلتے ہی بیچارے نیچے نہ آ گئے اور دیگر حضرات ان کی عزت تہقہہ لگائیں۔

خیر اب اس سے بھی زیادہ پُر لطف اور قابل رحم حالت ملاحظہ ہو۔

جس وقت اندھیرا گھپ ہوتا ہے اور ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا عالم چھا جاتا ہے اور اس سرے سے اس سرے تک جملہ اصحاب اپنی اپنی چارپائیوں پر ایک قطار میں ہاتھ پاؤں پھیلائے بے خبر سوتے ہیں اور باران رحمت کا بارگی نزول ہوتا ہے تو چارپائیاں کھٹا کھٹ برآمدے میں داخل ہو جاتی

ہیں لیکن جب بارش کی بوچھار یہاں بھی چین نہیں لینے دیتی تو دفعتاً کمروں میں جاگھستی ہیں۔ اب لیمپ روشن ہوا مگر موسلا دھار مینہ یہاں بھی کھپریل میں چھن چھن کر آنے لگا۔ ایک کونے سے آواز آئی "ٹپ ٹپ" دوسرے گوشے میں چارپائی سرکائی تو وہاں بھی پانی کے چھینٹے آنے لگے اب بکس وغیرہ ہٹا کر میز پہ رکھا اور پلنگ بیچ میں کیا! "لیجئے وہ میز پر بھی دھار پڑنے لگی" ! (الٰہی یہ کیا آفت!) وہاں سے سب چیزیں الگ کیں اور پلنگ پر رکھ کر خود چھاتہ لگا کر بیٹھ گئے۔ گویا چوڑیا لے کے اسٹیشن پر مال گودام کی حفاظت کر رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے رات کٹی صبح ہوئی، دماغ کو تقویت اور دل کو تسکین ہوئی۔ مینہ تھا تو تھا مگر "کھنگڑ" کو جا بے مقررہ پر آراستہ کیا اور شب کے مارے تھکے ذرا دیر کو سو گئے۔ کوئی پکا قطعہ ہے تو کہتے ہیں ؎

بھائی چھیڑو نہ ہمیں رہنے دو کمرے میں پڑا
ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را

سورج نکلا اور دن چڑھا تو کوئی پائچے چڑھائے ننگے سر پھر رہا ہے اور کوئی بیچارہ جس نے رات کو زیادہ مصیبت اٹھائی تھی لکھنؤ کی روئی دار واسکٹ پہنے پھٹے بانس کی طرح بول رہا ہے کوئی کہتا ہے کہ "کھانے کی ٹلی بج گئی جلدی ڈائننگ ہال" غرضیکہ مختلف آوازیں اور طرح طرح کے لباس یعنی لنگیاں۔ شرعی اور پنجابی پاجامے نظر آتے ہیں مگر ڈائننگ ہال جانے کی ہمت کہاں بسکٹ وسکٹ کھائے اور پیٹ بھر لیا۔ اللہ اللہ خیر صلاح! جانے کی مصیبت سے چھوٹے۔

اب ہم ناظرین کی ظرافت طبع کے لئے کسی ایک کمرہ کا فوٹو کھینچتے ہیں۔ یوں تو یہاں کے اکثر کمرے رشکِ فردوس بریں اور نگار خانۂ چین بنے ہوئے ہیں۔ مگر بعض کمرے بالکل مختلف ہیں جو رشک مسافر خانہ اور . . . . سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ آئیے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم تو ایک چارپائی پہ بیٹھے ہیں جو ایک گوشہ میں بچھی ہوئی ذرا سی بوجھ سے چوں چوں کرتی ہے اور آپ اس "یکتا کرسی پہ تشریف رکھئے جس کا پشتہ ندارد ہے" سب سے پہلے ہماری نظر اس میز پہ پڑتی ہے جو ایک کونے میں کھڑی ہوئی ہندو سوئے کی طرح ہل رہی ہے، یا کسی مریض کے مانند لڑکھڑا رہی

ہے میز کے اوپر ایک دقیانوسی لیمپ رکھا ہوا ہے جو غالباً اس وقت کا ہے جب کہ مسٹر ٹوٹے صاحب ایل ایم پی لے تاریکی میں اندھیرا کرنے والے لیمپ ایجاد کرگئے تھے اور ہمارے دوست کے اجداد میں سے خدا اُن کی مغفرت کرے کسی نے اس کو عجوبہ آباد سے خرید لیا تھا اب وہ ہمارے دوست کو ترکۂ پدری میں ہاتھ آیا ہے اور رات کو اچھا خاصا کام دیتا ہے۔ ذرا آپ کا ٹرنک بھی ملاحظہ ہو جو اوپر سے پچکا ہوا ہے اور جس کا روغن تمازت آفتاب کے باعث کہیں کہیں سے بالکل اُڑ گیا ہے۔ مگر یہ الفاظ کہ "میڈان افریقہ" یعنی افریقہ کی ساخت پورے طور پر نظر آتے ہیں۔ ہاں لیجیئے ذرا حقہ بھی ملاحظہ ہو جو آپ کے روم نیلو (خدا ان پر اپنی رحمت کی بارش کرے۔ ایک طرف کو بیٹھے چپ چاپ اور خفیہ خفیہ گڑ گڑا رہے ہیں۔

غالباً اب اس بیان سے آپ کی طبیعت سیر ہو گئی ہو گی۔ لہذا اب ہم بھی "عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" پر کار بند ہو کر کچی بارک اور خصوصاً حقہ عزلی کی خصوصیات اور توتیں درج کرتے ہیں جس سے ناظرین کو معلوم ہو جائے گا کہ گدڑی میں لعل بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ لیجیئے ذرا سنیئے!

(۱) کچی بارک کا کرایہ دیگر دار الاقامہ کی بہ نسبت کم۔ شور کم۔ غل کم طریقہ رہائش بالکل سادہ اور فیشن کی پابندی معدوم۔

(۲) یہ بارک ہمیشہ کالج کے قابل ترین طلبا کا مسکن رہی۔ مسٹر ان محمد علی ایڈیٹر "ہمدرد" ظفر علی خاں محرر خصوصی اخبار "زمیندار" ملک پنجاب۔ اور مولوی محبوب عالم صاحب ایم اے مدیر مسئول اخبار "الہلال" یہیں قیام رکھتے تھے۔

(۳) یہاں کے طلبا بالعموم ایف اے اور بی اے۔ کے امتحان میں فسٹ آتے ہیں مثال کے طور پر مسٹر عبدالغنی انصاری۔ مرزا جلیل القدر صاحب۔ کالج کے جونیر اور سینیر اسکالر بھی یہیں کے ہوتے ہیں جن کی مثالیں اب بھی موجود ہیں۔

کھیل کود میں بھی یہاں کے باشندے ہمیشہ ممتاز رہتے ہیں۔ چنانچہ اس سال بھی اس فن

میں سب سے زیادہ تمغے اولمپک اور عربی حصہ نے حاصل کئے ہیں۔

(۵) سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہاں پر کوئی کسی کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ نہ لکھنے میں نہ پڑھنے میں۔ نہ بیماری میں نہ تیمارداری میں۔ ان امور کے لحاظ سے اگر ہم کچی بارک کو کچی فردوس کہیں تو بجا ہے کیوں کہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

جس کسی نے کچی بارک (سید محمود کورٹ) دیکھا نہ ہو وہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ کچی بارک کیا چیز تھی! کوئی عمارت تھی، عبادت تھی یا علامت! واقعہ یہ ہے کہ وہ یہ تینوں تھی۔ اس زمانے کی کچی بارک کی صبح و شام اور زمین و آسمان کا خیال کرتا ہوں تو تصور میں ریگستان کا وہ منظر آجاتا ہے جہاں خضرِ راہ میں اقبال نے کہا ہے ؎

ریگ کے تودے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

یا

وہ خضرِ بے برگ و ساماں وہ سفرِ بے سنگ و میل

پھر کچھ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ایک طور پر ملّتِ مصطفوی کا اس جہان میں یہی نقشہ ابدی نوید ہے! وہی بدویوں کا سا حال جو رکھتا ان کا ہر طرح کی سختی جھیلیں گے لیکن اسے فرزی بہا تریں گے تو ہم حصے لی بڑی نعمت کا حق ہر چھوٹے بڑے کا حق ادا کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

ڈاکٹر ذاکر حسین

چشمۂ حیات کی یاد میں

مجھے میر کا وہ شعر یاد آرہا ہے جسے مطابق حال بنانے کے لئے دوسرے مصرعہ کو ذرا لگاڑنا پڑتا ہے۔

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

یہ کیسے کہوں "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" کہ گل تو خوب جانتا ہے اس لئے یوں کہوں گا۔

گل بھی خوب ہی جانے ہے ہم کو باغ بھی سارا جانے ہے۔

پھر بھی جی چاہتا ہے کہ میں اس دانش گاہ سے اور اپنے تعلق کو جس طرح محسوس کرتا ہوں اس کا کچھ ذکر آپ سے کروں۔

میرا دھیان اس وقت ۴۴ برس پیچھے کی اس گرم دوپہر کی طرف دوڑ دوڑ کر جاتا ہے جب میں پہلی بار اس دانش گاہ میں پہنچا تھا اپنے دوسرے سینکڑوں ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی کہ میرے دو بڑے بھائی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ یہ یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے میں نووارد تھا۔ سہ پہر میں شہر سے ایک جوتا کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خریدوا دی تھی۔ شہر گئے تھے ہم پیدل ادھر سے آئے تھے یکے میں اس لئے کہ ہاتھ میں سامان اٹھا کر چلنا اس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا! مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنے کمرے

بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا، گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا یہ نئی وردی پہننے میں دیر کی اور کیسے نہ کرتا۔ جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرا دی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اتر گیا اور کئی بار کے بست و کشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا لیکن جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

راستہ معلوم نہ تھا نہ جانے کتنی دیر ادھر ادھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں تلاش منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہونچا کمرہ بند تھا دوسرے کمرے بھی سب بند تھے گھڑی دیکھی یہ بھی اسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی رفتار سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اس سے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں اور اس جان ناتواں نے ان آٹھ منٹ میں خود فراموشی بازیافت تلاش منزل گم کردہ راہی اور ناکامی سفر کے جملہ مقامات طے کر لئے تھے۔

سچ ہے: وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس پر یہ گذرتا ہے اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے کبھی چند منٹ انتظار اور مایوسی کے چند منٹ پہاڑ بن جاتے ہیں کبھی کشف حقیقت، تصدیق، مشاہدہ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں کبھی بے مقصد ذہنی راہ روی، بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے، خیر تو ہم آٹھ منٹ بعد جہاں سے چلے تھے وہیں

پہونچ گئے۔ چارپائیاں باہر نیم کے درختوں کے قریب پڑی تھیں ذہاں بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے ساتھی کوئی منہ میں ہاتھ ڈالے کوئی گنگناتے کوئی ہنستے، کوئی ذرا چپ چپ واپس آنے لگے یعنی جانا کھانا، آنا سب لو دس منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں البتہ کھانے میں بہت فوجی شان تھی اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا اور منتظمین کی طرف سے بھی ایسا اہتمام تھا کہ زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع کم ہی ہوتا تھا۔

یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آرہی ہے! آج شاید اس لئے کہ دہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے مگر جس میں اس دانشگاہ سے برابر دل کو تعلق رہا؛ گہرا تعلق نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ دیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھا۔ ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا۔ یہاں دوست پائے دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا۔ اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے بھانت بھانت کی زندگی کے عنوان کو برتنا اور پرکھنا سیکھا۔ اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے۔ پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں۔ اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں ابھرتا ہوا محسوس کیا اپنی خام تندمزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری کے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا۔ صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشو ونما دے سکنے کے لئے ان میں زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار شامل ہونے کی ضرورت بھی یہیں پہچانی خلوت وجلوت کی جداجدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا یہاں فرمانبرداری بھی سیکھی اطاعت شعاری سیکھی ادب سیکھا بڑوں کا ادب ہم چشموں کا ادب چھوٹوں کا ادب، اور خود اپنا ادب سعادت مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیار انہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا۔ پھر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمہ حیات سے ارزانی ہوئی باغی بن کر نکالے گئے دوسری بستی بسانے میں لگ گئے، صدق

کالج دی مگر اس مادرِ علمی کی طرف دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی بلکہ اس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا۔ حالات بدلے ملک آزاد ہوا یہاں کا نظام بھی بدلا ذمہ دارانہ حیثیت سے اس کی خدمت کا موقع میسر آیا یہ ہی بھلی جو بن پڑی خدمت کی اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سرشوریدہ کو بیتیں بالین آسائش نصیب ہو جائے گی مگر یہ مقدر نہ تھا۔

آج کاسۂ دل کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے اس پر بھی جو یہاں سے پایا شکر گزاری سے بھرا ہے اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی جھلک رہا ہے میرے لئے تو اس دانشگاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے۔

من ہوئے مست و ساقی پر دہد پیمانہ را

یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار دیا جاسکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کا نشو و نما، اس کی ترقی اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اسی کالج سے ہوا ہے یہ جو کچھ میں نے سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اس کالج کی بدولت ہے اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔

علامہ شبلی نعمانی

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ایک خطبہ جو دیا نہ جا سکا

[۱۹۶۷ میں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہوئے تو موصوف نے یونیورسٹی کی صد سالہ جوبلی منانے کا خیال ظاہر کیا۔ ضروری انتظامات شروع کر دیئے گئے۔ میرے دل میں بے اختیار یہ بات آئی کہ اس موقع پر آپ نوجوانوں کو ایک خطبہ دوں گا۔ اس کی نوبت نہ آئی تو چھپوا کر تقسیم کر دوں گا۔ اس سے دل میں کچھ اس طرح کی کشادگی سی ہوئی کہ خطبہ لکھا جانے لگا۔ کچھ دنوں بعد حالات اس طرح بدلے کہ جوبلی کی تحریک ملتوی ہو گئی لیکن خطبہ کا لکھا جانا ملتوی نہ ہوا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو خطبہ توقع سے کہیں زیادہ طویل ہو گیا تھا، شوقِ فضول اور جرأتِ رندانہ پر ہنسی آئی شرمندہ بھی ہوا لیکن اس امید نے دامن نہ چھوڑا کہ طباعت و اشاعت کی شاید کبھی نہ کبھی کوئی صورت نکل آئے۔ اس کا اندیشہ البتہ رہا کہ اگر یہ جلد شائع نہ ہو سکا تو قابو سے باہر ہو جائے گا۔ یہ اندیشہ غلط نہ تھا۔

سرکاری اور غیر سرکاری پبلشنگ اداروں سے رجوع کیا سب نے اس طرح کانوں پر ہاتھ دھرے جیسے مجھے بھی آئندہ سے کان پکڑ لینا چاہیئے۔ آخر میں کسی اہلِ نظر کی تلاش میں نکلا۔ کتنے بڑے بڑے لوگ اور ان کے منصوبے اس تبلیغ کی داد و دہش

کے منتظر و محتاج رہتے اور رجوع کرنے پر اپنی مراد کو پہنچتے لیکن اس کوچہ میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ حکومت نے ایک "خوشگوار صبح" پردۂ غیب سے باہر نکل کر سارے اسمگلروں کو بحق سرکار ضبط کر لیا۔ یہاں تک کہ بلیک مارکیٹ سے بھی دستیاب نہیں ہو سکتے! ایک زمانہ میں "دفتر بے معنی" کو غرق مے ناب کر دیتے تھے اب اس طرح کی اشیاء یا مجرب کو سرد خانے یا غالب کے عہد کے "طاقِ نسیاں" پر رکھ دیتے ہیں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں!

متذکرہ صدر جوبلی کے ذکر نے ایم اے او کالج کی پہلی پچاس سالہ جوبلی کی یاد تازہ کر دی جو ۱۹۲۵ء میں منائی گئی تھی۔ کتنا مبارک اور شاندار اجتماع تھا کیسے اور کیسے مایۂ ناز اکابر ملک کے اطراف و جوانب سے آکر یکجا ہو گئے تھے جن کو دیکھ کر اندر باہر معلوم نہیں کیا کیا یاد آنے لگتا۔ یہ خیال بھی ذہن میں آتا تھا جواب تک نہیں بھولا ہوں بلکہ نا مساعد سے نا مساعد حالات میں بھی اس کی تصدیق ہوتے دیکھتے آیا ہوں وہ یہ کہ جس تقریب و تحریک کا نتیجہ یا نمونہ یہ جلیل و عظیم اجتماع ہو وہ کبھی ناکام نہیں ہو سکتی بلکہ فروغ پاتی رہے گی۔

جوبلی کا میدان جہاں آج آزاد لائبریری، کینیڈی ہال اور ان کے خوبصورت اور فرحت فزا خیابان و گلزار و باغ آفریدم' دعوت نظر دیتے رہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس طرح کی وادی غیر ذی زرع یا "بیابان و کھسار و راغ آفریدی" کا نقشہ پیش کر رہا تھا اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ ایک سمت صاحب باغ کی ملول شکستہ دیواریں دور سے اطراف میں ننگی بھوری زمین، جہاں تہاں کٹیلی جھاڑیاں دھندلے دھندلے نمایاں، چھوٹے بڑے ویران ٹیلوں پر "شوخیٔ نقش پا بے پروا خرام" نہ ہمارا آپ کا لیکن اس بے آب و گیاہ میدان میں جشن جوبلی میں شریک ہونے والوں کے اقتضاء آرزومندی کے احساس و انتظار کی طرف نگاہ جاتی تو بے اختیار محسوس ہوتا جیسے یہ پوری

تقریب اس عرش منزلت وادی خیز کی برکت سے مالا مال ہو جس کے فیضان سے ہمارے ضمیر کو روشنی اور ذوق اور ذہن کو بلندی اور پائیدگی نصیب ہوتی رہے گی اگر کوشش تصوّر اور تصویر کے ان لمحات و لمعات کو پیش کر سکتا جو اکثر تفصیل پر بھاری ہوتے ہیں کوشش کروں تو گفتگو طویل ہو جائے گی اور آپ مجھے آداب محفل سے بے گانہ یا بے پروا قرار دے کر اس حسنِ ظن سے محروم کر دیں گے۔ جسے میں اپنے لئے بڑی قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ یہ پوری مسل "داخل دفتر" ہو چکی تھی کہ ایک عزیز نے مشورہ دیا کہ اس خطبۂ عزیزانِ علی گڑھ" کو لکھنؤ کے مشہور و مقبول روزنامہ "قومی آواز" کے ہفتہ وار ضمیمہ میں شائع ہونے کے لئے بھیج دیا جائے۔ مشورہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مسودہ پر قبضہ کر کے اس کے اجزا بھیجنے شروع کر دیئے۔ اڈیٹر صاحب کے لطف خاص کا شکر گزار ہوں کہ موصوف نے پورے خطبہ کو چھبیس (۲۶) قسطوں میں شائع کر دیا۔ لیکن اطمینان اور خوشی ہوئی کہ اس پر موصوف کو کسی طرف سے کوئی گزند نہیں پہونچی!

یہ ہونا تھا کہ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین ایک طویل مدت کے بعد برسرکار آئی۔ یونین کے سکریٹری صاحب کا ارشاد ہوا کہ میں اس استقبالیہ میں حاضر ہوں جو وہ یونین کی طرف سے یونین اور یونیورسٹی سے میری دیرینہ وابستگی کے صلہ میں دینا چاہتے تھے طرح طرح کی معذوریوں کے باعث میرے لئے شرکت ناممکن تھی بہت کچھ ردو قدح کے بعد یہ طے پایا کہ میں خطبہ لکھ کر دیدوں وہ جس طرح مناسب سمجھیں گے کام میں لائیں گے آئندہ صفحات اسی مفاہمت کا نتیجہ ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یونین ایک دفعہ پھر تعطل میں آگئی ہے اور عجب نہیں متذکرہ صدر تحریک اس کے سامنے بھی وہ نامعلوم مدت تک "منتظر" رہے۔ ان دونوں خطبات کا نصیب کچھ اس طرح کا معلوم ہونے لگا جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے کہ آشیانے کے لئے جو شاخ چنی وہ شاخ جل گئی

اسی اثناء میں سرسید ہال میگزین کے مرتب عزیزی ڈاکٹر اصغر عباس

لکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فرمائش موصول ہوئی کہ ان کے زیرِ ترتیب ہال میگزین کے لئے کچھ پیش کروں۔ میں نے خرابیٔ صحت کا عذر کیا ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ اگر عزیز موصوف مناسب سمجھیں اور میگزین میں گنجائش ہو تو یونین ہال کے اس خطبہ کو شائع کر سکتے ہیں۔ اصغر عباس صاحب آمادہ ہو گئے اور ان کے رفیق و شفیق ڈاکٹر حسام الدین صاحب پرووسٹ سر سید ہال نے ان کی تائید فرمائی اور میری توقیر بڑھائی اس طرح مجھے اور ان معروضات کو ناظرین کے سامنے آنے کا موقع مل گیا۔

اراکینِ یونین کو شکایت ہو سکتی ہے کہ جو چیز ان کے لئے تھی وہ دوسروں کی نذر کیوں کی گئی۔ اس جوابِ دعوے میں آبِ حیات کا وہ لطیفہ پیش کروں گا جو آزاد نے انشا کے بارے میں لکھا ہے وہ یہ کہ زندگی کے آخر زمانے میں جب انشا لکھنؤ میں عسرت اور گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے ایک مشاعرہ کی خبر ملی۔ شرکت کے لئے قبل از وقت پہونچ گئے لوگوں نے بتایا کہ مشاعرہ کا مقررہ وقت ابھی نہیں آیا ہے اس لئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا اس پر انشا نے جیب سے غزل کا پرزہ نکالا اور اپنی مشہور غزل "بے زار بیٹھے ہیں" "تیار بیٹھے ہیں" کے ردیف قافیہ کی پڑھ دی اور یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ اپنی غزل سنا دی مشاعرہ جب جی چاہے کرتے رہیے گا۔ معلوم ہونے پر کہ یہ انشا تھے لوگ دم بخود رہ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بیان اتنا واقعہ نہیں جتنا لطیفہ اس لئے کہ مذکورہ غزل لکھنؤ میں نہیں دلی میں لکھی گئی تھی جب انشا کا ستارہ عروج پر تھا۔ صورت حال کچھ بھی ہو میں اس لطیفہ کو واقعہ پر بھاری سمجھتا ہوں اس لئے عزیزانِ یونین سے معافی کا خواستگار رہتے ہوئے انشا کی پیروی کرتا ہوں!]

غبارِ فطرتِ پیشینیاں زما خیزد
صفائے بادہ ازیں دُردِ تہ نشیں پیداست

(غالبؔ)

جناب صدر، خواتین و حضرات!

آپ کی دعوت پر آپ اور آپ کی یونین کے بارے میں کچھ عرض کرنے حاضر ہوا ہوں۔ باقرار صالح، بہ تقاضائے وقت، بامید التفات، بحیثیت مجموعی بطور مناجات!

آپ کی یونین ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی اور مسٹر بیک۔ جیڈ آئی سڈنس کے نام پر اس کو منسوب کیا گیا۔ مسٹر سڈنس آکسفورڈ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ ۱۸۷۵ء میں اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر اور ۱۸۸۳ء میں کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آب و ہوا راس نہ آئی تو مستعفی ہو کر انگلستان واپس چلے گئے۔ اپنے طلباء کو انگریزی سکھانے پڑھانے اور انگریزی با ضابطگی (ڈسپلن) ملحوظ رکھنے پر بڑا زور دیتے تھے۔ باری باری کلاسوں میں جا کر صحیح انگریزی تلفظ اور آئین و آداب بتاتے سکھاتے اپنی طرف سے وظیفے مقرر کر دیئے تھے۔ ایک عمدہ عادات اور خصائل دوسرا کلاس میں پابندی سے حاضری کے لئے۔ باقاعدگی کے بارے میں ایسی شہرت تھی کہ سر سید جب کبھی کچھ دنوں کے لئے علی گڑھ سے باہر جاتے تو مسٹر سڈنس کو تعلیم اور ڈسپلن کا انچارج مقرر کر جاتے۔ طلباء کم آمیز تھے لیکن طلباء عام اساتذہ اور منتظمین میں ایسی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے کہ علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت ان کو سپاسنامے دیئے گئے وہ اس اعتبار سے ایک منفرد امتیاز ہے کہ مسٹر آرنلڈ پروفیسر انگریزی نے انگریزی میں، مولوی عباس حسین نے عربی میں، پروفیسر محمد اسحاق نے فارسی میں، بابو آشوتوش بھٹا چاریہ نے سنسکرت میں سپاسنامے پیش کئے جو بڑے خوشنما اور قیمتی خریطے اور ڈاکٹ میں مسٹر سڈنس کو نذر کیا گیا۔ انہی خدمات کے اعتراف و احترام میں کالج نے ان کے نام سے اس یونین کو موسوم کیا۔

مسٹر سڈنس کے بعد مسٹر ہیرولڈ کوکس HAROLD COX آئے اور ریاضی اور اکنامکس کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ریاضی میں کیمبرج کے ٹرائپوس تھے۔ کیمبرج یونین کے پریسیڈنٹ

اور انگلستان کے کئی کالجوں میں لکچرر رہ چکے تھے۔ علی گڑھ آئے تو ان کے سپرد سیول سروس
کے مقابلے کے امتحان کے کوچنگ کلاسز بھی سپرد کئے گئے اس کا نام THE CIVIL
SERVICE AND EUROPEAN EDUCATIONAL PREPARATORY CLASSES
تھا جو کسی نہ کسی شکل میں تقسیم ملک کے زمانے تک قائم اور کامیاب رہا۔ آپ کی اس یونین
کا سب سے گراں قدر انعام HAROLD COX ENGLISH SPEAKING PRIZE
انہی مسٹر کوکس کے نام سے منسوب ہے۔ یہ اس مقرر کو دیا جاتا جس نے سال بھر پابندی کے ساتھ
یونین کی انگریزی تقریروں میں حصہ لیا ہو۔ جس ممبر کو یہ انعام مل جاتا اس کے لئے یونین کی
وائس پریسیڈنٹ شپ (اب پریسیڈنٹ شپ) کا منصب ایک گونہ متعین ہو جاتا۔ قدر و قیمت
کے اعتبار سے انگریزی کی برجستہ تقریر کا درجہ بھی کم نہ تھا۔ اسی طرح اردو کے مقابلے کی تقریروں
کے انعامات مقرر تھے۔ اس عہد میں اردو میں تقریر کرنا اتنا آسان اور نا قابلِ مواخذہ نہ تھا جتنا
آجکل ہے۔ جب اردو کا مادری زبان ہونا ہماری ذمہ داری نہیں بلکہ اردو کی ہو۔
ہیرلڈ کوکس کے بعد مسٹر تھیوڈور بک آئے۔ یہ ٹرینیٹی کالج کے گریجویٹ اور کیمبرج یونیورسٹی
یونین کے پریسیڈنٹ رہ چکے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس انگریز پروفیسر کو ترجیح دی جاتی
تھی جو آکسفورڈ اور کیمبرج یونین کا پریسیڈنٹ رہ چکا ہو۔

تقریر کے آئین و آداب اور اس کی اہمیت سے طلبا کو شروع ہی سے آشنا کرنے کے لئے
اسی سٹڈنس یونین کے نمونے پر ایک جونیئر ڈیبیٹنگ سوسائٹی تھی جس کے اپنے عہدہ دار اور اپنا انتظام
تھا۔ اور فرسٹ اور سیکنڈ ایر کلاسوں کے طلباء کے لئے مخصوص تھی۔ یہ ابتدائی مشق و مہارت کے
لئے تھی تاکہ آگے چل کر تقریر کرنے میں جھجک یا ہراس نہ محسوس کریں اس سے آپ خیال کر سکتے
ہیں کہ اس دور میں مذاکرہ اور مباحثہ کے فن اور فوائد کو کتنی اہمیت حاصل تھی اور کالج کی شان
اور شہرت میں یونین اور دوسری انجمنوں اور کلبوں کی تہذیبی، تربیتی اور تفریحی سرگرمیوں
کا کتنا گراں قدر حصہ تھا۔

اس عہد میں اقامتی زندگی کے بعض قواعد آج کتنے عجیب معلوم ہوں گے۔ شاید ناقابل عمل بھی۔ باوجود اس کے بیشتر طلبا، اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو خوش حال ہوں یا تنگ حال تہذیبی شعائر میں تقریباً یکساں سطح پر ہوتے تھے، فارسی، عربی زبانوں اور مذہب و اخلاق کے اوامر و نواہی سے آشنا اور سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ ان پابندیوں کو بڑی خوشی سے قبول کرتے جیسے وہ پابندیاں نہ تھیں امتیازات تھے۔ یہ نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ ممکن ہے آپ میں سے بعض یا بیشتر اصحاب خیال کرتے ہوں کہ وہ دور آتش کی جوانی کا نہیں ان کی پیری یا پسماندگی کا تھا اور اب دنیا صرف ایسے آتش کو گوارا کر سکتی تھی جو ہمیشہ جوان اور بے لگام رہ سکتے تھے۔ پابندی سے بے نیاز ہو کر آزادی کا دم بھرنا یا طلب گار ہونا ظلم بھی ہے جہل بھی۔ معاشرے میں جب کبھی اور جہاں کہیں اختلال یا عدم توازن راہ پائے گا۔ اس کو صراطِ مستقیم پر لانے اور رکھنے کے لئے پابندی یا امر جنسی کا نفاذ لازم آئے گا۔ کبھی اللہ اور رسول کی جانب سے، کبھی سلطان و سلطنت کی سمت سے۔ کبھی دونوں کے نائب اور نمائندہ اعلیٰ تعلیم گاہوں کی طرف سے!

تقریباً ان پابندیوں کو سُن لیجیے

(۱) بورڈنگ ہاؤس میں حاضری دن میں تین بار لی جاتی تھی۔ ۷ بجے صبح فرداً فرداً کمرہ پر۔ ۴ بجے شام نماز کی حاضری۔ ۸ بجے رات کمرہ پر فرداً فرداً۔

(۲) کوئی طالب علم کالج کے گھنٹوں میں اپنے کمرے پر نہیں جا سکتا تھا۔

(۳) وارڈن کی تحریری اجازت کے بغیر کوئی بیرونی شخص کسی بورڈنگ ہاؤس میں نہیں جا سکتا تھا۔

(۴) کسی ڈے اسکالر کو اجازت نہ تھی کہ وہ کالج کے اوقات میں کسی بورڈنگ ہاؤس میں جائے۔

(۵) ڈائننگ ہال کی حاضری لازمی تھی۔

(۶) مسٹر ٹریلنس کو پرسپل کی ہدایت تھی کہ جو طالب علم دینیات کے امتحان سے غیر حاضر

ہو یا ہفتہ وار دینیات کے کلاس سے غیر حاضر ہو اس کا نام خارج کر دیا جائے۔ ایسی ہی اور پابندیاں بھی تھیں جن کا ذکر طوالت کے خیال سے نہیں کرتا۔

آپ کی اس یونین نیز کرکٹ، ہاکی، فٹ بال ٹینس کے کارنامے ڈائننگ ہال اور ڈیوٹی سوسائٹی کی سرگرمیاں شعر و ادب کی محفلیں اور آج سے کم و بیش ۵۰/۶۰ سال کے شیدائے شائیگان، علی گڑھ اور اس کے فرزندوں کی زندگی کے بڑے صالح، صحت افزا، دلکش اور قوی امتیازات تھے جواب بہت کم اور کمزور ہو گئے ہیں۔ اس تکلیف دہ صورت حال کی ذمہ داری تمام تر آپ پر عائد نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے اسباب و عوامل پر بھی ہوتی ہے جن پر ہمارا قابو نہ تھا مثلاً ام اے او کالج کے قیام سے لے کر یونیورسٹی کی ابتدائی چند برسوں تک ہم اور ہماری یونیورسٹی طرح طرح کے بیرونی دباؤ اور دشواریوں سے محفوظ تھی اور ہم ہر کام آسانی سے انجام دے لیا کرتے تھے لیکن اس کے بعد حالات بکسر بدل گئے اور یونیورسٹی اس کے اراکین اور بہی خواہ ایسی جارحانہ قوت اور تحریکوں کی زد میں آگئے جو ہم سے مطمئن ہونے پر راضی نہ ہوسکیں۔ چنانچہ جب سے اب تک کا پورا زمانہ ہم پر دفاعی یا مدافعانہ تدابیر اختیار کرتے رہنے میں گزر رہا ہے اور کس قیامت کی آزمائش یہ دفاعی کام ہوتا ہے۔

نوا گرانِ نخوردہ زخم را چہ خبر!

اس وقت اپنی یونین کے بارے میں کہنا پڑتا ہے جو اتنا کہنا نہیں ہے جتنا "خود کلامی" کہ یونین اب ہمارے لئے شاید اتنی مایۂ افتخار نہیں رہی جتنی پہلے کبھی تھی۔ یہ اس لئے قائم کی گئی تھی کہ آپ یہاں وہ آداب سیکھیں گے اور سکھائیں گے جن سے مہذب معاشرے اور اہم مواقع پر اپنی کہی اور دوسرے کی سنی جاتی ہے اور ان پر عمل کیا جاتا ہے یعنی آزادی سے کہنا اور تحمل سے سننا۔ سفارت اور سیاست کے اعلیٰ ایوانوں میں آجکل اس ہنر میں مہارت اور اس کی اہمیت کسی طرح اسلحہ اور افواج کی حرب و ضرب سے کم نہیں سمجھی جاتی۔ اسی طرح حفظ مراتب کا جو سرمایہ دولت آپ یہاں حاصل کریں گے وہ آئندہ زندگی میں صحت مند سماج کے قیام و استحکام

میں معین ہوگا۔ جمہوری اور پارلیمنٹری طرز حکومت اور معتبر معاشرے کے لئے جو صفات ضروری ہیں وہ اسی طرح پیدا ہوتی اور بروئے کار آتی ہیں۔

اسی فضا اور ان فضائل کو ترقی دینے اور مقبول بنانے کے لئے آپ آپ کے اساتذہ کرام اور لڈ بوائز اور دوسرے اکابر سرگرم کار رہتے۔ مسائل فہمہ پر کیسے معرکے کے مذاکرے اور مباحثے ہوتے کہ دل خوش ہو جاتا اس لئے اور کہ ہمارے طلبار کی تقریریں مہمانِ محترم کے خطاب و خطبہ سے کم درجہ کی نہ ہوتیں۔ مہمان اس کا اعتراف کرتے اتنا رسمًا یا اخلاقًا نہیں جتنا بربنائے حقیقت اسی فضا میں ہم سانس لیتے بالیدہ ہوئے شہرت پاتے اور معتبر جانے جاتے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یونین کے وہ شب و روز خواب و خیال ہونے لگے ہیں اسے متشابہ لگنے کا کرشمہ کہئے یا بے ربط باتیں کہنے کی عادت جس کے لئے بہر کیف آپ کو درگذر سے کام لینا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ آپ اور یہ یونین ایسی یونینوں سے دور اور بہت دور رہیں جو یونیورسٹی طلبار کی کہی جاتی ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں اعلیٰ تعلیم گاہوں اور ان کے طالب علموں کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ ایسی حالت میں کسی طرح گوارا نہیں ہوتا کہ یہ یونین اور اس کے اراکین جن کا ریکارڈ اور روایات قابل فخر رہی ہیں۔ وہ باہر کے ایسے اداروں سے اتحاد خیال و عمل رکھیں۔ یہ آس پاس کی یونیورسٹی یونینوں کی روش اب ان روایات سے بیگانہ نظر آنے لگی ہے جو طالب علم کی زندگی کو بلند اور بہتر بنانے میں معین ہوتی تھیں۔ یہ مجالس اتحاد یا یونین ایسی قوتوں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں جو طالب علم کو علمی تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں سے دور اور بیگانہ رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو دور اندیشی صلح جوئی سلامت روی اور اپنے مقاصد عالیہ کے پیش نظر سوچے سمجھے ہوئے پروگرام پر عمل کرنا چاہیئے۔

یہ میں علیحدگی کی ترغیب نہیں دے رہا ہوں جس سے زیادہ غیر دانشمندی کا کوئی اور اقدام نہ ہوگا۔ شاید میں ہی آپ کے سوچنے کے انداز کو سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے کچھ لوگ روزی روزگار یا شہرت، سبقت کے لئے سیاست کی وادی میں قسمت آزمائی اور مہم جوئی

کو زیادہ نفع بخش پاتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ علم و اخلاق کے سرچشمہ سے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو سیراب کریں اور رکھیں۔ انفرادی حیثیت سے ممکن ہے کہ یہ طریقہ کام دے جائے لیکن اجتماعی اعتبار سے بے سود ہی نہیں نامبارک بھی ہے۔ یہاں اس خطرے کی نشان دہی سے باز نہیں رہ سکتا کہ جب اور جہاں نوجوان بالخصوص طلباء تعلیم تربیت اور اخلاق سے آراستہ ہونے کے بجائے شور وشر اور شکست و ریخت کے طریقوں کو ترجیح دینے لگیں گے وہاں حکومت اور معاشرے میں کوئی بنیادی خلل ضرور پایا جائے گا۔ نیز یہ کہ ایسی خرابی کو دور اور اس کی اصلاح کرنے کے بجائے نوجوانوں کو بہر نوع و بہر قیمت رعایت بخشی ہے خاموش رکھنے کی پالیسی اختیار کرنا بڑی تشویش ناک صورت حال ہے جس سے آپ کو حکومت اور پارٹی لیڈروں کو باخبر رہنا چاہیئے۔

آپ بتائیں کہ آپ کے قبیلے (علی گڑھ کے باہر) کے افراد اور دوسرے نوجوان آئے دن جس غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے جلوس نکالا کرتے ہیں اور بے گناہ و بے خبر عوام و خواص کی عافیت، جان مال آبرو کا نقصان ہوتا ہے اور پبلک املاک تلف ہوتی ہے وہ حق بجانب ہے یا نہیں جب کہ آپ کا مطالبہ یہ ہو کہ یونیورسٹیاں یا ای قبیل کے دوسرے ادارے امتحان لینا یکسر منسوخ کر دیں یا نقل کرنے کی عام اجازت ہو۔ پروموشن بغیر امتحان کے ہو اور ڈگری اور ڈپلومہ حوالہ کر دئیے جایا کریں۔ کہیں اور بھی دنیا میں ایسا ہوا ہے اور اگر ہوا ہے تو قطعاً غلط ہوا ہے۔ جنگ عظیم کے دوران یا اس کے کچھ دنوں بعد تک نوجوانوں کے لئے جو لڑائی میں شرکت کے سبب سے تعلیم سے معذور اور محروم رہے حکومت اور یونیورسٹیوں نے کچھ رعایات منظور کر لی تھیں لیکن وہ موقعے جس قدر نازک اہم اور خطرناک تھے۔ اس میں رعایت حق بجانب ہی نہیں بلکہ لازم آتی تھی۔ آج کے حالات بالکل ویسے نہیں ہیں۔ ایسے میں ایسی عاقبت نااندیشیاں برادری کے نول و فعل کا تابع ہونا بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ کمزوریاں آپ میں نہیں ہیں لیکن بدنام ہونا بڑا کا امکان ضرور ہے جیب اور جہاں ایسا ہو کہ بدنام نکو نام کہلائیں اور نکو نام بدنام بلکہ اس سے کچھ زیادہ وہاں اپنی سوجھ بوجھ سے کام نہ لے سکئے تو بڑی بے دتوفی کو کام میں لائیے اور دو کیجئے جس سے یہ اندازہ ہو آپ ہم سب خیر و عافیت سے رہیں اور ایک دوسرے کی خبر

عافیت چاہتے ہیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے تنبیہ کی ہے۔

چو از قومے یکے بے دانشی کرد

نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

شیخ کا کہنا ہے کہ قوم کا ایک فرد بھی بے دانشی کا مرتکب ہو جاتا ہے تو چھوٹے کی منزلت باقی رہتی ہے نہ بڑے کی۔ ایسا تو نہیں کہ ہمارے فرد اور جماعت دونوں بے دانشی میں مبتلا ہو گئے ہوں اپنے اس مطالبے پر کہ امتحان نہ ہو اور انعام مل جائے اور ملتا رہے۔ غالب کا بھی ایک شعر سنیئے۔

یا رب بزاہداں چہ دہی خلد رائیگاں

جور بتاں نہ دیدہ و دل خوں نہ کردہ کس

فرماتے ہیں اے خدا جنت کو زاہدوں پر رائیگاں کرنے سے کیا حاصل جنھوں نے بتوں کے جور اٹھائے ہوں نہ اُن کے (زاہدوں کے) دلوں کو کسی نے خون کیا ہو!

معلوم نہیں اس شعر پر خدا کے لبوں پر ویسا ہی کوئی تبسم نمایاں ہوا ہوگا یا نہیں جو اقبال کی نظم "تنہائی" میں زندہ جاوید ہے۔ ضرور ہوا ہوگا اس لئے کہ خدا کی بے شمار صفات میں "سنس آف ہیومر" (SENSE OF HUMOUR) بھی ہے اور میرا خیال ہے کہ کہیں اور نہیں تو کم سے کم ہماری آپ کی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنی اس صفت، اور قدرت کو سب سے زیادہ کام میں لاتا ہو تو عجب نہیں "از ماست کہ برماست" کے آشوب سے کبھی فرصت ملے تو زیری طرف سے اس مسئلہ پر غور کیجئے گا کہ اقبال کی نظم "تنہائی" میں خدا کا تبسم اور غالب کے اس شعر میں خدا کا مفروضہ تبسم دونوں عظیم شعراء کی GENIUS کی کس طرح ترجمانی کرتے ہیں۔

فارسی کا ایک پٹا ہوا اور فرسودہ مقولہ ہے جو وقت آنے پر ہمیشہ تازہ اور حسب حال محسوس ہونے لگتا ہے۔ چاہتا ہوں آپ اس پر عمل کریں وہ مقولہ یہ ہے " مصلحت بیں و کار آساں کن" مصلحت بینی مشکل نہیں ہے لیکن کیا کیجئے کہ آپ نے اس پر کاربند ہونا اپنے لئے دشوار کر لیا ہے حالاں کہ وقت کا یہ سب سے بڑا تقاضا ہے۔ سیاست کی دنیا میں دوربین

اور خورد بین دونوں سے کام لے کر مصلحت بیں کا غور مولا بناتے اور اتقیا رکرتے ہیں۔ نوجوان فطرتاً باغی یا انقلابی ہوتا ہے لیکن نہ اس قدر کہ اسی کا ہو کر رہ جائے۔

ام اے او کالج، آپ کی یونین اور اسی طرح کے دوسرے ضمنی یا ذیلی ادارے خاص مقاصد کے تحفظ و ترقی کے لئے معرض وجود میں آئے۔ سرسید پہلے شخص ہیں جس نے ایک نہایت درجہ نازک، فیصلہ کن اور تاریخی موڑ پر مسلمانوں کی دستگیری کی اور رہنمائی فرمائی۔ انہوں نے ایک درماندہ اور لٹے ہوئے قافلہ کو معقولات زندگی کو اپنانے اور نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا حوصلہ بخشا اور ترقی کی شاہراہ پر چلنے کی ہمت اور ہدایت دی، یہاں تک کہ ہم ترقی پذیر اقوام اور ممالک کے ہمدوش و ہم سفر ہو گئے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستانی مسلمانوں میں ایسی عظیم اور جامع حیثیات شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ نہ ایسا ادارہ وجود میں آیا جیسا کہ علی گڑھ ہے۔ شاید ہندوستان سے باہر ممالک اسلامیہ میں بھی۔

سرسید کو بیک وقت ماضی حال اور مستقبل پر نظر رکھنے اور ہر ایک کو مناسب حال اہمیت دینے کا غیر معمولی شعور تھا۔ ہندوستان پر انگریزی حکومت کے جبر و اقتدار اور عزائم مسلمانوں کے سود و زیاں، ملک کے ساتھی رہنے بسنے والوں کی ہوشمندی اور حقیقت پسندی مغرب کے انداز فکر، طریق عمل اور بدلے ہوئے حالات کے بے اماں تقاضوں کا پورے طور پر علم تھا انہوں نے ایک عظیم قوم کو زوال و زبونی سے بچانے اور اس کی آبادکاری کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ سرسید نے کسی اور سے جہاد کیا ہو یا نہیں اپنی قوم کی جہالت، غفلت و غلط روی اور عاقبت نا اندیشی سے کیا اس میں ان کو غیر معمولی کامیابی ہوئی انہوں نے مغلیہ سلطنت کے کھنڈر پر ایک ایسی علمی تہذیبی اخلاقی اور قومی قلمرو کی بنیاد رکھی۔ جو اپنے پیشرو سے کہیں زیادہ فیض بخش استوار اور مبارک فال تھی۔ اس کے سایے میں اور اس کے سہارے ہم علم و اخلاق کی نعمتوں سے فیضیاب اور گردش ایام کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پاتے ہیں۔

انتشار و اختلال کے اس دور میں ممکن ہے آپ کا ذہن اس طرف متوجہ ہوتا ہو کہ یہ درسگاہ اس مرتبہ کے بعض دوسرے اداروں کی مانند کسی ایک شخص کے عطیہ کسی متمن کی بخشش یا حکومت کے نظر و کرم سے کسی دن دفعۃً ملک کے افق پر نمودار ہو گئی ہو بلکہ یہ ہمارے بزرگوں اور مخلصوں کی دن کی محنت اور رات کی عبادت کا ثمرہ یا ورثہ ہے۔ پھر اللہ نے ہماری مساعی کو پسند کیا اور اس ادارے پر اپنے گوناں گوں نعائم کے دروازے کھول دیئے اور ایسی شہرت اور برکت دی کہ باوجود طرح طرح کے موانع کے یہ بیش بہا خدمات کو سب کے لئے عام کرتا رہا اور کرتا رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ عبارت پڑھیئے جو کالج کے صدر دروازے وکٹوریہ گیٹ پر برملا نقش ہے۔

"قوم کے بزرگوں اور معزز لوگوں نے جو غفلت کے اندھیرے کے لئے مثل چراغوں کے ہیں ایک عالی شان مکان بنایا ہے جس کی بنیاد تقویٰ الٰہی پر ہے تاکہ اس میں علوم دینی اور دنیوی سکھائے جائیں اور عالم کے اخلاق شائستہ بنائے جائیں۔ ان لوگوں نے اللہ کی راہ میں کامل کوشش کی ہے اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک کوشش کی جزا دے اور اجر عظیم عطا کرے۔"

اس انتساب اقرار و اعلان کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ علی گڑھ کیا ہے کیوں ہے اور کیوں باقی رہے گا۔ خدا کے ان بے لوث بندوں کے ایمان و ایقان، مسکنت اور خشیت کا کتنا عظیم انتساب یہ اعلان ہے۔ کیا آپ نے اس طرح کا بیان کہیں اور پڑھا یا سنا ہے؟ ایسا نہیں تو پھر آپ اس ذمہ داری کو صمیم قلب سے قبول کریں جو اس انتساب سے آپ پر عائد ہوتی ہے۔

کیا بتاؤں اور کس طرح بتاؤں کہ اس یونین نے کتنے اچھے دن دیکھے ہیں اور علی گڑھ کی بے مثل اور قابلِ رشک شہرت میں اِس کا اور کرکٹ کلب کا کتنا وسیع حصہ ہے "یونین"

کہیں ہو کسی نوع کی ہو ان کے بارے میں کچھ عرصہ سے جو کچھ دیکھنے سننے اور سمجھنے میں آتا رہا ہے اس سے بدگمان اور بدحظ رہنے لگا ہوں۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی جی چاہنے لگا ہے کہ اپنی اس یونین کو کسی اور نام سے موسوم اور ممتاز کر دیا جائے تو بہتر ہوگا ورنہ عجب نہیں اس کی گذشتہ خدمات بے نور ہو جائیں اور آنے والی نسل نام کے سبب سے نیک نام اور بدنام میں فرق نہ کر پائے ایسا دیکھنے میں آنے لگا ہے کہ یونیورسٹی یونین اور سیاسی یونین دونوں کے طریق کار میں فرق برائے نام رہ گیا ہے۔ اپنے اس خیال اور خطرے کی تائید پر اصرار نہیں کرتا اپنے بہک جانے کی معافی ضرور چاہتا ہوں۔

سرسید کے انگریزی رفقار کی خیر خواہی فرض شناسی اور جرأت اقدام کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ آکسفورڈ اور کیمبرج یونین کی خدمات اور روایات کے پیش نظر انہوں نے سٹڈنس کلب کی بنیاد رکھی۔ اس طرح ام اے او کالج کے اولین دور میں ہیرو HARROW اور اٹن ETON کے خطوط پر کرکٹ کلب کا قیام عمل میں آیا۔ ان دونوں کی اسپرٹ کو ہندوستان میں سب سے پہلے علی گڑھ نے قبول کیا۔ ملک کو علی گڑھ کی یہ پیشکش معمولی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک ان خدمات سے ملتی جلتی ہے جو مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں ہر ملک اور اس میں رہنے بسنے والوں کے لئے انجام دیں۔

اس وقت کے یوروپین کلکٹر نے کالج میں کرکٹ کا اہتمام واحترام اور اس کے واضح ہمہ جہتی اور صحت مند اثرات اور فضا کو محسوس کر کے کالج میگزین میں یہ لکھا تھا کہ کرکٹ فیلڈ تعلیم و تربیت کے اعتبار سے بہتر مرکز معلوم ہوتا ہے۔ مشرقی ممالک میں جس طرح کی حکومتیں اور معاشرہ ہوتا تھا ان میں آزادی افکار و اقدام کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ بادشاہ یا پروہت جو چاہتا کرتا۔ مغربی ممالک بھی اس محرومی کا شکار رہے لیکن یہ وبا مدت ہوئی کہ وہاں سے دور ہو چکی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں پارلیمنٹری روایات اور کرکٹ اسپرٹ ابھی قابل اطمینان حد تک مقبول نہیں ہوئی ہے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان ممالک میں جمہوری اور پارلیمنٹری ادارے آ گئے ہیں ان کے آداب اور

روایات موڑ پہ ہیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تاریخی اور فیصلہ کن جنگ واٹر لو WATER LOO کا آپ کو علم ہوگا۔ بتایا جاتا ہے کہ انگریز یہ جنگ واٹرلو میں نہیں ایٹن اور ہیرو کے کرکٹ کے میدانوں میں جیت چکے تھے۔ اس سے ہم خیال کر سکتے ہیں کہ کرکٹ اسپرٹ کیا ہوتی ہے اور کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو آپ کو سارے ملک کو علی گڑھ نے آشنا کرایا۔ یہ آپ کے اسلاف کا کارنامہ ہے جس کی آپ کو یاد دلاتا ہوں۔

سیاست نہ میرا مطالعہ ہے نہ میدان البتہ گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے ہندوستان اور اس سے باہر سیاست کی بساط پر مسلمان جس طرح مات کھاتے اور ان کے مہرے پٹتے رہے ہیں ان کا دور اور نزدیک سے تماشائی رہا ہوں۔ اس داستان کو سنکر کیا کیجئے گا۔ اس بارے میں میرے معروضات آپ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ہندوستانی سیاست میں ہماری نمائندہ اور معتبر لیڈر شپ کی جگہ خالی ہے مستقبل قریب میں اس کے پر کئے جانے کا امکان بھی بظاہر نظر نہیں آتا۔

سیاست میں لیڈر شپ کی مثال ایک طبعی کرشمہ سے دی جا سکتی ہے۔ گرمی اور سردی ایک دوسرے کا عدم توازن ہموار کرنے اور رکھنے کے لئے ہمہ وقت ایک دوسرے کی طرف رواں دواں رہتے ہیں اس طرح جس قوم یا جماعت میں لیڈر شپ خالی ہوتی ہے دور اور نزدیک کے اہل یا نااہل بالعموم نااہل کچھ مہم جوئی کی خاطر، کچھ شاطروں کی شہ پاکر، کچھ شیئاً للّٰہ کہتے ہوئے کچھ آپ طالب علموں کے زور اور شور پر اور آپ طالب علم قسمت کی یاوری کی امید پر لیکن بغیر قسمت غریب کا مشورہ لئے یا اس کی داستان غم سنے ہوئے اس خالی جگہ کو پر کرنے کے لئے تگ و تاز شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

ملک کی کسی سیاسی پارٹی سے آپ کی ذاتی و انفرادی وابستگی آپ کا اپنا مسئلہ ہے اور یہ آپ کا حق بھی ہے لیکن جہاں تک اس ادارہ اور اس کے منتظمین کا من حیث الکل کسی پارٹی سے تعلق ہے آپ کی وابستگی من حیث الکل ادارے کی وابستگی سے مختلف نہیں ہونی چاہئے۔

بالفاظ دیگر جماعت طلبا کی حیثیت سے آپ یونیورسٹی کے سیاسی مسلک کے خلاف صف آرا ہونے کے مجاز نہیں۔ آپ کو اس کا حق ہے نہ اختیار۔ یونیورسٹی کی مستقل آب و ہوا اور فضا ہوتی ہے اس کو فصلی اور موسمی ہواؤں سے زیر و زبر نہ ہونے دینا چاہیئے۔ باہر کے طلبا جو چاہیں کریں یہ کچھ ضروری نہیں کہ ان کو تسلیم کیا جائے یا ان کی تعمیل کی جائے۔ مصالح اور مجبوریوں کے باعث ہم وہ کریں گے جو ہمارے نزدیک صحیح، صالح اور واجب التعمیل ہوگا اور ہمارے آئینی حقوق اور اقلیتی کردار کی حفاظت اور احترام کرے گا۔ یہ میرا یقین ہے کہ جو باتیں ہمارے لئے صحیح صالح اور واجب التعمیل ہوں گی وہ دوسروں کے لئے بھی ہوں گی۔ اس کے خلاف سوچنے اور عمل کرنے والے کو ہم معتبر و محترم قرار نہ دیں گے خواہ وہ ہم میں سے ہو خواہ ہم سے باہر۔ مسلمانوں میں جتنے صیاد اور دانہ و دام ہیں ان کا شاید آپ کو اندازہ نہ ہو اسلئے باخبر رہنے کی درخواست کروں گا۔

سیاست سے ہماری وابستگی اتنی جذباتی نہیں ہونی چاہیئے جتنی سوچی سمجھی ہوئی۔ ہماری لیڈر شپ ہم میں آپ سے برآمد ہونا چاہیئے نہ یہ کہ وہ تمام ملک کے نوع بہ نوع سیاسی لیڈروں میں منتشر ہو۔ تقسیم ملک اور حصول آزادی کے بعد سے ہمارا قافلہ تقریباً بے سالار رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہم سب فرداً فرداً لیڈر کے درجہ پر فائز ہوگئے ہیں۔ یہ مزاج اچھی علامت نہیں ہے مسلک و معمول اور فکر و عمل کے اعتبار سے علی گڑھ کی سالمیت اس کی علمی و اخلاقی روایات کی نگہداشت اور اس کے بنیادی مقاصد کی حفاظت ہمیشہ پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ اس کے لئے کچھ دنوں سے ہم خاص طور پر کوشاں ہیں۔ ملک کا آئین اور ملک کا ذمہ دار طبقہ ہماری تائید میں ہے ۔ یوں بھی امید بہتری کی رکھنی چاہیئے۔

خوشی اور فخر کی کیسی کیسی باتیں گذشتہ عہد کی یونین کی یاد آتی ہیں۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے سربرآوردہ شخصیتیں کس شوق سے علی گڑھ آتیں اور شفقت و شادمانی کا اظہار کر کے رخصت ہوتیں۔ وہ اتنا یہاں کے عائدین سے نہیں جتنا طالب علموں سے ملنے، ہمارے طور طریقے دیکھنے اور یہاں کی فضا سے آشنا اور شاد کام ہونے کے لئے آتیں۔ اس زمانے میں اتنا یہ نہیں دیکھتے تھے

کہ آنے والا کتنا صاحب اختیار و اقتدار تھا جتنا یہ کہ کردار اور علم و فضل کے اعتبار سے اس کا قدو قامت کیا تھا۔ کوئی آئے یونین میں آنا لازمی تھا۔ کالج اتھارٹیز خود اس کا التزام رکھتے، جہاں کی پذیرائی طلبا کی طرف سے یونین میں بالضرور ہو۔ اس لئے کہ ان کو یقین تھا کہ اس تقریب کا جتنا اچھا اور پائدار اثر مہمان پر ہوگا اتنا کسی اور تقریب سے نہیں اس سے معلوم ہوگا کہ پہلے کبھی منتظمہ اور آپ طلبا کا اس یونین کے واسطے سے توافق و تعاون اور اخلاص و اعتبار کا کیسا پائندہ اور پاکیزہ رشتہ تھا اور اب کیسا ہے۔ آپ ہی سوچیں اور بتائیں ایسا ہی کوئی سانحہ ہوگا جسے یاد کر کے غالب نے کہا ہوگا۔

بہرسپ کجا رفتہ و پرویز کجا ئی
آتش کدہ ویرانہ و مے خانہ خراب است

مفہوم یہ ہے کہ بہرسپ کہاں ہے اور پرویز کہاں گیا۔ آتشکدہ ویران ہے اور میخانہ خراب۔

طالب علموں کی تعداد آج سے بہت کم تھی مشکل سے ایک چوتھائی اس سے بھی کم گنجائش یونین کے حامد ہال میں تھی۔ کیسے کیسے بڑے لوگ آئے اور ان کے استقبال کے لئے بڑے سے بڑا اجتماع ہوا۔ جن کو اندر جگہ نہ ملی وہ باہر دور دور تک پھیل گئے لیکن یہ ناممکن تھا کہ ہجوم سے کوئی ناسزا کلمہ بلند ہو یا مجمع میں کسی طرح کا انتشار پیدا ہو۔ یہ نظم یونین کے مباحثوں میں خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ بایںہمہ آپ نوجوانوں کی ذہانت، شگفتگی اور خوش طبعی سے وقتاً فوقتاً مجلس شاداب و شاداں ہوتی رہتی۔ اشتعال کیسا ہی ہو فرد واحد یا مجمع پارلیمنٹری آداب و آئین سے منحرف نہیں ہوتا تھا۔ اس کا ذکر کر دینے کی ضرورت پیش آئی کہ آج کل کبھی کبھی قانون ساز اسمبلیوں میں جہاں ملک کے مقبول و منتخب لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے اور زیر بحث مسائل نہایت درجہ اہم ہوتے ہیں وہاں ہلڑ، ہاتھاپائی اور سب و شتم کے بھی حادثات پیش آتے رہتے ہیں، جیسے اراکین کو پارلیمنٹری آئین و آداب کی خبر ہی نہ ہو۔ نہ شاید خود اپنی پروا!

یونین میں مہمان کی پذیرائی اور باتوں کے علاوہ گل افشانی سے کی جاتی۔ یونین کی چھت میں جو بڑا روشن دان ہے اس میں سے ٹھیک اس وقت جب یہاں آنریری ممبر شپ کے رجسٹر پر دستخط کرتا ہوتا رنگ برنگ کے بکثرت پھول اور پنکھڑیاں گرائی جاتیں۔ اکثر سورج یا برقی روشنی میں سنہری رنگ کی پنکھڑیوں کا جیسے ایک تھر تھراتا جگمگاتا ستون سا قائم ہو جاتا۔ یونین میں استقبال کی رسم ایسی دلکش اور ڈرامائی انداز کی ہوتی کہ مہمان مبہوت رہ جاتا اور اس کو کبھی نہ بھولتا۔ علوم نہیں کتنے معزز و ممتاز مہمانوں کی پذیرائی اسی طرح ہوتی رہی۔ ناموں کی تفصیل پیش کرنا نہ ممکن نہ مقصود۔ چند یاد آتے ہیں جن کی طرف شاید آپ کا ذہن نہ منتقل ہوا ہو۔

سری نواس شاستری یاد آتے ہیں۔ غالباً یہی نام تھا اپنے عہد کے ہندوستان کی اعلیٰ ترین شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ یونین میں انگریزی میں جو تقریر کی تھی اس نے عالی سے اعلیٰ مقرروں کو محو حیرت کر دیا تھا۔ رواں، ہموار، پُر مغز، شائستہ دلکش تکلف و تصنع سے پاک، موسیقی نہ ہونے کے باوجود موسیقی سے لبریز مقرر کا پُر تمکین سراپا اور ملنے جلنے بات کرنے کا کڑھا ہوا انداز جیسے ہمارے ہی آس پاس کے رہنے والے ہوں! اس دن سے بہت دنوں بعد تک اس تقریر اور سری نواس شاستری کا بہم پہنچا اثر رہا۔ ان کے بعد نوبل پرائز پانے والے ڈاکٹر رمن کی تقریر اسی یونین میں سننے کا اتفاق ہوا۔ کیسا متین مسکراتا چہرہ اور سراپا نہایت متحمل ستھرا سادہ سا لباس! انھوں نے رمن رینز (رمن شعاعیں) پیہم چپکی کی ایک تقریر کی تھی۔ کیا ٹکنیکل موضوع جیسے شاید اس زمانے میں بہت سے سائنسدان بھی اچھی طرح نہ سمجھتے ہوں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اسے کچھ بھی سمجھ سکا۔ اس لئے کہ آپ بجا طور پر اس کا یقین نہ کریں گے لیکن معلوم نہیں تقریر انگریزی زبان! مقرر اس کی شخصیت، علم کا عرفان و فیضان کیا چیز تھی یا سب ملی جلی تھیں۔ کہ برابر یہی محسوس کرتا رہا کہ جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ میں سمجھ رہا تھا۔ جیسے اس کا سمجھنا نا ممکن یا غیر معمولی بات نہ تھی۔ اپنا اعتبار نہ کرکے مجمع پر نظر ڈالتا تو یقین آجاتا کہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا اس میں حاضرین بھی شریک ہیں۔ اچھی تقریر اور اچھے مقرر کی یہ بہت بڑی پہچان ہے۔

مولانا محمد علی کی تقریر کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ مرحوم مجاہد پر اکثر کچھ نہ کچھ عرض کرتا رہا ہوں۔ وہ ہمارے لئے کبھی اجنبی نہیں رہیں گے۔ اقبال کی طرح محمد علی بھی ہر مشکل مقام پر ہم کو یاد آتے رہیں گے۔

عبداللہ یوسف علی آئی سی ایس اس زمانہ میں مسلمانوں کے اول درجہ کے دانشور مانے جاتے تھے۔ اس عہد میں مسلمان آئی سی ایس تقریباً نہیں کے برابر تھے۔ مقدمات کے فیصلہ میں بڑے دلیر اور انصاف پسند تھے۔ اپنے سے اوپر کے انگریزی حکام کے خشم یا خوشنودی کی پروا نہ کرتے تھے۔ علی گڑھ کے نہ تھے لیکن علی گڑھ کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا۔ تقریر بڑی فاضلانہ ہوتی۔ جب چاہیں تو زیر بحث موضوع پر دیر سے دیر تک گفتگو کریں اور سامعین یکساں دلچسپی سے سنتے رہیں۔ تاریخ اور مذہب ان کا مخصوص مطالعہ تھا۔ کیسی مرتب تقریر ہوتی جیسے اقلیدس کی کسی شکل کی وضاحت۔ انگریزی کا تلفظ ہم میں سے بعضوں کو عجیب سا لگتا تھا۔ معلوم ہوا کہ آکسفورڈ کا یہی لب و لہجہ تھا۔ پوچھا آخر مولانا محمد علی بھی تو آکسفورڈ کے تھے ان کے انگریزی تلفظ میں یہ غرابت کبھی نہیں محسوس ہوئی۔ ایک صاحب پاس ہی کھڑے تھے بولے یہ اردو اور دہلی کا فیضان ہے جو انگریزی تلفظ اور لب و لہجہ کے کھردرے پن اور ثقالت کو اپنے سان اور خراد پر چڑھا کر سلیس اور گوارا بنا دیتا ہے۔ ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو یہ امتیاز حاصل نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت کچھ زیادہ اہم نہیں معلوم ہوئی لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا قائل ہو گیا۔ البتہ اس کا تعجب ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں ایک ساتھی نے اپنے ایک معمولی ساتھی طالب علم پر کس تحمل اور تواضع سے یہ نکتہ واضح کر دیا۔

ہندو راج تھا نہ مسلم راج لیکن آبرو، عافیت اور رفاقت کا زمانہ تھا جب ہندو کافی ہندو تھا اور مسلمان کافی مسلمان۔ انگریز بھی کچھ کم انگریز نہ تھا۔ نواب محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سکریٹری تھے جنھیں کالج میں ہندوؤں کو اپنے لڑکوں سے ملا دینے، دونوں کو خوش کرنے اور دونوں سے زیادہ خوش ہونے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اس میں نہ ہندو کی

قید بھی نہ بندہ نوازی۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن، مسز سروجنی نائیڈو، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ کے نامور داستان گو باقر علی وقتاً فوقتاً سب کو کالج میں بلا لائے اور سب ایسے خوش ہوئے کہ بیان کی زندگی کے بڑے کارناموں میں ایک تھا۔ آپ کے پیشروؤں نے اس طرح اُن کی پذیرائی اور مدارات کی جیسے یہ آپ کے بڑے سے بڑے بزرگوں میں تھے، اسی سے کالج کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ اس وقت کے آپ اور آپ کا علی گڑھ ایسا ہی تھا۔

ہندو کالج بنارس کے بانی پنڈت مدن موہن مالوی کالج کی دعوت پر تشریف لائے اور وہاں کی ہاکی ٹیم میچ کھیلنے اور یہاں کے طلباء سے روابط پیدا کرنے اور بڑھانے کے لئے آئی۔ پنڈت مالوی ہندو دھرم ہندو سماج وہندو آدرش اور ہندو فکر و عمل کے امام وقت مانے جاتے تھے۔ مذہب و مسلک میں اس درجہ تقشف تھا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن تشریف لے گئے تو اشیائے خورد و نوش اور باورچی ہندوستان سے ساتھ لے گئے تاکہ آب رووانہ" کا اطلاق استعادۃً بھی نہ ہو سکے۔ علی گڑھ تشریف لائے تو سر سے پاؤں تک سفید لباس میں ملبوس سر پر سفید ہی صافہ گردن سے گھٹنے تک سفید انگوچھا لٹکتا ہوا جیسے سفید پھولوں کا گنجان ہار زیب گلو ہو۔ پاؤں میں صاف سپید ربر سول جوتا اس لئے کہ چمڑے کو پوتر نہیں سمجھتے تھے۔ طبعاً بڑے سنجیدہ خاموش اپنے کو بہت لئے دیئے ہوئے آواز نرم اور اثر کرنے والی ایک گھنٹہ تقریر کی ہوگی، جذبات و تکلفات سے دور جیسے کسی مذاکرے محفل یا مجمع میں نہیں بلکہ کوئی پروفیسر یونیورسٹی کے اونچے درجوں میں لیکچر دے رہا ہو۔ یہاں تک کہ ہم کو اس کا کوئی موقع نہ ملا کہ ہم تحسین سے اس کے بعض حصوں کا خیر مقدم کر سکتے۔ پنڈت مالویہ کو فارسی اور اردو میں اچھا درک تھا۔ اردو میں شیریں اور شائستہ گفتگو کرتے۔ کس کو یقین آئے گا کہ جس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں اس میں شاید ہی طبقہ اعلیٰ اوسط یا اس سے کم درجہ کا بھی شہراتی یا قصباتی ہندو ایسا ہوتا جو بے تکلف صحیح اور سلیس اردو بولنے پر قادر نہ ہوتا۔ تقریر سے فارغ ہونے کے بعد آس پاس کے طلباء سے بڑی دلنشیں اردو میں باتیں کرتے رہے اور

ایک لمحہ کے لئے بھی کسی نے محسوس نہیں کیا کہ ہندو مذہب اور ہندی زبان کے کتنے اور کیسے شیدائی تھے۔ پنڈت مالوی کی اس خوبی کا ہم پر بہت اچھا اثر پڑا اور لئے دیئے رہنے کے باوجود طلباء کے آداب اور یونین کی گلریزی اور گل افشانی کا باربار ذکر کرتے رہے۔

ہندو کالج کی ہاکی ٹیم میچ کھیلنے علی گڑھ آئی۔ خالص ہندو ٹیم اور کلیتہً مسلمان ٹیم میں ایسا دوستانہ میچ شاید ہی کسی نے کبھی دیکھا ہو۔ تمام شہر میچ دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑا تھا۔ موجودہ نہرو پارک (نقوی پارک) پہلے ایک چٹیل میدان تھا۔ کالج کے فٹ بال اور سائیکل پولو کے میچ اور مشق یہیں ہوتی تھی۔ جس شام کو علی گڑھ اور بنارس کا ہاکی میچ ہونے والا تھا اس میدان میں کھیل کی فیلڈ کا نہیں دہلی کے کسی جید جلسہ جلوس کا گمان ہوتا تھا دونوں ٹیمیں اس ہنرمندی، شرافت اور تندہی سے کھیلیں کہ سارا میدان رہ رہ کر تماشائیوں کی تحسین آفریں سے گونجنے لگتا۔ کھیل ختم ہوا تو دونوں طرف سے کھلاڑی بے اختیار ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے اور کسی طرح یہ نہیں محسوس ہوا کہ کون ہندو تھا اور کون مسلمان۔ سارا مجمع شام کے پھیلتے ہوئے سایہ میں تحلیل ہوگیا۔ رات کا بیشتر حصہ ہر دو ٹیم کے اراکین نے دعوت، کی تواضع اور تفریح و انبساط میں گزار دیئے کھیل کے میدانوں اور امتحانوں کے ہالوں اور عام زندگی میں آجکل جیسے حادثے پیش آتے رہتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی کیسے کیسے دن اور دیکھنے ہیں جب یہ حال ہو کہ ملک کا تقریباً ہر کس و ناکس اپنے فعل کو خواہ وہ کتنا ہی سنگین و شرمناک کیوں نہ ہو ہر احتساب اور مواخذ سے بری سمجھتا ہے۔

بنارس ہندو کالج سے متعلق ایک قصہ سنئے۔ اس کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ اپنی یونیورسٹی اور بنارس یونیورسٹی میں وہ یگانگت اور وہ ربط نہیں پایا جاتا جو تقسیم ملک سے پہلے تھی اس وقت دونوں کا رشتہ اور روایت علمی اور تہذیبی تھی دونوں اتر پردیش میں واقع درسگاہیں جو ہندو مسلمانوں کی بہترین آرزوں اور بلند عزائم کا سرچشمہ تھا تقسیم ملک کے بعد کچھ اور ہوگیا جسے دونوں یونیورسٹی کے لئے مبارک فال سمجھتا ہوں ہندو یونیورسٹی کے لئے قصہ یہ ہے کہ۔ ملک کی عزیز ممتاز اساتذہ اور بڑا

ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ہیبت و ہلاکت کی خبریں آ رہی تھیں یونیورسٹی کے ایک ضروری کام سے پروفیسر محمد حبیب خاں مرحوم کو بنارس ہندو یونیورسٹی جانا پڑا۔ جاتے ہی بیمار پڑ گئے۔ کچھ دنوں صاحب فراش رہ کر وہیں وفات پا گئے علالت کے پورے زمانے میں ہندو یونیورسٹی کے ہر چھوٹے بڑے نے مرحوم کی جس طرح دیکھ بھال کی۔ ہمہ وقت صحت و آرام کا اہتمام رکھا گیا۔ بہترین ڈاکٹروں کی خدمات وقف رہیں اور میت کو جس احتیاط و احترام سے علی گڑھ پہنچایا گیا اُسے ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔ کاش دونوں یونیورسٹیوں میں وہی شب و روز واپس آ جائیں یہ آپ طالب علم ہی کر سکتے ہیں لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے کبھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے شاید نہ یہ کام دو ذہن کی آزمائش سے نیچے اترنے لگا ہے کچھ بھی ہو آپ نوجوانوں کو اپنی اور اپنے ملک کی خوشحالی اور اقبال مندی کا راز اور راستہ اپنے ہی میں ڈھونڈنے اور کام میں لانا پڑے گا۔

یہاں ایک محترم اولڈ بوائے عبدالرحمن سندھی (صدیقی) کا تعارف آپ سے کرانا چاہتا ہوں نواب محمد اسحاق خاں کے پرسنل سکریٹری تھے۔ بڑے ذہین طباع شوخی اور شائستگی دونوں سے آراستہ گندم رنگ، وسط قد ترشا ہوا نقشہ ایسا شریفانہ رکھ رکھاؤ کہ دیکھتے ہی آدمی بھروسہ کرنے لگے کتنا وسیع اور متنوع مطالعہ تھا کہ ہر مسئلہ اور موضوع پر بڑے عالمانہ اور ضرورت دیکھی تو قلندرانہ انداز میں گفتگو کرتے اور کامیاب رہتے۔ کسی کی کم ہمت ہوتی کہ ایسے موقع پر بے تکلف ہونے کی جرأت کر سکے۔ اپنے زمانے کے اعلیٰ پایہ کے انگریزی مقرر مانے جاتے تھے ایسے عہد میں جب کہ کالج میں اچھے سے اچھے مقرروں کی کمی نہ تھی۔ کیسا جی لگتا انکی تقریر سننے میں۔ لب و لہجہ میں کیسا ٹھہراؤ اور شیرینی، جہاں تہاں طنز و ظرافت سے اس طرح کام لیتے جیسے صباد صہبا نہ پئے ہوں گھومتے پھرتے کبھی کبھی کپ بار کی طرف آ نکلتے تو آناً فاناً خبر پھیل جاتی کہ رحمن صاحب آئے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے چاروں طرف ایسا مجمع ہو جاتا جیسے بڑے بھائی کے گرد چھوٹے بھائیوں کا سب سے محبت ہمت افزائی اور تفریح تفنن طبع کی باتیں کرتے اور تھوڑی دیر میں رخصت ہو جاتے۔

انگریز اور انگریزی حکومت کے بالکل عاشق نہ تھے لیکن وہ اس طرح بدگمانی اور بیزاری سے

روگ کی شکل میں ان پر غلبہ پالیا ہو۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور شہرت سے کالج کا یورپین اسٹاف ان سے چوکنا رہتا اور ان کا احترام بھی کرتا۔ رحمٰن صاحب چھوٹوں کے بڑے اور بڑوں سے کچھ نکلتے ہی ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کالج کے ایسے شیدائی کم ہی دیکھے گئے۔ یونین کی طرح اولڈ بوائز ایسوسی ایشن سے بھی کچھ کم الفت نہ تھی اور یہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا وہ زمانہ تھا جب اس سے کالج کا یورپین اسٹاف بھی خائف رہا کرتا۔ یاد آتا ہے کہ ایک بار اولڈ بوائز کے سالانہ ڈنر میں یورپین اسٹاف بہت کم تعداد میں شریک ہوا۔ اس پر اولڈ بوائز کے اکابر نے ڈنر کی تقریروں میں اس طرح باز پرس کی کہ یورپین اسٹاف نے پھر کبھی غیر حاضر رہنے کی جرأت نہیں کی۔

تفریحاً گالی دینے میں رحمٰن صاحب جیسا موزوں طبع میں نے نہیں دیکھا جس موقع پر بڑے شعرا کا کوئی شعر کام نہ دے سکتا رحمٰن صاحب کی گل افشانی دشنام کام دے جاتی۔ غالب کا نظریہ : " لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی "

رحمٰن صاحب کی گالیوں پر پورے طور پر صادق آتا تھا۔ یونین کی ایک میٹنگ یاد آتی ہے۔ پہلے یونین کا صدر بحیثیت عہدہ کالج کا پرنسپل ہوتا اور نائب صدر منتخب شدہ طالب علم صدارت کے لئے صدر اسی وقت آتا جب کوئی غیر معمولی موقع ہوتا۔ ایسی ہی ایک میٹنگ تھی کالج کے پرنسپل جے ایچ ٹول (J. H. TOWLE) صدارت کر رہے تھے۔ زیر بحث مسائل بغیر بحث و مباحثہ کے پاس ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ ٹول صاحب کو مخاطب کر سکے۔ بعضوں نے کی تو التفات نہیں کیا گیا۔ حاضرین احتجاج و اضطراب کے فشار میں مبتلا تھے۔ اتنے میں ہال کے ایک کونے سے کچھ تھرتھراتی کچھ لڑکھڑاتی آواز آئی :

SIR, WITH ALL THE TIMIDITY AT MY COMMAND
I BEG TO SUBMIT..........

رحمٰن صاحب کی آواز اور فقرہ تھا۔ ٹول صاحب مسکرائے (موصوف کو مسکراتے کم کسی نے دیکھا تھا) سارا مجمع یک لخت ہنس پڑا مطلع صاف ہو گیا اور کارروائی معمول پر آ گئی۔

انجمن آرائی میں سید راس مسعود صاحب، رحمٰن صاحب اور مسز سروجنی نائیڈو کا

شل مجھے اب تک کوئی اور نہ ملا۔ کیسا ہی موقع ہو کیسے ہی لوگ ہوں ان کی گرفت سے باہر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ہر سطح ذہن ذوق اور مسلک و مشرب کے لوگوں کو اپنی توجہ و تواضع اور عالی منشی سے گرویدہ کر لیتے تھے۔ بعض تصاویر یا مجسمے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آرٹسٹ نے ان کی آنکھوں کی ساخت اس طرح رکھی ہے کہ وہ ہر شخص کو اسی کی طرف دیکھتی اور توجہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں یہی حال ان تینوں کا تھا۔ ان کی محفل سے جو نکلتا وہ یہی محسوس کرتا کہ اس دن کا ہیرو وہی تھا ان کے قریب رہ کر ایسا محسوس ہوتا جیسے نہ یہ کبھی بوڑھے اور باسی ہوں گے نہ ہم کو ہونے دیں گے۔ پھر رحمٰن صاحب علی گڑھ سے چلے گئے۔ کچھ دنوں کلکتہ کی ایک فرم سے وابستہ رہے۔ ملک تقسیم ہوا تو پاکستان تشریف لے گئے اور بڑے ممتاز مناصب پر فائز رہ کر وہاں پہنچ گئے جہاں آگے پیچھے سبھی پہنچنے والے ہیں۔

اردو میں تقریر کرنے کا معیار بہت اونچا تھا۔ انگریزی تقریر میں جہاں تہاں کوئی نیچ اونچ ہو جاتی تو اسے اکثر نظر انداز کر دیتے۔ اردو تقریر میں ان لوگوں کی لغزش معاف نہیں کی جاتی تھی جو اردو خطہ کے باشندے اور جن کی مادری زبان اردو ہو اردو کے بعض سر پھرے یہ کہتے کہ مادری زبان غلط بولنا غداری ہے جسے کبھی گوارا نہ کرنا چاہئے۔ عرض کر چکا ہوں کہ ام۔ اے۔ او کالج کے زمانے میں اوّل درجہ کا (CRICKETOR) کرکیٹر اور اعلیٰ پایے کا یونین کا مقرر، اسٹاف کے اکثر ارکین سے زیادہ قابل لحاظ سمجھا جاتا تھا آج کل جو صورت احوال ہے وہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ کیسا رنج اور کتنی مایوسی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ اتر پردیش جو اردو کا کعبہ اور کیلاش تھا وہاں جن نوجوان لڑکے لڑکیوں کی مادری زبان اردو ہے یا کبھی تھی، وہ والدین، عزیزوں اور دوستوں کو ہندی میں خط لکھنے لگے ہیں اور اردو سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ یہ قصور نہ ہمارا ہے نہ ہماری اولاد کا نہ خود ہندی اور ہندی دوستوں کا۔ گناہ اس ریاست کے متعلقہ سربراہوں کا ہے جنھوں نے ہماری مسلسل فریاد و فغاں کے باوجود ہم کو ہماری زبان سے محروم کرایا۔ حکومت کی زبان ہونے کی حیثیت سے ہندی میں زیادہ

سے زیادہ استعداد پیدا کرنا بمنزلہ لوازم کے ہے اور اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اسی طرح مادری، مذہبی اور تہذیبی زبان ہونے کے باعث اردو پر عبور اور اس کا التزام و احترام ہمارے فرائض میں ہے اور اس کے لئے سہولت فراہم کرنا حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ ہندی اور اردو کے ساتھ ساتھ عالمی زبانوں میں ہونے کے اعتبار سے ہر ملک اور ہر قوم اور ہر طرح کے مسائل و مذاکرات سے اچھی واقفیت اور بہرہ مند رہنے اور علوم و فنون سے فیضیاب ہونے اور رہنے کے لئے انگریزی سے اچھی واقفیت رکھنا بھی ازبس ضروری ہے۔

مادری زبان سے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت رہی، غیر مسلم باشندے فارسی اور اردو اس شوق اور محنت سے سیکھتے تھے کہ ان میں سے اکثر اہلِ زبان کے درجہ تک پہنچ جاتے۔ انھوں نے بڑی خوشی اور فخر سے اردو کو اپنایا لیکن یہ خصوصیت غیر مسلم مردوں کی تھی ان کی بیشتر خواتین اور لڑکیاں مادری زبان سے وابستہ رہیں۔ استثنار سے قطع نظر۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی مادری زبان کو کسی قسم کی محرومی کا سامنا نہیں ہوا۔ دوسری طرف ان کے مردوں نے وہ تمام فوائد حاصل کئے جو حاکم اور حکومت کی زبان پر قدرت رکھنے سے ان کو میسّر آسکتے تھے۔ اس طرح خواتین نے مادری زبان کو ہرگز ند سے محفوظ رکھا اور مردوں نے اکتسابی زبان سے ہر طرح کا نفع اٹھایا۔ اس دلچسپ صورت حال سے آپ نوجوان لڑکے لڑکیاں باخبر رہیں تو دونوں کا ہم پر بڑا احسان ہوگا۔ اردو کے ساتھ کچھ دنوں سے غیر معمولی اچھا سلوک کیا جارہا ہے۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔

جہاں تک اکاڈمی انعامات اور طرح طرح کی تصانیف و نصابی کتب و تراجم لغات وغیرہ کی طباعت واشاعت کا تعلق ہے ہم میں ہر شخص حکومت کا سپاس گزار ہے۔ یہ بے دریغ بخشش اور کرم بے حساب ذوق وظفر کے زمانے میں اردو کو نصیب ہوا نہ انیس و اقبال کے عہد میں۔ لیکن اس سے اردو کو وہ فائدہ نہیں پہونچ رہا ہے جس سے وہ مدت دراز سے محروم ہے۔ اس کا اور اس سے کام لینے والوں کا یہ بنیادی حق ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے کماحقہٗ فائدہ اٹھائیں،

ان زود پشیمانوں کو کس طرح کوئی سمجھائے کہ پورے طور پر اردو سیکھے بغیر اردو کا ڈپلو کس کام کی۔ انعامات کس کو دیے جائیں گے طباعت و اشاعت کن اور کیسی تصانیف کی ہوگی۔ مادری زبان سکھانے پڑھانے والی مائیں کہاں سے لائی جائیں گی اور اس قانون کی کیا وقعت رہ جائے گی جن میں اقلیتوں کے حقوق کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کی ضمانت دی گئی ہے۔ اردو پر ہم روضہ نہیں تعمیر کرنا چاہتے اس کو شارع عام دینا چاہتے ہیں۔ ہم بخشش کے خواستگار نہیں ہیں حق رسی کے طلب گار ہیں۔

یونین کے مباحثوں کے معیار کا اونچا ہونا تعجب کی بات نہ تھی۔ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس کی تاسیس و تشکیل آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونینوں کے نقشہ اور روایات پر ہوئی تھی جن کو فروغ دینے میں ان انگریز پروفیسروں کو بڑا دخل تھا جو خود آکسفورڈ اور کیمبرج کی مجلسوں کے صدر رہ چکے تھے اور اعلیٰ تعلیم گاہوں میں اعلیٰ مجالس اتحاد (یونین) کی صحت مند سرگرمیوں کی قدر و قیمت پہچانتے تھے۔ ان کے اس احسان کو ہم کبھی فراموش نہ کریں گے۔ دوسرے یہ کہ تقریباً تمام طالب علم ان مذہبی عقائد اور تہذیبی روایات اور طور طریقوں سے بہرہ مند ہوتے اور ان کا احترام کرتے جن سے ہر مسلمان گھرانے کا چھوٹا بڑا چاہے وہ ان پر پورے طور پر عمل بھی کرتا ہو یا نہیں، آشنا تھا۔ یہ شعائر اس عہد کے نوجوانوں کے لاشعور میں خواہ وہ معاشرے کے کسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں پیوست ہوتے اور برابر اپنی یاد دلاتے رہتے مثلاً خدا، رسول، نماز، روزہ، حرام، حلال، ستر، طہارت ایسے عقائد اور حقائق تھے جن کو مسلمان گھرانا نظرانداز نہیں کرتا تھا۔ یہ وہ فضائل ہیں جو دوسرے محاسن کی ترغیب دلاتے رہتے اور طرح طرح کے منہیات کے مانع ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ باوجود ان تمام مکروہات اور معاصی کے جن میں وہ گھر گیا ہے آج بھی نوجوان مسلمان ان شعائر کا کسی نہ کسی حد تک ضرور لحاظ رکھتا ہے جن کی مذہب، اخلاق اور روایات کی تاکید ہے۔ یہ اس لئے کہتا ہوں کہ شاعر ہی نہیں اچھا مقرر ہونے کے لئے بھی اچھا آدمی ہونا ضروری ہے جس کی صراحت اوپر کر چکا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں مقرر اور شاعر کا میرا آپ کا تصور مختلف نہ ہو۔

یونین میں اب جو ہلکا پن اور سطحیت راہ پا گئی ہے اور اس کا وقعت و احترام جو کبھی اس

کا نمایاں امتیاز تھا جس طرح قصۂ ماضی بنتا جارہا ہے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ آپ اعلیٰ پایہ کی بحثیں اور مذاکرے اور ممتاز شخصیتوں کی وقتاً فوقتاً تشریف آوری سے محروم رہنے کے باعث اپنا دیرینہ آب و رنگ اور قدر و قیمت کھونے لگے ہیں اور اس کی جگہ بے وقعت اور پادر ہوا سیاست نے لی ہے۔ اس طرح کی سیاست گری آج جس طرح ہم کو آپ کو خوار اور کم عیار کر رہی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میری گذارش ہے کہ آپ اس طرح کی بازاری سیاست سے نہ اپنا دامن آلودہ کریں نہ اس ارادہ کو بازیچۂ اطفال بننے دیں۔ سیاست میں ہمارا وہی رویہ ہونا چاہئے جو ہمارے ملک و وطن، ہمارے بنیادی اغراض و مقاصد اور ہمارے ادارے کے اعلیٰ روایات کے مطابق اور شایانِ شان ہو۔

اس وقت ہم زمانہ اور زندگی کے ایسے مرحلے سے گذر رہے ہیں جہاں آپ نوجوانوں کو سیاست کے مکائد و مکروہات سے دور اور محفوظ رکھنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے لیکن ان کے اٹھائے ہوئے فتنوں کو کم سے کم ضرر رساں کرنے کی کوشش سے نہ بوڑھوں کو مایوس ہونا چاہئے نہ آپ نوجوانوں کو بے پروا۔ تفصیل اکثر طوالت ورنہ تنازعہ کا باعث ہوتی ہے۔ مجھے دونوں سے دلچسپی ہے لیکن اس عہد رفتہ کی کچھ باتیں یاد آرہی ہیں لیکن نہ ایسی جن کے لئے ساز کی ضرورت ہو یا عمر رفتہ کو آواز دینے کی۔ بچے گھر کی بوڑھیوں سے شہزادہ، شہزادیاں اور جادوگر جادوگرنیوں کے قصے سنتے سنتے سو جاتے ہیں۔ آپ نوجوان ہیں۔ بہت ممکن ہے بوڑھے مغنی کے آوارہ نغموں سے آپ بیدار ہو جائیں اگر بیدار ہونے کی ذمہ داری قبول کرنے کا حوصلہ باقی رہ گیا ہو۔

بہت دن ہوئے تقریباً ۴۰ - ۴۵ سال۔ بعض تکالیف اور متعدد آپریشن کے سلسلے میں عرصہ تک کنگ جارج میڈیکل کالج اسپتال لکھنؤ میں گذارنے پڑے۔ صحت یاب ہوا تو اپنے مکرم بزرگ سید ظفر الملک مرحوم ایڈیٹر "الناظر" سے فرمائش کی کہ یوروپین وارڈ

میں اچھے سے اچھے ڈاکٹر، خوبصورت سے خوبصورت نرسوں، جان چھڑکنے والے عزیزوں اور دوستوں کی خدمات، لذیذ تر کھانوں، لکھنؤ کے مشہور پھلوں اور مٹھائیوں سے لذت یاب حضرت شاہ مینا کی درگاہ کی قوالی سے فیض یاب اور شمبھو مہاراج کی کتھا کلی رقص سے لطف اندوز ہونے کے بعد جی چاہتا ہے کہ آپ کے توسل سے لکھنؤ کے بعض عجوبۂ روزگار شخصیتوں کی خدمت میں بھی حاضر ہوں اگر آپ کے علاوہ اور کوئی رہ گیا ہو۔ مولانا اس طرح مسکرائے جیسے اتنا مسکرانا ہفتہ بھر کے لئے کافی تھا۔ موصوف تقریباً ہر روز مجھے دیکھنے چلے آیا کرتے تھے۔ خاص طور پر ان اوقات میں جب مریضوں سے ملنا ممنوع ہوتا اور اس کی تلافی یوں کرتے کہ ٹھیک اس وقت واپس جاتے جب مریضوں سے ملنے کی عام اجازت ہوتی۔ نرسیں ان کی سج دھج اور سراپا سے خوف کھاتیں اور ڈاکٹر ان کی قومی خدمات کا بڑا لحاظ کرتے اس لئے کوئی مانع نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا اور اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ غالباً نخاس اور اس کے آس پاس کا خطہ تھا یا کوئی اور جگہ ہو ٹھیک یاد نہیں پیچدار، تنگ و ناصاف گلیوں اور ناشائستہ حال مکانوں سے گذرتے ہوئے ایک جگہ پہنچے جو نسبتاً بہتر تھی۔ دروازے پر پردہ لٹکا تھا۔ مولانا نے آواز دی، خادمہ آئی، اور اندر بلا لیا۔ ہم دونوں داخل ہوئے ایک معمر بزرگ بڑھاپے کے سارے آزار اور شرافت کے جملہ اوصاف میں مبتلا چارپائی پر تکیئے کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے تپاک و تواضع سے ملے ظفر الملک صاحب نے مزاج پرسی کے بعد میری طرف اشارہ کر کے تعارف کرایا۔ طویل بیماری سے صحت یاب ہوئے ہیں لکھنؤ کی نادرہ روزگار شخصیتوں سے ملنے کا شوق ہے۔ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔

بڑے شوق اور شفقت سے ملے۔ گفتگو زیادہ تر لکھنؤ کی زبان، شاعری، شائستگی آداب و روایات، ماضی و حال پر کرتے رہے۔ ایسی شستہ و رفتہ زبان اور لب و لہجہ کہ بس سنا کرے کوئی۔ ایک موقعہ پر فرمایا (اس کا ذکر اس زمانے کے مضمون میں کر چکا ہوں) آج کم و بیش

بیس سال سے محلہ سے باہر قدم نہیں رکھے۔ معلوم نہیں کہاں غلط زبان سنتے یا کسی گنوار سے ملنے کا حادثہ پیش آجائے! اس وقت سوچتا ہوں کیا حالت ہوتی اگر آج مرحوم زندہ ہوتے اور ان کو غلط زبان سننے کے ساتھ غلط شکلیں بھی دیکھنا پڑتیں۔ یہ نصف صدی پہلے کے لکھنؤ کی تہذیب کا نقشہ تھا۔ دم بخود رہ گیا کہ زبان (اُردو) کے معیار و منزلت کا یہ احترام کہاں سے آیا اور کیوں کر آیا اور اس ہیلن کی بازیافت کے لئے کیسے کیسے ہومر ظہور میں آتے رہیں گے۔

اس سے پہلے کی وہ تصویر بھی آپ کے سامنے ہوگی جو محمد حسین آزاد نے آب حیات میں میر کی پیش کی ہے۔ آلام روزگار سے تنگ آکر میر نے دہلی سے لکھنؤ کا رخ کیا۔ ہم سفروں میں سے کسی نے گفتگو کرنا چاہی۔ میر طرح دے گئے۔ تھوڑی دیر بعد عرض کیا حضرت گفتگو سے راستہ آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ میر نے بد حظ ہو کر جواب دیا۔ جناب کا سفر کٹ جائیگا لیکن میری زبان خراب ہوگئی تو کیا ہوگا۔ یہی میر لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں پہونچتے ہیں تو ان کی سج دھج دیکھ کر لوگ مسکراتے ہیں۔ اس کا جواب میر نے "پورب کے ساکنو" کو جس قطعہ میں دیا ہے وہ آپ کو یاد ہوگا۔ غالب نے اپنے زمانے میں اس کا ماتم کیا ہے کہ اب دہلی میں اردو کہاں پنجابی کا غلبہ ہے۔ مثالیں کہاں تک دی جائیں آپ سے تو صرف یہ کہنا ہے کہ جس متاع گراں مایہ کی امانت دیوانوں کے سپرد تھی ان کا قصہ آپ نے سن لیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب آپ فرزانے کیا کرتے ہیں۔

صفی نے بڑی حسرت سے کہا ہے، زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے۔ سوال یہ ہے کہ گذشتہ یونین کی بڑائی کی داستان کہتے کہتے یا سنتے سنتے آپ اور میں دونوں سو گئے تو کیا ہوگا۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ بعض ایسے مسائل بھی معرض گفتگو میں آجائیں جن سے سونا حرام ہو جائے تو آنا ٹالا بھی نہ رہے۔ مثلاً کیا تدابیر اختیار کی جائیں جن سے پرانی یونین کی بازیافت نئے زمانے کے تقاضوں اور نئی نسل کے حوصلوں کے مطابق ہو جائے۔ ہم جس حال میں ہیں وہ ہمارے ماضی اور مستقبل دونوں کی

بارگاہ میں ہماری آپ کی طرف سے جواب طلبی اور جواب دہی دونوں پر ماموریں ہے مجبور بھی۔ یونین کی آباد کاری ہر حال میں کرنی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بدلے ہوئے اور بے اماں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں آباد کاری کن خطوط پر اور کن جہات میں ہو۔ حالات کے اس طرح کچھ کا کچھ ہوتے رہنے سے نہ پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ پشیمان۔ حالات کیسے ہی سنگین کیوں نہ ہوجائیں بالآخر انسان ان پر قابو پالے گا۔ اس لئے کہ انسانیت کو کبھی شکست نہیں ہوئی ہے۔ یونین کی اصلاح و ترقی کے لئے کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) یونین بہت کثیر العیال ہوگئی ہے۔ خاندان مشترک کے بندھن ڈھیلے ہوگئے ہیں ام۔اے۔او کالج کے مقابلہ میں اس کے اراکین کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے اتنے بے شمار نازک اور آتشگیر مسائل دفعتاً سامنے آگئے ہیں کہ کوئی مستقل انتظام دیر اور دور تک ساتھ نہیں دیتا۔ اس کا براہ راست، بڑا کاری اور دور رس اثر اس کے اقلیتی و اقامتی کردار پر پڑا ہے۔ یعنی جن لوگوں کے جن بنیادی مقاصد کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کے لئے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا وہ معرض خطر میں نہیں بلکہ سانحہ کی شکل میں سامنے آگئے ہیں۔ حکومت سے ہماری درخواست یہ ہے کہ اس ادارے کے اقلیتی کردار کو بہ تمام اجمال و تفصیل قانوناً تسلیم کیا جائے اور ان پر عمل کرنے کی سہولت فراہم کی جائے۔

جس صورتِ حال کا سامنا ہے اس میں ہم سب کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یونین کی رکنیت کو قابو سے باہر نہ ہونے دینا چاہئے۔ اس کی افادیت اور اہمیت کا بہت کچھ انحصار اس پابندی پر ہوگا۔ تعداد کو بے روک ٹوک بڑھنے دینے سے مشکوک عناصر و عوامل میں اضافہ ہوتا ہے، اور طرح طرح کی دشواریاں اور نزاکتیں سامنے آتی ہیں۔ ام۔اے۔او کالج میں یونین کی رکنیت پر کڑی پابندی عائد تھی۔ اس کی شکایت کبھی کسی نے نہیں کی۔ فوائد سب کے حصے میں آئے۔ یونین کے وزن اور

وقعت کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا یوں بھی حفاظت و حرمت صرف منتخب اشخاص یا جماعت یا ادارے کے سپرد کرنے اور رکھنے کے حق میں ہوں۔ یاد آتا ہے ام اے او کالج کے عہد میں ڈے اسکالرس سٹوڈنٹس یونین کے نہیں اپنی علیحدہ یونین ڈے اسکالرس یونین کے ممبر ہوتے تھے۔ خواص کے بغیر عوام کی حیثیت بیاباں میں سمت سے ناآشنا سفر سے معذور اور سالار سے محروم قافلے کی ہے۔

چاہتا ہوں کہ یونین میں تعداد کی تجدید کے مسئلہ پر بحیثیت مجموعی آپ غور کریں اور اس کا حل نکالیں۔ ایسے علمی اور تعلیمی ادارے ہو سکتے ہیں جن کی رکنیت پر پابندی ہو۔ بذاتِ خود میں یونین کی رکنیت کی توسیع کے حق میں اتنا نہیں ہوں جتنا تجدید اور تنظیم کے۔

(۲) حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ نوجوانوں کا عام رجحان بے راہ روی اور آشفتہ سری کی طرف ہے ایسی بے راہ روی جو کسی نوع کی ذمہ داری یا ڈسپلن کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اس کے سبب سے عزت نفس خلوص اور خود داری کی اہمیت باقی رہی نہ وقعت، زندگی ایک عالم گیر ہیبت و ہیجان کی گرفت میں ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ بہت سے اسباب کی بناء پر مسائل اتنے بڑھ اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے بھی قابو میں نہیں آتے اس کا نہایت سستا لیکن خطرناک اور نامبارک نسخہ یہ طے پایا ہے کہ بد اطواری کا علاج مزید بد اطواری سے کیا جائے یا ہونے دیا جائے۔ چنانچہ اب ہر طرح کے جرائم اور افعال قبیحہ و شنیعہ نہ صرف ناقابل اعتنا رہے بلکہ ان کو قانونی جواز بھی دیا جانے لگا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جرائم کے انسداد کی کوشش سے جرائم بڑھتے ہیں ڈھیل دینے سے زندگی کے معمولات بن جاتے ہیں اور گناہ، گناہ نہیں رہ جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اور جرائم سے قطع نظر

گذشتہ ۳۰-۲۵ سال میں جنسی معائب و مکروہات کے جواز کے جتنے قوانین وضع کئے گئے۔ اس سے پہلے شاید کئی سو سال میں نہیں کئے گئے ہوں گے۔ حکومت کے ارجنبد چاہے جو کہیں یا کریں، سارے آپ کے بزرگوں نے بتایا ہے کہ عورت کے ناموس کا نگہبان مرد ہے، عورت نہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ خواتین کی جدید نسل عصمت سے انحراف کو اہمیت نہیں دیتی اب آپ نوجوان ہی بتائیں، ایں چہ بوالعجبی است؟ آپ کو سن کر شاید تعجب ہو کہ تہذیب جدید کے دانشوروں نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ عورت کی عصمت کا جتنا لحاظ مرد کو ہوتا ہے اتنا عورت کو نہیں۔ آپ کے بوڑھے چاہتے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے اس لحاظ میں کمی نہ کریں۔

لیکن اس وقت میرے سامنے عالم کے اتنے مسائل نہیں ہیں جتنے علی گڑھ کے۔ آپ کی شب و روز کی سرگرمیوں میں ایسی باتوں نے دخل پالیا ہے جن سے آپ کی وقعت خود آپ کی نظروں میں گھٹ گئی ہو تو عجب نہیں۔ سنتا ہوں آپ میں سے کچھ پاس کے سستے اور عوام سے آباد ریستوران اور سنیماؤں میں کبھی خورد و نوش اور فلمی گانوں کے سننے میں مصروف ہوتے ہیں اور غیر ذمہ دار بیرونی اشخاص سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ آپ فرمائیں گے نوجوانوں کی اس انداز کی روک تھام اس زمانے میں نہیں کی جا سکتی۔ جس صفائی سے آپ یہ کہیں گے اس سے زیادہ خود اعتمادی اور احساس اور ذمہ داری رکھتے ہوئے میں عرض کروں گا کہ کہیں اور یا کسی دوسرے ادارے کے نوجوان ایسی عوامی یا بازاری زندگی چھوڑ سکتے ہوں یا نہیں علی گڑھ کے نوجوانوں کو اس طریقۂ زندگی سے دور رہنا پڑے گا۔ برائی برائی ہے چاہے اس میں آپ جیسے نوجوان ہی کیوں نہ مبتلا ہوں آس پاس ستھرا، صحت مند اور خوبصورت ہو تو نوجوان میں بگاڑ آ سکتا ہے نہ وہ اس میں عرصہ تک مبتلا رہ سکتا ہے۔ یونین کے گرد و پیش

کو خوشنما آباد اور مفید مطلب بنانے اور رکھنے کی کوشش کیجئے۔ ماریسن کورٹ اور
آپ کی یونین کے درمیان حصہ اور مشرقی اور مغربی قطعات کو ذاکر صاحب مرحوم نے
اپنے عہد وائس چانسلری میں بڑے شوق سے ایک پر فضا خیاباں بنانے کا اہتمام کیا
تھا۔ فرمایا کرتے کہ اس قطعہ کو ترقی دے کر "اسٹوڈینٹس کارنر" کی حیثیت دی جائیگی
جہاں طلبا روز روز کے شور و شغب اور ہنگامہ ہیجان سے دور رہ کر فرصت کے اوقات
اچھی فضا اچھے مشاغل اور ساتھیوں میں گذارا کریں گے جیسا کہ کہا گیا ہے "فراغتے وکتابے
وگوشۂ چمنے" میں نے عرض کیا تھا ذاکر صاحب شاید اسی شاعر نے یہ بھی کہا ہے "جامے
وبتے ودیر بیٹھے بر لب کشت" مسکرا کر فرمایا "کیا مضائقہ" اکثر مواقع پر ذاکر صاحب
یہ فقرہ بڑے لطف سے کہہ جاتے، چاہتا ہوں اس اسکیم کو آپ کامیاب بنائیں۔
اس طرح آپ کو اس فضا اور سوسائٹی کی دوری زیادہ شاق نہ گذرے گی جس کا
ذکر اوپر آیا ہے۔

انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج اور متعلقہ عمارات کی تعمیر ہو جانے کے باعث یونیورسٹی
کا رقبہ اب شمال مشرق کی طرف بڑھنے لگا ہے اور پرانا علاقہ یعنی وکٹوریہ گیٹ،
سرسید ہال، مہدی منزل سے مشتاق منزل اور مسجد تک کی عمارات، کرکٹ فیلڈ،
اولڈ بوائز لاج اور آپ کا یونین کلب جو کالج کی اعلیٰ روایات کا سرچشمہ اور امتیازی
علامات SYMBOLS میں داخل ہو چکی ہیں نسبتاً اتنی آباد اور آپکی طالب علمانہ سرگرمیوں کا
محور نہیں رہے جو پہلے کبھی تھے لیکن ان کی بڑائی اور دل آویزی میں کوئی فرق نہیں آیا
ہے۔ اس لئے خاص طور پر درخواست کروں گا کہ آپ یونین کی اعلیٰ روایات اور
اس کے گرد و پیش کو ستھرا، دل کش اور آباد رکھنے کے ساتھ یہ نہ بھولیں کہ اس
ادارے کی شان و شبیہہ وہی خطہ رہے گا جس کی نشان دہی ابھی کی گئی ہے۔

(۳) یونین کے احاطہ میں بچوں کا ایک اسکول اور اس کی چھوٹی سی عمارت ہے جو مضحکہ انگیز حد تک ناکافی ہے۔ ایک درخت کے گرد پختہ چبوترہ بنایا گیا ہے۔ اس پر بھی کلاس ہوتی ہے۔ اکثر یہ بتانا دشوار ہوا ہے کہ درخت پر پرندے چہچہا رہے ہیں یا چبوترے پر بچے۔ ماسٹر صاحب کی آواز "خاموش" "خبردار" پر باغ کے رکھوالے کی صداؤں کا دھوکا ہوتا ہے! اس مدرسہ کی پوری کفالت یونین کرتی ہے۔ میں اسے یونین کا خیر جاریہ سمجھتا ہوں۔ چند برسوں سے یونین کے تعلق یا تگ و دو کا جو نقشہ رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یونین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ اسکول ہے۔

کم استطاعت والدین کے بچے بچیاں اس اسکول سے جتنا فائدہ اب تک اٹھا چکے ہیں اور اٹھا رہے ہیں اس کا خیال کرتا ہوں تو دل خوش ہو جاتا ہے اور آپ کی کتنی خرد گذاشتیں فراموش ہونے لگتی ہیں۔ میں اسکول کی اندرونی درو بست سے واقف نہیں ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کچھ ایسے مستقل انتظامات کردیں کہ یہ اسکول ہمہ جہتی ترقی کرے اور کرتا رہے نیز یونین اور یونین کے الکشن کے گاہے جنیں گاہے پنہاں سے محفوظ رہے، ساتھ ہی ساتھ عملہ کی فرض شناسی پر مستقلاً کڑی نظر رکھی جائے۔ اسکول سے قریب کی مسجد میں بچوں کا مکتب ہے۔ اسکول اور مکتب دونوں کو مشترکہ نظم و نگرانی میں کر دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

(۴) یونین کا بجٹ بناتے وقت اس اصول کو خاص طور پر مدنظر رکھنا چاہیئے کہ بجٹ یونین کی ضروریات کے مطابق بنایا جائے، منسٹری کے اغراض و مصالح کے پیش نظر نہیں۔ بر سرکار منسٹری کے اخلاقی فرائض میں ہے کہ آنے والی

منسٹری کے لئے حتی الامکان واجب الاصول بل نہ چھوڑے۔ غیر معمولی تعداد میں واجب الادا بل چھوڑنا رخصت ہونے والی منسٹری پر ایک گونہ بے اعتمادی کا ووٹ ہے۔ یونین کا مقصد تقریر کی مشاقی، گفتگو اور مباحثے میں پارلیمنٹری آداب و روایات کا لحاظ، تقریری اور تحریری مقابلوں کے لئے گراں قدر انعامات کی منظوری اعلیٰ شخصیتوں کو معرکۃ الآرا مسائل و مباحث پر اظہار خیال کرنے کی دعوت دینا اور ہمارے ممتاز طلبار کا ان میں حصہ لینا۔ اعلیٰ معیار اور پیمانے کے مشاعروں اور مذاکروں کا انعقاد اور یونیورسٹی کی عام شہرت کو محفوظ رکھنے اور آگے بڑھنے کا اہتمام و انصرام ہے کچھ اور نہیں۔

یونین کا سرمایہ آمدنی زیادہ تر انہیں مقاصد کے لئے محفوظ اور مخصوص ہونا چاہئے۔ معلوم نہیں یونین کا کوئی سرمایہ محفوظ بھی ہے یا نہیں۔ کسی ادارے کی ساکھ کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ یونین کا سرمایہ و ثروت کسی فرد یا جماعت کی آمدنی نہیں، یونین کے اراکین کی امانت ہے اس سے انحراف آپ ہی بتائیں کیا ہے؟ کسی چھوٹے بڑے ادارے کی خوبی یا خرابی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کی آمدنی کیسے لوگ کس طرح کام میں لاتے ہیں۔ ایک لطیفہ سناؤں، واقعہ اس لئے نہیں کہتا کہ شاید آپ کو اس کا یقین نہ آئے۔ یونین کے شمالی سمت کے کمرے اور برآمدہ کسی وقت آنریری سکریٹری (اب وائس چانسلر) کا دفتر تھا۔ نواب وقار الملک مرحوم سکریٹری تھے۔ کالج کا سرکاری کام ہوتا تو آفس کے قلم دوات کاغذ سے کام لیتے ذاتی ہوتا تو اپنی اسٹیشنری کام میں لاتے جو میز پر ایک سمت رکھی ہوتی۔ پروفیسر محمد حمید الدین خاں مرحوم جب کسی کی بداعمالی یا خورد برد کا قصہ سنتے تو اپنے اس چشم دید واقعہ کا ضرور ذکر کر دیتے۔ جی چاہتا

ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی قائم کی ہوئی اس روایت کی ابتدا کسی نہ کسی حد تک آپ کے عہد اور عہدہ داروں سے کی جایا کرے۔

(۵) کچھ دنوں سے یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ یونیورسٹی سے اپنا مطالبہ منوانے کے لئے آپ بھوک ہڑتال وغیرہ کے طریقے کام میں لانے لگے ہیں۔ جواز میں غالباً مہاتما گاندھی کے برت رکھنے کی مثال ہوگی۔ ذاتی طور پر میں اس طریقۂ کار یا استدلال کو درست نہیں سمجھتا۔ مہاتما جی نے اس کو سیاسی یا وقتی مصالح کی بنا پر نہیں کلیتہً روحانی و اخلاقی سطح پر صفائے قلب اور تزکیۂ باطن کی بے پایاں آزمائشوں اور ریاضتوں سے گذرنے کے بعد اختیار کیا تھا۔ جب تک کوئی مہاتما جی کی شروع سے آخر تک کی بپتاؤں سے نہ گذرا ہو اس کو ان کے اس طریقۂ کار کو اختیار کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مہاتما گاندھی نے اعلیٰ اقدار اور عزیمتوں کی جیسی زندگی گذاری تھی اس کو نظر انداز کر کے یا اس کی تاب نہ لاکر ان کے مرن برت کا اپنی مشکوک اور کہے دن کے معمولات کے حصول کا وسیلہ بنالینا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ اعلیٰ کو ادنیٰ کی چاکری میں دیدینا ہے جسے آپ کو ہرگز گوارا نہ کرنا چاہئے۔ کسی حال میں نہ آپ یونیورسٹی کے خلاف صف آرا ہو سکتے ہیں نہ یونیورسٹی آپ کے خلاف۔ تعلیم گاہوں کو یہ فارمولا ہمیشہ کے لئے اپنا لینا چاہئے۔

اس بارے میں میرے سوچنے کا انداز ایک قصہ کی بنا پر بھی ہے جو ایک دوست سے کبھی سننے میں آیا تھا۔ آپ بھی سنئے۔ آپ کو تفریح ہوگی تو مجھے ثواب ملے گا۔ کہیں شادی کی تقریب تھی۔ دولہا دلہن کے اعزا و احباب جمع تھے۔ عقد نکاح کا وقت آیا تو مہر کی رقم پر گاڑی رک گئی۔ دولہا کی طرف سے مہر فاطمی پر اصرار ہوا۔ لڑکی والوں کے لئے یہ تالیِ قبول نہ تھا۔ جھگڑا بڑھا تو ایک بزرگ سامنے آئے جن سے شادی کے فریقین ہی نہیں سارے حاضرین شناسا بھی تھے اور خائف بھی۔ ان کی ہیئت وحیثیت

بمنزلہ ان کے آنریری دادا اور قصبہ کے خدائی فوجدار دادا کی تھی۔ جہاں جیسا دیکھتے وہاں ویسا رول اختیار کرتے۔ جھگڑا بڑھتا ہوا نظر آیا تو مجمع پر قابض و متصرف ہو کر لڑکے والوں سے فرمایا مہر فاطمی سر آنکھوں پر لیکن یہ بتاؤ دولہا حضرت علی ہیں یا دلہن حضرت فاطمہ؟ جواب نفی میں ملا تو بولے پھر مہر فاطمی کیوں اور کیسے؟ جب دولہا حضرت علی اور دلہن حضرت فاطمہ ہونے لگیں گی اس وقت مہر فاطمی کا مسئلہ اٹھانا فی الحال مہر کی رقم وہی ہوگی جو برادری میں عام طور پر رائج ہے مانتے ہو تو خیر ورنہ ہرجانہ ادا کرو اور بھاگ جاؤ۔ دادا کا فیصلہ بے چون و چرا تسلیم کر لیا گیا۔ اور تقریب بخیر و خوبی انجام کو پہنچی۔

ام اے او کالج کے قیام سے لے کر اس کے یونیورسٹی میں منتقل ہو جانے تک اس ادارے کا آنریری سکریٹری ہندوستانی مسلمانوں کا متفقہ طور پر سربراہ ہوتا تھا یہ صورت حال کسی خاص تحریک آئین یا ضابطہ کی بنا پر نہ تھی۔ اس کا سبب کلیۃً سرسید کی غیر معمولی شخصیت اور ان کی گراں قدر خدمات تھیں۔ اس سے ہم کو بے شمار فائدے حاصل ہوئے آج جو اہمیت اس ادارے کو حاصل ہے اور یہ ادارہ ہماری منزلت کا نشان بنا ہوا ہے وہ اسی عہد کی دی ہوئی متاع گراں مایہ ہے۔ یونیورسٹی بننے، ملک کے تقسیم ہو جانے اور آزادی سے ہم کنار ہونے سے طرح طرح کے مسائل سامنے آئے جو رو براہ ہونے کے بجائے پیچیدگی اور نزاکت کے اعتبار سے مشکل تر ہوگئے اور پہلی صورت حال کچھ کا کچھ ہوگئی۔ سب سے دور رس اور تقریباً لاینحل دشواری یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہیں اور طلبا و اساتذہ اور منتظمہ کے معتبر اور ہمدرد نگرانی سے نکل کر مشتبہ دیانت و امانت کے سیاسی لیڈروں کے دستبرد میں آگئی ہیں اس طرح وہ عظیم مقصد خطرہ میں آ گیا ہے۔ جس کے لیے اعلیٰ تعلیم گاہیں قائم کی جاتی ہیں اور آپ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اور

داشت و پرداخت انتہائی اہتمام و احترام سے کی جاتی ہے اس لئے کہ آئندہ ملک اور وطن کی حفاظت و برتائی کا فریضہ آپ کے سپرد ہوگا اور اس سے عہدہ برآ ہونا آپ کی اوّلین ذمہ داری ہوگی۔

اس مقصد کے پیش نظر چاہتا ہوں جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے کہ آپ اور منتظمہ اپنے کو ہر وقت ہر جگہ اور ہر کرائسس ۶۸، ۱۹، ۵ میں ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ رفیق و شفیق سمجھیں یہ کسی طرح گوارا نہیں کیا جاسکتا کہ یونیورسٹی کے اندر منتظمہ اور آپ طلباء، آمنے سامنے صف آرا ہوں۔ کہیں اور کچھ ہی ہوتا ہو آپ اپنی یونیورسٹی کے بزرگوں اور خیر اندیشوں کی مصلحت و مرضی سے باہر جانے اور رہنے کے کسی طرح مجاز نہیں ہیں۔ ہماری یونیورسٹی ایک مشترکہ خاندان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں وہ ڈسپلن اور آئین حیا اور وفا ہر قیمت پر نافذ رہے گا۔ جو شریف خاندانوں میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی سے باہر آپ براہ راست یا بجائے خود کسی ایسی جماعت سے رابطہ رکھنے میں حق بجانب نہ ہوں گے جس کا مسلک یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کا منافی ہو۔ یہ فکر و عمل کی آزادی پر پابندی لگانے کی تائید یا تبلیغ نہیں کر رہا ہوں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ جب تک یونیورسٹی میں طالب علم رہیں یونیورسٹی کے اعلیٰ اساسی اور دیرینہ مقاصد اور روایات کی ہر حال میں پیروی کریں اس میں اجتہاد سے کام نہ لیں۔

کہنا یہ ہے کہ نوجوانوں اور ناآزمودہ کار ہونے کے سبب سے آپ کو معاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے ان گرانقدر ذمہ داریوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے جو آپ پر عائد ہیں۔ میرا خیال ہے جس کا وقتاً فوقتاً اظہار کرتا رہتا ہوں کہ ہمارا یہ ادارہ (مسلم یونیورسٹی) شروع دن سے آج تک مسلمانانِ ہند کا ضمیر رہا ہے اور اس ضمیر کے نمائندے آپ طلباء ہیں یہی اور اتنا ہی نہیں بلکہ ہم سب اپنی جگہ پر اس منصب جلیل کی ذمہ داریاں

بلدری کرنے کے لئے مجبور رہا ہوں ہیں۔ اس وادی میں سدا آبلہ پائی اور دعوت خار طلبی کوئی راہ فرار یا جائے پناہ نہیں ہے۔ یہ بڑے شرف و سعادت کا مقام ہے۔

"اب روئے سخن حضرت صاحب عالم کی طرف ہے" ......

جیسا کہ آپ جانتے ہیں رقعات غالب میں آیا ہے یعنی آپ کے اساتذہ کرام کی قرض جن کو آپ بطور امانت سپرد ہیں۔ صوفیائے کرام کے حلقہ میں نہیں بلکہ ان کے "حلقہ بیرونِ در" میں سُنا ہے کہ پیر و مُرید کا تعلق اس طرح کا ہے کہ مُرید جب چاہے پیر سے علیحدگی اختیار کرلے اس کو پورا حق حاصل ہے۔ لیکن پیر مرید کو کبھی اور کسی حال میں چھوڑنے کا مجاز نہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس کی ذمہ داری میں رہے گا۔ میرے نزدیک یہ رشتہ معلّم اور متعلم پر بھی یکساں عائد ہوتا ہے۔ یعنی طالب علم استاد کو چھوڑ سے یا نہیں۔ استاد شاگرد سے کسی حال میں دستکش نہیں ہو سکتا! یہی رشتہ ماں باپ اور اولاد کا ہے۔ پہلا رشتہ عقیدت اور ذمہ داری کا ہے۔ دوسرا اخوت کا۔ کون بتائے اور کیسے بتائے کہ کون سا رشتہ ناقابلِ شکست ہے اور کون قابلِ شکست! شاید دونوں ناقابلِ شکست ہیں۔

اِن رشتوں کے ہوتے ہوئے آپ اساتذہ اور طلباء کسی حال میں ایک دوسرے سے علیٰحدہ رہ سکتے ہیں نہ رکھے جا سکتے ہیں۔ آپ فرمائیں گے یہ رشتے اب تمام دنیا میں کمزور اور بے وقعت ہو گئے ہیں۔ علی گڑھ کس شمار میں ہے میرا معروضہ یہ ہے کہ ہم آپ اسی ذمہ داری کے تو پابند ہیں کہ خسران و عصیان کے سمندر میں علی گڑھ طوفان کا مقابلہ کرے گا یمن و سعادت کے جزیرے تعمیر کرے گا اور اخلاق و اکرام کے جہاز کو EVEN KEEL پر چلائے گا۔ علی گڑھ کسی طرح آؤٹ آف ڈیٹ یا فضہ یا رینہ بننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی ادارہ جس کی بنیاد شرف و سعادت کی اساس پر رکھی گئی ہو شروع تہذیب سے آج تک کہیں آؤٹ آف ڈیٹ OUT OF DATE نہیں ہوا ہو نہیں ہو سکتا۔

میں پیر نہ مرید اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دونوں کا رشتہ مقررہ یا بتائے ہوئے اوراد و وظائف سے آگے بڑھ کر تزکیۂ باطن اور خدمتِ خلق تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ زیر بحث بھی نہیں۔ لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اولاد اور والدین اور شاگرد و استاد کا تعلق وہ نہیں رہا جو کبھی تھا اور آج بھی ہونا چاہیئے۔ یہ تشویشناک آثار ہیں جہاں یہ صورت حال ہے وہاں کے معاشرے کے مفاسد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر روز جیسی سفاکیاں دیکھنے اور سننے میں آتی رہتی ہیں وہ بڑی مایوس کن ہیں۔ اولاد والدین کے کہنے میں نہیں رہی۔ چاہتا ہوں کہ ہمارے لئے یونیورسٹی میں اولاد کا والدین ہی سے نہیں بلکہ استاد کا شاگرد سے ربط و رشتہ اس سے بدرجہا بہتر ہو جیسا کہ دوسری چھوٹی بڑی تعلیم گاہوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ اجتماع آپ طالب علموں کا ہے اعلیٰ اساتذہ کرام کی خدمت میں اظہار خیال یا "گزارش احوال واقعی" کا محل نہیں اس لئے ان کی خدمت میں غالب کا یہ شعر پیش کرنے کی جرأت کروں گا۔

فرزند زیر تیغ پدر می نہد گلو
گر خود پدر دراتشِ نمرود میرود!

اگر کسی وجہ سے آج اساتذہ کرام اور آپ کا رشتہ اولاد و والدین کی مانند براہیم اور اسماعیل کا نہیں ہا تو چاہتا ہوں کہ آپ آئندہ نسل کے براہیم بننے کی ہمت کریں۔ اسماعیل کی روش اور روایات کا دور کچھ زیادہ دور نہ رہ جائے گا آج جیسی آتش نمرود کب اور کہاں نصیب ہو گی کیا معلوم پھر کسی کو کس کا امتحان مقصود ہو! اس امتحان کا سامنا کرنے کی آپ دونوں کو دعوت دیتا ہوں۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم!

محمد اسمٰعیل عباسی

سنہ ۱۹۲۵ء کا علی گڑھ

مشہور تھا کہ ہم لوگ جو سنہ ۱۹۲۵ء میں آئے انہوں نے صرف غبارِ کارواں دیکھا اصل علی گڑھ کا قافلہ اپنے تمام حسن و زیبائی کی دلکشیوں کے ساتھ جا چکا تھا لیکن جو کچھ دیکھا اس سے تو یہی نظر آیا کہ ہر گوشہ بساطِ دامنِ باغباں و کفِ گل فروش ہے۔

مسلم یونیورسٹی کی سر بفلک عمارتوں میں ایک کھدر کی ترکی کوٹ کو کالے رنگ میں رنگے ہر کی کھدر کی ترکی ٹوپی پہنے، چہرے پر ذرا ذرا داڑھی، جیب میں حیرت زدہ اوسان پریشان ایم اے اور لا کا داخلہ لیے اکتوبر ۱۹۲۵ء میں گرم پہونچا تو وہاں کی داستانیں سن کر سوچتا تھا کہ دیکھیے کن بلاؤں سے گزرنا ہوتا ہے مگر حسنِ اتفاق کہ ایک صاحب لمبا قد، گورا چہرہ نیچا پاجامہ، خوبصورت شیروانی پہنے مل گئے، بڑی شائستگی اور محبت سے بر سرِ آفس لے گئے اور یکی بارک (سر سید ہال) کا پتہ بتایا، جس کے نمبر ۱۱ کے کمرہ میں میرے عزیز دوست محمد سلیمان ادہمی صاحب مجھ سے ایک سال پہلے آکر بیٹھ گئے تھے۔ تعجب ہوا نو واردوں کے ساتھ یہ برتاؤ، تو روایات جو سنی گئی تھیں ان کے خلاف تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کنور محمد اشرف ہیں اور رنگیلے اور وقت گزرنے کے بعد پتہ چلا کہ بی اے آنرز اور لا کے طالب علم ہیں اور محمد علی اور ادہمی کی طرح ترکِ موالات کے [illegible] کے ہیں، یونین کے وائس پریزیڈنٹ کے عہدہ کے امیدوار

ہیں، اس لئے شائستگی، سنجیدگی اور شیریں مقالی پر مجبور ہیں، اس زمانہ میں جو وائس پریسیڈنٹ بننے کے خواب دیکھتا تھا نیچے پاجامے، صاف لباس پہنتا اور ہر طرح کی بے عنوانیوں اور از خود رفتگیوں سے اپنے کو آزاد رکھتا تھا، سب کی خدمت کرتا تھا اور یہی خدمت گذاری اس کی کل کائنات تھی وہ کسی سے ووٹ نہیں مانگتا تھا، یہی اوصاف حسنِ طلب کا کام دیتے تھے، یہی وہ حضرت ہیں، جو بعد کو ڈاکٹر اشرف کے نام سے موسوم ہوئے اور اب اس دنیا سے بیزار ہو چکے ہیں، بی، اے، انرز (ہسٹری) اور ایم اے (ہسٹری) کا کورس ایک تھا، اس طرح ہم اور وہ ہم سبق ہو گئے، اور جلد ہی ہم دونوں کے مراسم دوستانہ اور بہت گہرے ہو گئے،

سرسید ہال کو لوگ پکی بارک کہتے تھے یہ ایک پختہ عالیشان عمارت تھی اس کے بالمقابل جواب عثمانیہ ہوسٹل ہے وہ کچی بارک کہلاتا تھا۔ واقعی کچی عمارت تھی اور پھوس سے چھائی ہوئی تھی، پکی بارک کے کمرہ ۱۱ میں ایک تو محمد سلیمان ہی تھے جو سینٹ اینڈریوز کالج گورکھپور کے انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے میں میرے ہم سبق رہ چکے تھے اور ترک موالات کے دور میں ترک تعلیم کے بھی راغب ہیں۔ دوسرے ابن حسین صاحب وائس پریزیڈنٹ تھے، ابن حسین کے بڑے بھائی ابن حسن بڑے لائق اور بے مثال مقرر تھے، الہ آباد میں کالجوں کا جو انعامی تقریری مقابلہ یونیورسٹی کے قیام کے قبل ہوا تھا اور جس میں، میں بھی سینٹ اینڈریوز کالج کی طرف سے گیا تھا ابن حسن کو فرسٹ پرائز ملی تھی وہ واقعی اس کے مستحق تھے۔

علی گڑھ میں مختلف اقسام کے لوگ تھے خیر یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے مگر وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی ذہین، دماغ اور باناز ہستی نے تقسیم کار کر دیا ہے، کچھ تو ایسے تھے جو صرف پڑھتے تھے، یہ لوگ یا تو آئی سی ایس کی تیاری میں لگے تھے یا انگریزی میں مضامین لکھتے تھے یا یونین میں تقریر کرتے تھے، غرضیکہ یہ اسکالر طبقہ تھا، کچھ کھیلنے میں کمالات دکھاتے تھے، کچھ کھلنڈرے تھے مگر ان کے کمالات بھی کچھ کم نہ تھے اور سب سے زیادہ دلچسپ وہ لوگ تھے

جن کی پارٹی کا نام "گرینڈی پارٹی" تھا یہ لوگ روزمرہ ۴ بجے شام سے نہایت عمدہ سوٹ زیب تن کئے ٹہلتے نظر آتے تھے، یہ لوگ ایک طرح کے محتسب تھے، ایک طرف یہ حکامان یونیورسٹی کا مقابلہ کرتے تھے دوسری طرف طلبا میں اعلیٰ اخلاق اور بلند کرداری قائم کرنے میں اپنے کو ذمہ دار سمجھتے تھے، مجال کیا ہے کہ دارالعلوم میں خلاف ضابطہ کوئی بات ہو جائے۔ نئے آنے والوں کی تربیت و اصلاح بھی ان ہی کے ذمہ تھی، ہر ایک کو ٹھونک بجا کر ایسا کر دیتے تھے کہ پھر دنیا کی کشمکش میں جا کر کوئی مقابلہ میں نہ آسکتا تھا، یہ لوگ اول تو امتحان دیتے ہی کم تھے اور اگر دے دیا تو فیل ہونا ضروری ہے، ان کے ضابطہ قانون میں، پڑھنے لکھنے میں امتیاز حاصل کرنا دارالعلوم کے اندر اعزاز کے لئے قطعی غیر ضروری اور IRRELEVANT — (غیر متعلق) بات تھی، اصل سوال یہ ہے کہ آپ کتنے دنوں سے علی گڑھ میں ہیں، ایک مرتبہ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب نے ایک پارٹی دی اور اسی جماعت کے ایک ممتاز فرد کو نہیں بلایا اور ایک فرسٹ ڈویژن لڑکے کو بلایا، بس یہ غصہ سے بل کھا گئے، پہونچے ڈاکٹر ضیاءالدین کے پاس اور جوشیلی آواز میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے نہیں مدعو کیا اور ان صاحبزادے کو بلایا، کبھا دیکھئے تو یہ حضرت کبھی فیل ہوئے ہیں اور میں ڈاکٹر صاحب کسی درجہ میں ۵، ۶ سال سے کم رہا ہوں، بات اتنی معقول تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو بجز معافی مانگنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ غرض یہ لوگ وہ تھے جو علی گڑھ کا وقار قائم کئے ہوئے تھے۔ میرے ہی زمانہ کی بات کی ہے کہ ایک انگریز پروفیسر جو نیا نیا آیا تھا، سے استعجاب کا شکار ہونا پڑا، امتحان ہو رہا تھا گھنٹہ بجا کر ٹائم اپ، انگریز پروفیسر کی جو شامت آئی تو اس نے اسی جماعت کے ایک صاحب (جو شاید بھول کر امتحان گاہ میں آگئے تھے) کی کاپی ہاتھ سے پکڑ لی وہ تاؤ میں آگئے اور انگریز پروفیسر کو بڑے زور سے ڈانٹا "آپ نے کاپی کیوں پکڑ لی کیا میں نے گھنٹہ کی آواز نہیں سنی اور پھر دیا آپ نے مجھے اس کے بعد کچھ لکھتے دیکھا، یہ علی گڑھ ہے، یہاں کا کوئی لڑکا بے ایمانی نہیں کرتا، آپ آئندہ ہوشیار رہیئے گا" انگریز پروفیسر نے کہا کہ آپ مجھے معاف رکھیں میں آپ کو سمجھنے

کے لئے یہاں آیا ہوں، انہوں نے جواب دیا "جس مضمون کے آپ پروفیسر ہیں وہ آپ ہم لوگوں کو سکھایئے اور یہاں کی روایات اور یہاں کے آداب آپ ہم سے سیکھیے۔"

میرا خود واقعہ ایسا ہے جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ان حضرات کی ذمہ داریاں کتنی وسیع تھیں، شیخ سعدیؒ تو کہ گئے ہیں کہ "محتسب را درون خانہ چہ کار" لیکن یہ لوگ درون خانہ سے کلی تعلق رکھتے تھے، میں کہہ چکا ہوں کہ اول دن جب میں دارالعلوم میں داخل ہوا تو کنور اشرف مجھے مل گئے تھے پھر میں بے خوف و خطر رہنے لگا، سمجھا کہ کوئی مجھ سے باز پرس نہ کرے گا، یہی لوگوں کو کہتے سنا کہ مخلصین سے کوئی باز پرس نہیں کرتا اور چونکہ میں جیل سے آیا تھا اور کھدر پوش تھا اس لئے میں خواہ مخواہ اندر ہی اندر فخر کرنے لگا کہ میں مستثنیات سے ہوں، مگر ایک دن شام کے وقت کمرہ کوٹ پتلون سے بھر گیا، میں نے اپنے کو تسکین دی کہ ابن حسین سے ملنے آئے ہوں گے اور واقعی وہ لوگ انہی سے بات کرتے رہے مجھ نووارد کو وہ قابل خطاب کیوں سمجھتے لیکن یہ سب طفل تسلیاں ثابت ہوئیں، یکایک ایک صاحب میری جانب گھومے اور کہا "مولانا" اب تو مجھے پسینہ آگیا جی تو جلال تو اب دیکھیے کیا ہوتا ہے "صلح یا جنگ؟" میں نے کہا مجھ میں جنگ کی طاقت کہاں ہے، تو بولے تو پھر دو میں سے ایک کام کیجئے یا کھدر چھوڑ دیجئے یا روز کپڑے بدلیے، آپ کو کھدر ہم دو دن نہیں پہننے دیں گے،" میں نے یہ سمجھ کر فوراً منظور کر لیا کہ سستے چھوٹے، پھر جب تک علی گڑھ رہا روزمرہ کپڑے بدل دیتا تھا، ان کی نگاہیں اتنی دور بیں اور اندر جھانکنے والی تھیں اور ہر ذرہ ذرہ کی ذمہ داری وہ اپنی سمجھتے تھے اب کل کہاں میں کچھ نہ کہونگا، رشید احمد صدیقی صاحب اجازت نہ دیں گے وہ برابر کہا کرتے ہیں کہ بوڑھے اپنے زمانہ کو اچھا اور موجودہ دور کو خراب کہنے

[illegible]

یہی ارکب میں امیرانہ ٹھاٹ باٹ تھے میں گھر سے نکالا ہوا کسی طرح کما کر کچھ روپیہ

لایا تھا، بہت سا داخلہ میں خرچ ہو گیا، لیکن بیس روپیہ فی کس کرہ ساجھے کے لیے دینا پڑا، دری کا فرش آیا، پردے لگائے گئے، ایک بیرا مقرر ہوا، وہاں کے بیرے بڑے ہوش مند ہوتے تھے، اگر چند لوگ آگئے اور میں نے کہا کہ مٹھائی لاؤ اور اس نے پوچھا کتنے کی؟ تو فوراً برخاست، اسے جاننا چاہیے تھا اور اپنی عقل سے فیصلہ کرنا چاہیے تھا، کل پیسہ بیرے کے پاس رہتا تھا کسی کی جیب میں ایک کوڑی بھی نہیں رہتی تھی، علی گڑھ سے آکر میں ایک عرصہ تک اس عادت سے پریشان رہا، بیرے ہم لوگوں کو صاحب کہتے تھے اور صاحب کی شان کے خلاف تھا کہ اگر باہر بیٹھنا ہو تو کرسی اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لے جائیں، یہ کام بیرے کا ہے، بیرے ہم لوگوں کے پرائیوٹ ملازم ہوتے تھے، مگر بیرے پر کسی کو کھانا نہیں ملتا تھا ڈائننگ ہال میں جانا ضروری تھا اور پورے یونیفارم میں، ایک انگریز پروفیسر ڈائننگ ہال کی راہ پر کھڑا رہتا تھا اور اگر کوئی ترکی کوٹ نہ پہنے ہو تو فوراً واپس کر دیتا تھا، کھانا غائب، اکثر لڑکے شیروانی پہنتے تھے، اب اس بلا کا علاج بھی بڑی ذہانت سے ایجاد ہوا، انگریز ترکی کوٹ اور شیروانی میں صرف یہ فرق جانتا تھا کہ ترکی کوٹ میں پیچھے دو بٹن لگے ہوتے تھے لڑکوں نے شیروانی کے پیچھے دو بٹن لگائے اب کیا تھا سیدھے ڈائننگ ہال میں پہونچ گئے، انگریز نے بٹن دیکھا اور کہا کہ جاؤ، آستینوں میں منہ چھپا چھپا کے ہنستے نکل گئے، ہر بات کا ایک اصول مقرر تھا، اور اس کی خلاف ورزی گنوارپن، اور گنوارپن کا دارالعلوم میں گذر کہاں؟ مثلاً ایک دن میں باہر ٹہل رہا تھا ایک صاحب نے سکرم گاڑی بازار جانے کے لیے منگوائی تھی مجھے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ میں سواری کی تلاش میں ہوں کوئی شناسائی نہ تھی فوراً کہا آیئے بازار چلیں گے اب میں ان کا مہمان ہو گیا گاڑی کا کرایہ انہوں نے دیا، ہوٹل میں ناشتہ کا پیسہ بھی انہوں نے ادا کیا، اور اپنے ساتھ واپس لائے کتنے ان کے دوست احباب سے لیکن ان کی جانب توجہ نہ کی اب اگر میں ذرا بھی اخلاق [illegible] کہا کرتا تو بس میری اصلاح کے لیے وہ عجیب و غریب طریقے ایجاد ہوتے جو علی گڑھ ہی کی خصوصیت تھے، کپڑے

سلوانے کے طریقے بھی وہی امیرانہ تھے، ایک درزی علاء الدین تھے ان کا ایک ڈرائنگ روم
تھا وہاں جا کر لوگ بیٹھ گئے اخبار رکھے ہیں، مطالعہ شروع ہو گیا، علاء الدین صرف
درزی نہ تھے کپڑے بھی رکھتے تھے، علاء الدین صاحب یکے بعد دیگرے کپڑے پسند کر لیتے
اور لوگ رخصت ہو جاتے نہ کپڑے کا دام پوچھنا نہ سلائی کی رقم کی دریافت، شیروانی بہت
عمدہ سیتے تھے۔ وقت پر شیروانی کمرے پر آ گئی اور بل، یکی پارک سے باہر نکلنے کا بھی ضابطہ
تھا، بلا پورا لباس پہنے کوئی باہر نہیں نکل سکتا تھا نہ سڑک پر کچھ کھا سکتا تھا نہ معمولی دوکان
پر بیٹھ سکتا تھا، جو لوگ کمرے کے اندر سگریٹ پیتے تھے کیا مجال کہ یکی پارک کے باہر اس
فعل کا ارتکاب کریں اسی لئے چودہ پندرہ سال ہوئے جب میں نے علی گڑھ کی سڑک پر
چپل پہنے اور مونگ پھلی کھاتے ہوئے جاتے دیکھا تو سناٹے میں آ گیا، سوچا کیا یہ وہی
علی گڑھ ہے، یکی پارک (سرسید ہال) میں زیادہ تر نمایاں لڑکے رہتے تھے، اچھے کھلاڑی
اچھے مقرر، اچھے طالب علم، مقابلہ کا امتحان دینے والے، کھلنڈرے اور گرینڈی پارٹی کے
لوگ، یہیں ایک طرف پنجابیوں نے قبضہ کر رکھا تھا، پنجاب پارٹی الکشن میں قہر آسمانی
تھی جس کے خلاف ہو گئے وہ گیا، سلیمان انصاری نے مشرقی اضلاع کی پارٹی جوابی تیار کی مگر
وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی، یہیں ایسے لوگ بھی رہتے تھے جو ہارمونیم پر پکا گانا گاتے
تھے، سب سے زیادہ اجتناب یا مغائرت ان ذہین لڑکوں سے برتی جاتی تھی جو آئی سی ایس
یا دوسرے مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کرتے تھے، آپ اس کا نام احترام رکھ لیجیے، مگر
رنگ مغائرت ہی کا رہتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ان کا بائیکاٹ کر دیا گیا ہے، مڈ پارٹی
بڑے دھوم سے ہوتی تھی، میں بھاگ کر کمرے میں گھس گیا، دبلا پتلا، کہنہ ملیریا کا مریض بخار سے
ڈر گیا، کمرہ اندر سے بند کر لیا، فوراً لوگ پہنچے اور کہا کہ خدا کی قسم، اگر ایک منٹ میں
آپ نے دروازہ نہ کھولا تو دروازہ توڑ دیں گے اور آپ کو پیشاب کے حوض میں ڈبو دیں گے
ڈر کر میں نے دروازہ کھولا، دو نے میری ٹانگیں پکڑیں اور دو نے ہاتھ پکڑے اور مڈ

بھرے جا کر ڈال دیا۔

ہمارے ہی زمانہ میں حافظ عبدالحمید صاحب لا پڑھتے تھے اور آپ یکی بارک میں رہتے تھے، بہت پستہ قد تھے، اس لیے ان کو خطاب دے دیا گیا تھا "گنجی" ان حضرت کی شاعری تو کبھی نہیں سنی، لیکن الکشن کا مرثیہ لکھا کرتے تھے، ایک دن ایک دراز قد آدمی میرے کمرے میں آئے، بیساختہ کہا آپ کی تعریف، فوراً کسی نے یہ مصرعہ پڑھ دیا ع

بہ شتر بھی محملِ لیلیٰ کے قابل ہو گیا۔

یہ گنجی صاحب کی ایجادِ طبع تھی، در غلام السیدین پہ جو مرثیہ لکھا گیا اس میں تکدر کھنیا حمد صاحب پر کھینچی گئی تھی اسحاق خاں جو بعد کو مسلم لیگ کے ایم۔ ال۔ اے ہوئے اور بطور جرنلسٹ بڑا نام پیدا کیا اسی یکی بارک میں رہتے تھے،

اسی یکی بارک میں محمد احمد کاظمی بھی تھے، وہ بھی بی اے انرز میں پڑھتے تھے اور میرے ہم سبق تھے وہ ایڈیشنل ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات ہوئے، بعد ازاں توسیع تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھی گئے، جب وہ ایڈیشنل ڈائرکٹر تھے، اور میں ایم۔ ال۔ اے تھا تو میں نے انہیں ایک خط ذرا القاب آداب کے ساتھ لکھا، جواب ملا بھائی مدیل میں وہی محمد احمد کاظمی ہوں جو آپ کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھتا تھا اس لیے آپ کی تحریر میں اجنبیت و مغائرت نے مجھے سخت تعجب میں ڈال دیا ہے۔

چھوٹے بچوں کا ایک الگ ہاسٹل تھا وہ لوگ جب غول کے غول السلام علیکم السلام علیکم کہتے نکلتے تھے تو عجیب سماں بندھتا تھا بالکل بڑے بھائی اور چھوٹے بھائی کا رشتہ تھا، خواہ نواب کے لڑکے ہوں یا کسی بڑے افسر کے کسی ناپسندیدہ بات پر ہم لوگ انہیں بے محابا تھپڑ مارتے تھے، عید کے دنوں یہ لوگ رومال چرا لیتے تھے۔ پروفیسر حلیم صدر شعبۂ تاریخ کی جیب سے رومال نکالا تو انہوں نے دیکھ لیا، فوراً واپس کر دیا، پروفیسر حلیم نے تعجب سے کہا لے جائیے، بچے نے جواب دیا جب آپ نے دیکھ لیا تو قانون نہیں ہے اور رومال وہیں

گرادیا ، پروفیسر حلیم عید کے دن مٹھائی میز پر چنوا دیتے تھے رڑکے جاتے تھے اور کھاتے تھے ہم لوگ گئے تو وہ برافروختہ تھے واقعہ بیان کر کے کہنے لگے ، یہاں چودی کے قوانین بنے ہوئے ہیں سب چارے حلیم صاحب علی گڑھ کی روایات سے ناواقف تھے ان کی نگاہ یہاں تک نہیں گئی کہ اس مذاق میں کتنی محبت اور یگانگت تھی ، اس لڑکے نے ۲۲ رومال چرائے تھے ، کہنے لگا شہر کے ایک رئیس کے آگے جا کر ادب سے سلام کیا انہوں نے گلے لگایا ، کہا جیتے رہو بیٹے اور میں نے رومال اڑا دیا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین بھی ایک عجیب چیز تھی ، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد بحیثیت وائس چانسلر ہونے کی وجہ سے اس کے صدر تھے اور الکشن سے کوئی طالب علم نائب صدر ہوتا تھا اور اس کی کابینہ کا بھی انتخاب ہوتا تھا ، ہر معاملہ میں شرافت اور علو ظرفی اور صالح روایات کا ظہور ہوتا ، الکشن کے دن ایک امیدوار دوسرے کو اپنے ہاں مدعو کرتا اور چائے پلاتا ، آخر وقت میں دونوں فریق مارچ کر کے جاتے اور سب آ اپنے کو ووٹ دیتے لیکن وائس پریسیڈنسی کے امیدوار اپنے مخالف کو ووٹ دیتے ، ووٹ ختم ہوا ، الکشن کا اعلان ہو گیا ، تو جو جیتا وہ فوراً ہارے ہوئے کو خط لکھتا جس میں یہ تحریر ہوتا کہ آپ مجھ سے بہتر کام کرتے لیکن قوم نے میرا انتخاب کر دیا میں اس ذمہ داری کو بلا آپ کی امداد کے نہیں اٹھا سکوں گا ، اور دوسرا فوراً مبارکباد کا خط لکھتا اور اس میں تحریر کرتا کہ قوم نے نہایت صحیح انتخاب کیا ہے اور اپنی خدمات پیش کرتا اب میاں گٹی کا مرثیہ فوراً تیار ہو جاتا اور ور کر لوگ کنستر گلے میں لٹکائے بجاتے اور جنازہ اٹھا کر ماتم کرتے چلتے ، بناوٹی طور پر بلک بلک کر روتے لیکن جب شکست خوردہ امیدوار کا کمرہ آتا تو مکمل خاموشی ہو جاتی اور بیچوں کے بڑا بھاگ کر پورا مجمع آگے نکل جاتا ۔

یونین کے جلسے بڑے دل کش ہوتے تھے ، ہال نیچے اوپر بھر جاتا تھا پروفیسر صاحبان ڈائس پہ رونق افروز ہوتے اور کبھی بحث میں بھی حصہ لیتے نئے آنے والوں کو ہوٹ

کرنے کے طریقے بھی بے شمار تھے۔ جب میں اول بار یونین میں بولنے کھڑا ہوا تو بحث اتحادِ اسلام پر تھی، مولانا آزاد اسے "پان اسلام ازم" لکھا کرتے تھے، میں نے بھی یہی کیا بحث انگریزی میں تھی، اوّل تو میری ہیئت کذائی، دوسرے میری آواز، تیسرے میں نے "پین" نہیں "پان" کہا اور سب سے زیادہ یہ کہ میرا پہلا موقع تھا، بس کیا تھا، کبوتر، فاختہ بلی کی آوازیں، پان چونا ڈلی کی آوازیں میرے کان میں آنے لگیں، مجھے خوب یاد ہے کہ میری آنکھوں کے نیچے بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا، لیکن میں بولتا ہی گیا، اگرچہ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا، میں امتحان پاس ہو گیا تھا اور پھر کسی نے مجھ پر ہوٹنگ نہیں کی، اگرچہ میں برابر مباحثوں میں حصہ لیتا رہا اور سیر الڈ کاکس پرائز بھی ملا، اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اسے کے۔ کلی میں تقسیم کر دیا، جسے میں نے نا انصافی قرار دیا۔

یونین کی چہک دمک، دلچسپ پوائنٹ آف آرڈر سے ہوتی تھی، کچھ لوگ مزاحیہ انداز میں پوائنٹ آف آرڈر ریز کیا کرتے تھے اس سے عام دلچسپی میں بھی اضافہ ہوتا تھا اور وائس پریسیڈنٹ کا امتحان بھی ہو جاتا تھا، ان میں سے ایک صاحب صغیر العبادؒ تھے ایک دن دو صاحبان نے تقریریں کیں، تیسرے نمبر پر آیا، تینوں کے چہرے پر داڑھی تھی، صغیر العباد نے فوراً سوال کیا، جناب کیا یہ مباحثہ ایک ہی قسم کے لوگوں کے لئے مخصوص ہے، وائس پریسیڈنٹ دل مسٹر صغیر العباد آپ کا کیا مطلب ہے آپ کے جملے کا ایک مطلب بہت خطرناک ہو سکتا ہے

جناب! میرا وہی مطلب ہے جو بہت خطرناک نہیں ہے۔

وارننگ نمبر ا مسٹر صغیر العباد آئندہ خیال رکھیے، اسی طرح تین وارننگ کے بعد وائس پریسیڈنٹ نے انہیں باہر چلے جانے کا حکم دیا، فوراً ام گے کے بنچ پر بیٹھے ہوئے مقررین میں سے کوئی اٹھتا اور کہتا کہ "جناب کیا میں آپ سے درخواست کروں کہ مسٹر صغیر العباد کو واپس بلا لیا جائے" کیا آپ ضمانت لیتے ہیں کہ ان کا برتاؤ اب مناسب رہے گا، جی ہاں، مسٹر صغیر العباد واپس آ دیں

وہیں بار چکے ہوتے صغیر العباد واپس آئے ایک دوسرے گوشہ میں چلے گئے اور وہیں سے پھر پوائنٹ آف آرڈر شروع، اسی طرح دو دو تین تین بار ہوتا، لیکن یونین کی رونق ان ہی لوگوں سے تھی، وائس پریسیڈنٹ ہر جلسہ سے قبل ان سے ضرور ملتا اور آنے کی استدعا کرتا تھا، یونین میں دو ذہنوں کا مقابلہ بڑی وسیع القلبی سے ہوتا تھا یونین کی امتحان گاہ سے نکل کر وہاں کا مقرر پرشور مجمعوں کا مقابلہ کر سکتا تھا اور اسمبلی اور پارلیمنٹ کی صدارت وائس پریسیڈنٹ کرنے میں جھجک محسوس نہ کرتا۔

کچی بارک میں ایک صاحب احمد علی صاحب رہتے تھے ۴ سال سے سن متجاوز تھا چہرے پر داڑھی تھی جو کھچڑی ہو چکی تھی، بڑے نمازی اور تہجد گذار تھے، پڑھتے بھی تھے مگر ہر سال فیل ہو جانے تھے، لا پر یولیس میں تھے، جب میں گیا میں ایم - اے اور لا پاس کر کے چلا آیا وہ ابھی پر یولیس ہی میں تھے، ایک دن ایک اولڈ بوائے آکر مسجد میں بیٹھ گئے کسی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، ہم لوگوں نے گھیر لیا سوالات ہونے لگے، ایک نے پوچھا کہ احمد علی صاحب بھی آپ کے زمانہ میں تھے؟ انہوں نے جواب دیا "متقدمین میں ہیں" ایک نے اور پوچھا کیا ڈائننگ ہال کا کھانا اس وقت بھی ایسا ہوتا تھا" وہ بولے آپ کب سے علی گڑھ میں ؟ چار سال سے ؟ آپ کو اب تک معلوم نہ ہو اکہ سرسیدؒ ایک سانچہ بنا کر رکھ گئے اسی میں کھانا ڈھال دیا جاتا ہے تو اس میں تبدیلی کی گنجائش کہاں ہے،

اشرف وائس پریسیڈنٹی کے لئے کھڑے ہوئے مقابلہ میں ایک صاحب مسعود تھے وہ دو مرتبہ پنجاب پارٹی سے ہار چکے تھے اب کے پنجاب پارٹی نے انہیں اپنا امیدوار بنایا احمد علی صاحب ان کے پُر جوش درکر تھے کامیابی کے جشن کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں، گانے بجانے کا بھی سامان تھا، ووٹ کے بعد احمد علی صاحب نے، دیوان حافظ میں فال دیکھی تو نکلا۔

تہیدستان قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

چنانچہ جب ہم لوگ کنستر بجاتے اور ماتم کرتے ان کے کمرے پر پہونچے تو کمرہ بند۔ احمد علی صاحب نے پوری رات شہر میں گذاری دوسرے دن ان پر حافظ گنج کا جو شعر ہوا تھا اس کی بڑی تعریف کی آپ بھی سنیئے اور لطف اٹھایئے۔

روتے پھرتے ہیں بڑھاپے میں میاں احمد علی
نامرادی کا ہنگامہ رے چھپر میں ہے۔

ذرا احمد علی صاحب کی داڑھی ان کی امتحان میں ناکامیاں، کچی بارک کا چھپر، داڑھی پر چھپر کی پھبتی جو پرانی ہے اور داڑھی میں تنکا، ذرا سب سوچیئے تو شعر لاجواب معلوم ہوگا، پنجاب پارٹی کے سب سوگوار ایک کمرے میں جمع تھے وہیں کنستر بجا کر مرثیہ پڑھ کر جنازہ ختم کر دیا گیا۔

شب آخر گشت و افسانہ باقی است

"یہ علی گڑھ کا فرض ہے کہ نہ صرف اپنی چہار دیواری میں اردو کا حق ادا کرے بلکہ اس سے باہر نکل کر ایک الحاقی یونیورسٹی کے روپ میں اردو تحریک کا مرکز و محور بن جائے۔ ورنہ! ——— چاہے یہاں ہر شام شام مصر اور ہر شب شب شیراز نظر آتی رہے۔ چاہے طاق حرم کی شمع اس کے در و بام کو جگمگاتی رہے بلبل اردو کے یہاں سے پرواز کر جانے کے بعد یہ چمن "میرا چمن" نہیں رہے گا۔"

(پروفیسر مسعود حسین خاں)

مسعود علی ذوقی

چند یادیں، چند چہرے، چند داغ

مسلم یونیورسٹی کے اقامتی طالب علم کی حیثیت سے میں نے سرسید ہال میں اپنے قیام کا جو وقت گزارا اُسے میں اپنی زندگی کا بہترین حصّہ تصوّر کرتا ہوں۔ میں موجودہ سرسید ہال کے وکٹوریہ گیٹ والے حصّہ میں رہتا تھا۔ جو اس وقت سرسید کورٹ کہلاتا تھا اور عوام میں پکی بارک کے نام سے مشہور تھا۔ پکی بارک کے مغربی بلاک کو ایس ایس ویسٹ کہتے تھے اور اسی بلاک کے کمرہ نمبر ۶۳ میں میرا قیام تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہماری یونیورسٹی میں بی اے کی تعلیم انٹرمیجیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد شروع ہوتی تھی مسلم یونیورسٹی انٹرمیجیٹ کالج ۱۹۲۲ء میں میٹرک اور ۱۹۲۴ء میں انٹرمیجیٹ کے امتحانات پاس کرکے جب میں نے بی۔ اے کی سال اول میں قدم رکھا تو میں جماعت کے لحاظ سے جونیر لیکن مدّتِ اقامت کے لحاظ سے ایک طور پر سینیر طالب علموں میں شمار کیا جانے لگا۔ اس صورت حال نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا اس لئے کہ میں اُن تمام پریشانیوں مصیبتوں اور وسوسوں سے بچ گیا جن کا نو واردوں کو عام طور پر سامنا کرنا پڑتا ہے اور میں بہت جلد نہ صرف یہاں کے "پرانے گنہگاروں" میں گھل مل گیا بلکہ ان کی مدد سے مجھے یونیورسٹی کی جملہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں شروع ہی سے حصہ لینے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم اس زمانے میں پرو وائس چانسلر تھے اور ایک لحاظ سے یونیورسٹی کے سیاہ و سفید کے مالک ڈاکٹر صاحب تھے۔ یونیورسٹی کی ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی لیکن ان کی پالیسی نے بعض معاملات میں اس ادارے کو دور رس نقصان بھی پہونچایا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے بارے میں حافظے کی کمزوری اور بھول کے بہت سے دل چسپ لطیفے اُن دنوں یونیورسٹی میں مشہور تھے۔ اُن میں معدودے چند تو واقعات پر مبنی تھے لیکن زیادہ تر گڑھے ہوئے اور انتہائی مبالغہ آمیز تھے۔ "مشتے نمونہ از خروارے" ایک لطیفہ آپ بھی سنیئے۔

ڈاکٹر صاحب کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز دن بھر کی تگ و دو کے بعد رات گئے تھکے ماندے شکار سے واپس آئے۔ بھوک بہت لگی ہوئی تھی۔ آتے ہی کھانا مانگا جاڑوں کے دن تھے۔ ڈاکٹر صاحب شکار کا گرم لباس (او ورکوٹ کے اضافے کے ساتھ) پہنے پہنے کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ ہاتھ دھوتے ہی نیند نے غلبہ کیا تو پانی پیئے بغیر خواب گاہ کی سیدھ بھری۔ وہاں بندوق کو آرام سے بستر پر لٹا کر اوپر سے لحاف اڑھا دیا اور خود خواب گاہ کے ایک کونے میں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے تھوڑی دیر میں خدمت گار پانی کا گلاس لے کر آیا تو ڈاکٹر صاحب کھڑے کھڑے بے خبر سو رہے تھے اور اُن کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

غلام السیدین مرحوم (پرنسپل ٹریننگ کالج) ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم (صدر شعبۂ فارسی) استاد مکرم پروفیسر رشید احمد صدیقی، محمد عاشق صاحب مرحوم (شعبۂ فارسی) اور مولانا احسن مارہروی صاحب مرحوم (شعبۂ اردو) سے مجھے اپنی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ سابقہ رہتا تھا اور اُن میں سے بعض کے ساتھ میرے خصوصی تعلقات تھے۔

ان مہربان استادوں کی دل سوزی، ہمدردی اور شفقت کا نقش آج بھی میرے دل میں موجود ہے اور جب ان کی یاد آتی ہے تو میری روح احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو جاتی ہے۔

ہم عصروں میں جلیل قدوائی، فضیل مرحوم، منظور حسین، انصار احمد، مرزا امجد بیگ حمید ملک، انیس مصطفا مینا، علی مقصود، ریحان احمد اور اقبال حسین سے میرے گہرے اور برادرانہ مراسم تھے۔

ان میں جلیل قدوائی میرے سب سے زیادہ پرانے اور بے تکلف دوست تھے۔ اُن کا اور میرا ساتھ انٹرمیڈیٹ فرسٹ ایر سے چلا آتا تھا اور شعر و ادب کے مشترک ذوق نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا۔ جلیل کا ادبی ذوق ہمہ گیر تھا۔ وہ شعر بھی اچھا کہتے تھے۔ افسانے بھی اچھے لکھتے تھے اور ان کا تنقیدی شعور بھی رچا ہوا تھا۔ وہ روس کے عظیم افسانہ نگار چیخوف کے پرستاروں میں تھے۔ مجھے جلیل کی ہم نشینی سے بہت فائدہ ملا۔ انھیں کے شوق دلانے پر مجھے بھی چیخوف سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ بی اے کا امتحان دینے سے پہلے ہی چیخوف کی تقریباً تمام کہانیاں اور تمثیلیں پڑھ چکا تھا۔ اس مطالعے کے اثر سے میرے اندر بھی افسانے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی اور میں نے ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء کے درمیان کئی افسانے لکھے جو رسالہ نگار میں شائع ہوئے اور ادبی حلقوں میں پسند کیے گئے۔

اپنے جن دوستوں کے میں نے اوپر نام گنائے ہیں ان میں سے بریلی کے مختار احمد خاں مرحوم، بدایوں کے منظور حسین اور الہ آباد کے انصار احمد (جو لمبی ملازمت سے سبک دوش ہو کر آج کل حیدرآباد سے علی گڑھ آئے ہوئے ہیں) محض میرے روم فیلو ہی نہیں تھے بلکہ ہم نوالہ و ہم پیالہ جگری دوست بھی تھے۔ ان کے علاوہ جھانسی کے فضیل مرحوم اور لاہور کے [illegible] سے بھی (یہ دونوں میرے اغل بغل کے کمروں میں رہتے تھے) میری گاڑھی چھنتی تھی۔

فضیل مرحوم کا بیشتر وقت میرے کمرے میں گزرتا تھا۔ وہ بلا کے ذہین اور حاضر جواب تھے۔ ایک بار نہ جانے اُن کے جی میں کیا آئی کہ انھوں نے ڈاڑھی بڑھالی

سرخ و سپید رنگ اور جاذبِ نظر ناک نقشے کے نوجوان تھے اس پر ڈاڑھی بھی خوب بھری بھری اور گھنی نکلی تو چہرے پر معصومانہ تقدس برسنے لگا۔ اس تبدیلی کے بعد اکثر اپنے اُن ملاقاتیوں سے جن کے لئے فضیل اجنبی تھے، یہ کہہ کر اُن کا تعارف کراتا تھا کہ مولانا فضیل سے ملئے۔ یہ چشتیہ سلسلے کے نوجوان صوفی ہیں اور اتنی تھوڑی سی عمر میں سلوک کی بہت سی منزلیں طے کر چکے ہیں۔ ماشاء اللہ ابھی سے صاحبِ کشف ہیں اور ان کی اکثر پیش گوئیاں صحیح ہوتی ہیں۔" فضیل اس تعارف پر خاکساری کے انداز میں کچھ اس طرح شرماتے ہوئے گردن جھکا لیتے تھے گویا کہہ رہے ہوں کہ " اجی میں کس قابل ہوں" اور اُن کی اِس ادا سے بہت سے لوگ دھوکے میں آجاتے تھے۔ ایک بار رفیض آباد کے ایک صاحب علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ اُن سے میری پہلے کی ملاقات تھی وہ مجھ سے ملنے میرے کمرے پر آئے۔ میں نے چائے سے اُن کی تواضع کی۔ میرے کمرے کے ساتھیوں میں سے اس وقت اتفاق سے کوئی نہیں تھا۔ فضیل حسبِ معمول موجود تھے۔ چائے کے ساتھ تین طشتریوں میں الگ الگ قیمہ بھرے سموسے بھی تھے۔ میں اپنے مخصوص انداز میں مولانا فضیل کا تعارف مہمان سے کرا چکا تھا اور وہ میری زبان سے فضیل کی خصوصیات سُن کر کافی متاثر نظر آتے تھے۔ میں اور فضیل اپنی اپنی پیالیاں خالی اور سموسے صاف کر چکے تھے۔ لیکن مہمان کی رفتار بہت سُست تھی۔ وہ ابھی نصف پیالی چائے اور ایک سموسے سے آگے نہیں بڑھے تھے اتنے میں چائے کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر انہوں نے فضیل سے سوال کیا " مولانا یہ جو کہا جاتا ہے کہ دانے دانے پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے یہ بات کہاں تک صحیح ہے؟" اور یہ کہہ کر انہوں نے اپنی طشتری میں رکھے ہوئے دوسرے سموسے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ ان کی انگلیوں کی گرفت میں آئے فضیل نے لپک کر مہمان کے سامنے سے سموسہ اٹھا لیا اور اطمینان سے اُسے کھانے لگے پھر آہستہ سے بولے " اس سموسے پر مجھے اپنا نام لکھا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ اسی

وجہ سے میں اسے کھار ہا ہوں اور یہی آپ کے سوال کا جواب ہے۔"

جن دنوں کا ذکر میں کر رہا ہوں وہ مقابلتاً بڑی فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ زندگی سستی تھی اور ہم جیسے متوسط طبقے کے طالب علموں کے رہن سہن کا معیار خاصا اونچا تھا کمروں کو عمدہ فرنیچر اور خوبصورت تصویروں سے آراستہ پیراستہ کرنے میں ہم لوگ پڑوسیوں سے سبقت لے جانے کی کوشش میں منہمک رہتے تھے۔ ہاسٹل میں بیرے کی تعداد کم تھی اور طلبا کو پرائیویٹ ملازم رکھنے کی اجازت عام تھی۔ ہم لوگوں نے بھی سلجھے میں ایک ملازم رکھ لیا تھا اس کا نام تھا بندو۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ نہایت صاف ستھرا، مستعد اور ایماندار۔ صوم وصلات کا سخت پابند، جاڑا، گرمی برسات کوئی موسم ہو وہ منہ اندھیرے، بلکہ کبھی کبھی تاروں کی چھاؤں میں اپنے گھر سے جو بالائے قلعہ میں تھا، چل پڑتا اور ابھی ہم لوگ خوابِ خرگوش میں پڑے ہوتے کہ وہ یہاں پہونچ کر وضو کرتا، نماز پڑھتا اور ناشتے کی تیاری میں مشغول ہو جاتا اور آپ اس کی تنخواہ سنیں گے تو یقین نہیں آئے گا۔ صرف آٹھ روپے خشک۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے پھر دل ہی دل میں حساب لگاتا ہوں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے اُس زمانے کے مقابلہ میں آج ہر چیز کی قیمت دس گنی ہو گئی ہے۔ چنانچہ آٹھ کے عدد کو دس سے ضرب دیجئے تو پتہ چلے گا کہ روپے کی موجودہ قیمت کے حساب سے بندو کی تنخواہ ۸۰ روپیہ ماہوار تھی۔

میں نے اپنے زمانۂ تعلیم کے دوران پانچ وائس چانسلروں کے عہد دیکھے۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو غالباً صاحبزادہ آفتاب احمد خاں یونیورسٹی کے سب سے پہلے وائس چانسلر تھے۔ ان کے بعد علی الترتیب نواب مزمل اللہ خاں، سر شاہ سلیمان، سر راس مسعود اور پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم نے اس عہدے کے فرائض انجام دیئے ان دنوں یونیورسٹی کیمپس میں ڈسپلن کے مسائل شاذ و نادر ہی پیدا ہوتے تھے۔ قاعدے قانون

کی خاصی سختی کے ساتھ پابندی ہوتی تھی۔ اس زمانے کی یونیفارم سیاہ ترکی کوٹ، ترکی ٹوپی اور سفید پائجامے پر مشتمل تھی۔ کلاس روم ہو یا ڈائننگ ہال، کھیل کا میدان ہو یا نمائش گاہ اسٹیشن ہو یا شہر، طلبہ ہر جگہ یونیفارم پہنے نظر آتے تھے۔ یونیورسٹی کا اپنا کوئی بازار نہیں تھا۔ ضرورت کی ساری چیزیں شہر سے لانی پڑتی تھیں۔ شہر جانے کے لئے وارڈن سے پاس لینا ضروری تھا۔ پڑھائی کے اوقات کے بعد پراکٹوریل مانیٹروں کی ٹولی جو کئی افراد پر مشتمل ہوتی تھی، شہر کے معروف بازاروں میں گھومتی رہتی تھی بغیر یونیفارم یا بغیر پاس والے لڑکوں پر بلا رو رعایت جرمانہ ٹھونک دیا جاتا تھا سینئر طلبہ کے وقار کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی تھی اور جونیر طالب علموں پر اُن کا بڑا رعب تھا۔ جونیر طلبہ آپس کے چھوٹے موٹے جھگڑے عموماً سینئر ہی طے کرتے تھے۔

یونیورسٹی کی تاریخ میں غالباً پہلی بار ۱۹۲۵ء میں اسٹریچی ہال میں ایک فارسی ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم (صدر شعبۂ فارسی) اس تمثیل کے ڈائریکٹر تھے ڈرامے کا نام تھا "جیجک علی شاہ"۔ مصنف کا نام اس وقت میرے حافظے میں محفوظ نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ ان دنوں ان کا شمار ایران کے معروف تمثیل نگاروں میں ہوتا تھا اور اس کی یہ تصنیف اس عہد کے ایران کی مطلق العنان حکومت اور ملک کی عام بدحالی اور بدنظمی پر ایک زبردست چوٹ تھی۔ اس ڈرامے میں بادشاہ کا کردار مرکزی تھا۔ اس کے لئے ایک انگریز، میجر ڈین کا انتخاب کیا گیا جو اس وقت شعبۂ جغرافیہ کے انچارج تھے۔ میجر ڈین انگریزی کے بہت اچھے مقرر تھے۔ لیکن فارسی تو کیا اردو زبان سے قطعاً نابلد تھے۔ اس ڈرامے میں مجھے بھی ایک جھگڑالو تاجر کا پارٹ ملا تھا۔ ہم لوگوں کو تعجب تھا کہ فارسی کے کسی قابل طالب علم کی بجائے مرکزی رول کے لئے میجر ڈین کو کیوں چنا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ریہرسل کے ابتدائی پانچ چھ دن ہادی صاحب نے محض اداکاروں کا لب و لہجہ درست کرنے اور انھیں فارسی

الفاظ کا صحیح تلفظ سکھانے میں صرف کردیا۔ ڈاکٹر ہادی حسن کی والدہ ایرانی تھیں اور فارسی تقریباً اُن کی مادری زبان تھی۔ خود ان کا لب و لہجہ بالکل ایرانیوں جیسا تھا اور وہ نہایت شُستہ اور بامحاورہ فارسی میں نہایت روانی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ ڈرامے کے دن اسٹریچی ہال کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ تماشائیوں میں ایک بڑی تعداد ایسوں کی تھی جو فارسی نہیں جانتے تھے۔ لیکن فارسی سمجھنے والوں اور نہ سمجھنے والوں دونوں نے اس پیش کش کی تعریف کی۔ سب سے اچھا رول مجروحین نے ادا کیا۔ سب لوگ حیران رہ گئے۔ ایک تو قدرتی طور پر ان میں اداکاری کی بہت اچھی صلاحیت تھی جس کا ہم لوگوں کو بالکل پتہ نہیں تھا۔ دوسرے انھوں نے اپنے مکالمے تقریباً ۸۰ فی صدی صحیح ایرانی لب و لہجہ میں ادا کر کے ہندوستانی فارسی دانوں کو شرمندہ کر دیا۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے اسی سال، یعنی ۱۹۲۵ء میں یونیورسٹی کی سلور جوبلی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ہندوستان کے ہر صوبے سے اولڈ بوائز جوق در جوق کھنچ کر علی گڑھ پہونچے۔ آج جس مقام پر یونیورسٹی فٹ بال فیلڈ، مولانا آزاد لائبریری، اور کنیڈی ہاؤس کی عمارتیں واقع ہیں وہاں پہلے ایک چٹیل لق و دق میدان پڑا ہوا تھا اسی میدان میں ایک بہت بڑا عظیم الشان پنڈال نصب کیا گیا تھا۔ اس پنڈال کے آس پاس کا سارا رقبہ ان رہائشی خیموں سے ڈھکا ہوا تھا جن میں باہر سے آنے والے ڈیلیگیٹ ٹھہرائے گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے راتوں رات سنسان میدان میں ایک چھوٹی موٹی بارونق کالونی اُگ آئی ہے۔ اس موقع پر ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ میں اُن دنوں انجمن حدیقۃ الشعر کا آنریری سکریٹری تھا۔ شاید اسی بنا پر یہ جوبلی کے مشاعرے کی سکریٹری شپ بھی میرے سپرد ہوئی تھی۔ طرحی مشاعرہ سٹریچی ہال میں منعقد ہوا تھا اور اس کے دوسرے دن غیر طرحی مشاعرہ جوبلی پنڈال میں جہاں سامعین کی کثرت

سے تل دھرنے کو جگہ نہیں رہ گئی تھی۔ ساغر کا ترنم ان دنوں اپنے شباب پر تھا۔ انھوں نے نظم پڑھی تو ان پر چاندی کے روپوں کی بارش ہوئی۔

اس دور کے بلا مبالغہ سیکڑوں واقعات حافظے میں محفوظ ہیں۔ لیکن رسالے کے خاص نمبر کے اوراق بھی محدود ہیں اور وقت بھی۔ لہٰذا اس لذیذ داستان کے دراز تر ہونے سے پیشتر ہی میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

یار زندہ صحبت باقی۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے
روشنی محلوں کے ہی اندر رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخ رو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

(حالی)

پروفیسر آل احمد سرور

کچھ سہانی یادیں، کچھ پرانی باتیں

سرسید ہال سے میرا تعلق طالب علم کی حیثیت سے بھی رہا ہے اور استاد کی حیثیت بھی۔ میں سرسید ہال کے ایس ایس ایسٹ ہوسٹل میں دسمبر ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۴ء تک کمرہ نمبر ۹ میں مقیم رہا۔ ۲۲ برس بعد نومبر ۱۹۵۶ء میں سرسید ہال کا پرووسٹ مقرر ہوا۔ اور جولائی ۱۹۵۸ء میں دو سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے شعبۂ اردو کی صدارت سنبھالنے پر خود ہی سبکدوش ہو گیا۔ اب سرسید ہال کے میگزین کے خصوصی شمارہ کے لئے اس زمانہ کی کچھ یادیں حافظے کے سمندر سے غواصی کر کے نکال رہا ہوں۔ شاید موجودہ نسل کے لئے ان میں کچھ دلچسپی کا سامان ہو مجھے تو یہ عزیز ہیں۔

میں سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی۔ ایس سی کر کے ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آیا اور ایم اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ اس وقت میرے والد مولوی کرم احمد صاحب جن کا دسمبر ۱۹۷۱ء میں انتقال ہوا یہاں پوسٹ ماسٹر تھے اس لئے ہوسٹل میں رہنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا اور

میں محسن الملک ہال میں (جواب آفتاب ہال کہلاتا ہے) اسٹیج ڈورز کی حیثیت سے شامل ہوا۔ اسی سال علی گڑھ میگزین (اردو) کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اور مسلم یونیورسٹی یونین کے جلسوں اور مباحثوں میں حصہ لینے لگا۔ اس زمانے میں یونین کے عام مباحثے تقریباً ہر ہفتے ہوتے تھے اور انگریزی میں تقریر کرنے کا زیادہ رواج تھا۔ گو کبھی کبھار اردو میں بھی تقریریں ہوتی تھیں۔ ہر سال ایک انگریزی میں اور ایک اردو میں آل انڈیا ڈبیٹ ہوا کرتا تھا اس میں ایک اچھی روایت یہ تھی کہ علی گڑھ کے نمائندے مباحثے کا آغاز کرتے تھے مگر انعام باہر والوں کے لیے مخصوص تھے خواہ یہاں کے مقررین کی تقریریں سب سے اچھی ہی کیوں نہ ہوں۔ سال کے آخر میں انعامی مقابلے بھی ہوتے تھے ۳۳ - ۱۹۳۲ء کے آخر میں جب انعامی مقابلے ہوئے تو سب سے زیادہ مجھے اور میرے بعد خواجہ احمد عباس کو انعام ملے۔

۱۹۳۲ء کا تعلیمی سال جب شروع ہوا تو یونین کے انتخابات کے لیے گھوڑے دوڑنے لگے۔ اس زمانہ میں اکتوبر میں یونیورسٹی کھلتی تھی اور شروع دسمبر میں یونین کے انتخابات ہوتے تھے۔ صدر تو پرو وائس چانسلر ہوتا تھا۔ نائب صدر، سکریٹری اور لائبریرین تین عہدہ دار اور دس کیبنٹ کے ممبر طلبا منتخب کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں طلبا کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار تھی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں یونین کے نائب صدر عثمان احمد انصاری اور سکریٹری انور شیخ، ایک کشمیری طالب علم تھے۔ انور شیخ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ چنانچہ فطرتی طور پر ان کے دوست اور مداحوں نے ان کا نام نائب صدر کے عہدے کے لیے لینا شروع کیا۔ ان کے مخالف گروپ کو ایک ایسے امیدوار کی تلاش تھی جو انور شیخ کو شکست دے سکے۔ میرا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا اور تحریر و تقریر دونوں میں میری صلاحیت سال بھر کے قلیل عرصے میں طلبا کے علم میں آچکی تھی اس لیے فطرتی طور پر یار لوگوں کی نظر مجھ پر پڑی۔

نومبر ۱۹۳۳ء کے شروع میں ایک سہ پہر کو ڈاک خانے سے ملے ہوئے پوسٹ ماسٹر کے مکان کے برآمدے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ظہیر احمد مدنی جو نواب اسمٰعیل خاں صاحب کے صاحب زادے تھے اور بی اے کرنے کے بعد آئی سی ایس کی تیاری کر رہے تھے میرے پاس آئے انہوں نے مجھے دیکھتے ہی انگریزی کا وہ مشہور فقرہ استعمال کیا جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے شیر کو اس کی کچھار میں گھیر لیا۔ مدنی سے میری اچھی ملاقات تھی وہ اچھے طالب علم بھی تھے اور طلبا کی سیاست میں ایک اہم کردار بھی۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ وہ اور ان کے ساتھی مجھے یونین کے نائب صدر کے عہدہ کے لئے کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور صرف ایک شرط ہے کہ میں ہوسٹل میں آجاؤں، میں نے کہا آپ کی دعوت میرے لئے خاصی کشش رکھتی ہے لیکن مجھے دو دشواریاں نظر آتی ہیں۔ اول تو مجھے علی گڑھ آئے صرف سال بھر ہوا ہے۔ دوسرے میں انگریزی میں ایم اے کر رہا ہوں اور مجھے مطالعے کے لئے خاصا وقت چاہیئے۔ میں نہ انتخاب کے دوران آپ لوگوں کو زیادہ وقت دے سکوں گا اور نہ بعد میں۔ کیوں کہ مارچ ۱۹۳۴ء میں ایم اے کا امتحان ہوگا انہوں نے کہا کہ انتخاب کے سلسلے میں وہ مجھ سے صرف یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں ہوسٹل میں آجاؤں اور اپنی صلاحیتوں کی ایک فہرست تیار کر دوں، باقی باتیں ان پر چھوڑ دوں۔ رہا انتخاب کے بعد میرا یونین کے کاموں اور اپنی پڑھائی میں توازن پیدا کرنا تو یہ میرا مسئلہ ہوگا۔ اس تفصیل کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ایس ایس ہال میں مقیم ہونے کی وجہ صرف یونین کا انتخاب تھا۔ اس زمانہ میں یونین کے کسی عہدہ پر انتخاب کے لئے علی گڑھ میں کئی سال گذارنے ضروری سمجھے جاتے تھے مگر یہ کوئی قانونی شرط نہ تھی صرف ایک روایت تھی اور میرے دوست یہ سمجھتے تھے کہ اس کے باوجود میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر دو لوگ کبھی یہ تصور نہ کر سکتے تھے کہ کوئی عہدہ دار ایسا بھی منتخب ہو سکتا ہے جو ہاسٹل میں نہ رہتا ہو۔ اس لئے ان لوگوں کا اصرار تھا کہ میں فوراً ہوسٹل میں آجاؤں۔ میرا جی بھی ہوسٹل میں

رہنے کو تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے والد سے اجازت مانگی وہ چونکہ علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور یونین کے نائب صدر کی پوزیشن کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اس لئے راضی ہو گئے اور میں غالباً آخر نومبر یا شروع دسمبر میں سرسید ہال کے ایس ایس ایسٹ ہوسٹل میں نو نمبر کے کمرے میں آگیا۔

اس زمانہ میں یونیورسٹی میں طلبار زیادہ نہ تھے۔ ہوسٹلوں میں بھی کافی جگہ تھی۔ ایس ایس ایسٹ میں جو کمرے ہیں ان میں تین طالب علم رہ سکتے ہیں زیادہ تر کمروں میں دو دو طالبعلم تھے۔ کچھ میں تین اور کچھ میں ایک۔ ایس ایس ہال کے پرووسٹ میاں محمد شریف تھے۔ جو فلسفہ میں ریڈر تھے۔ اور یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایک ممتاز شخصیت رکھتے تھے جب میں انکے پاس ایم، ایم ہال سے ایس ایس ہال تبادلے کے لئے گیا تو انہوں نے کہا کہ آپ نے ہمارے کلرکوں کے لئے خاصی الجھنیں پیدا کر دیں۔ انہیں کئی رجسٹروں میں اندراجات کرنے ہوں گے۔ کیوں کہ آپ خاصی دیر سے یہاں آرہے ہیں مگر میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے اپنے لئے ایس، ایس، ہال کا انتخاب کیا۔

ایس ایس ہال میں قیام سے پہلے میری ملاقات وہاں مقیم کئی اچھے طلبار سے تھی۔ ان میں امیر عنایت اللہ۔ برہان احمد (جو اب پاکستان میں ہیں) ظہیر احمد مدنی اور عثمان احمد انصاری جو مجھ سے پہلے یونین کے نائب صدر تھے قابلِ ذکر ہیں۔ اس زمانہ میں میرے ایک دوست نوابزادہ علی صغیر گورکھپوری، ممتاز ہاؤس میں رہتے تھے اور میں وہاں اکثر جایا کرتا تھا۔ ان کے یہاں مرزا افضل بیگ اور غلام محمد صادق بھی اکثر آیا کرتے تھے یہ دونوں بھی ممتاز ہاؤس میں رہتے تھے چنانچہ ان سے بھی میری گاڑھی چھننے لگی۔ مرزا افضل بیگ اس وقت بھی خاصے باتونی تھے اور صادق خاموش طبع۔ دونوں کی یہ وضع بعد میں بھی برقرار رہی۔

ایس ایس ایسٹ کے نو نمبر کے کمرے میں علی صغیر کے چھوٹے بھائی علی قدیر رہتے تھے۔

میری ان کے بڑے بھائی سے ملاقات تھی اس لئے یہ میرے ساتھ شروع ہی سے احترام سے پیش آئے بعد میں دوستی ہوگئی۔ اس وقت ۵ نمبر کے کمرے میں حامد محمود اکیلے رہتے تھے۔

ایس۔ ایس ایسٹ میں اس زمانہ کے طلبار میں عبدالرؤف صدیقی، منظور عالم قریشی، محمد افضل سید رفیق احمد، معین الحق چودہری، احمد علی بوگرہ اور ان کے چھوٹے بھائی محمود علی بوگرہ یاد آتے ہیں۔ ہمارے وارڈن سید بشیر الدین صاحب تھے جو ایک مدت دراز تک یونیورسٹی کے لائبریرین رہ کر سبکدوش ہوچکے ہیں۔ اس زمانہ میں ایس ایس ویسٹ میں یونیورسٹی کے وہ سینیئر طلبار رہتے تھے جو برسوں سے علی گڑھ میں تھے اور یہاں کی اقامتی زندگی کے اسرار و رموز کے امین سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ بہترین لباس اور آداب مجلس کے لئے مشہور تھے۔ ایس ایس ویسٹ میں سرحد کے طلبار کی بھی خاصی تعداد تھی، ان میں سب سے ممتاز دو تھے، ایک یحییٰ جان جو خان عبدالغفار خاں کے قریبی رشتہ دار تھے۔ دوسرے برادر جن کا نام تو اس وقت یاد نہیں آتا مگر جو برادر کہلاتے تھے کیوں کہ ان کا تکیہ کلام برادر تھا۔ سرحد کے طلبار کے لیڈر رہتے تھے۔ اور الیکشن میں اور یونین کے معاملات میں پیش پیش رہتے تھے۔ ایس ایس ویسٹ میں انور شیخ بھی رہتے تھے اور بھوپال کے عمائدین میں سے ایک کے صاحبزادے بھی۔

بہرحال شروع دسمبر میں الیکشن ہوا۔ انور شیخ تو بالآخر مقابلے پر نہ آئے۔ لیکن سیکریٹری کے لئے معین الحق چودہری جو الطاف رحمان کے داماد تھے۔ بنگالیوں، پنجابیوں، سرحد کے طلبار اور کشمیر کے طلبار کی حمایت کے بل پر کھڑے ہوئے۔ میرا کیمپ ممتاز ہاؤس میں تھا۔ میں تو زیادہ وقت اپنے مطالعے میں صرف کرتا تھا۔ مگر میرے کارکن ساری یونیورسٹی میں پھیلے ہوئے تھے۔ خواجہ احمد عباس، محسن عبداللہ اور سبط حسن کیبنٹ کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ سبط حسن چوں کہ نئے تھے اس لئے ہار گئے اور محسن اور احمد عباس کیبنٹ کے لئے منتخب ہو گئے۔ سید علی جو میرے ہم وطن اور الیکشن کے کاموں کے ماہر تھے اس الیکشن میں تین کیبنٹ کی سیٹ کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔

سمجھے جاتے تھے ۔ اور مدقاسیکر خاص کارکنوں میں تھے ۔ میں سو ڈیڑھ سو سے کچھ زیادہ ووٹوں سے کامیاب ہوا ۔ سکریٹری سندھ کے فیروز نانا غلام علی اور لائبریرین ممتاز احمد منتخب ہوئے ۔ جنوری ۱۹۳۴ء میں تنصیب کی رسم ہوئی ۔ پرو وائس چانسلر ایک انگریز پلیس باتھم تھے انہوں نے صدارت کی ۔ فیروز اور ممتاز بھی ایس ایس ہال میں شاید عثمانیہ میں رہتے تھے ۔ میرے پڑوسی محمود علی بوگرہ بھی کیبنٹ میں لے لئے گئے ۔

بشیر صاحب کا رویہ اپنے ہوسٹل کے طلبار کے ساتھ بہت اچھا تھا ۔ شام کو اکثر لائبریری میں سے ہمارے پاس یا محمود و حامد کے کمرے پر آجاتے اور چائے میں شریک ہوتے ادھر اُدھر کی باتیں رہتیں ۔ شریف صاحب پرووسٹ کا خاصا رعب تھا وہ ہوسٹل میں تو کم ہی آتے مگر چونکہ بڑی اچھی انتظامی صلاحیت رکھتے تھے اس لئے ہر بات پر ان کی نظر رہتی تھی ۔ طلبا اگر سکنڈ شو کے لئے سینما جائیں تو پاس لینا ضروری ہوتا ورنہ جرمانہ یقینی تھا ۔ رات میں نو بجے تک بغیر اجازت کے باہر نہ رہ سکتے تھے ۔ ہاں یونین کے مباحثوں میں دیر ہو جائے تو اس پر باز پرس نہ تھی ۔ نائب صدر منتخب ہونے کے کچھ دنوں بعد میں ایک دفعہ کچھ دوستوں کے اصرار پر سکنڈ شو میں سینما چلا گیا ۔ اس زمانہ میں سینیر پراکٹر ریل مانسٹر یحییٰ جان تھے ۔ انہوں نے سب طلبار کے پاس چیک کئے ۔ میرے پاس سے گذرے مگر مجھ سے کچھ نہیں پوچھا ۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر انہوں نے مجھے چیک کیا تو دوسرے دن ساری یونیورسٹی میں یہ واقعہ مشہور ہو جائے گا ۔ وہ الیکشن میں میرے مخالف تھے ۔ مگر انہوں نے میری طرف دیکھا تک نہیں ۔ بعد میں ایک جگہ ملے تو کہنے لگے کہ یونین کے نائب صدر سے پوچھ گچھ کرنا میرے آداب کے خلاف تھا حالاں کہ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ آپ کے پاس اجازت نامہ نہیں ہے ۔

اس زمانہ میں ڈائننگ ہال میں حاضری لازمی تھی ۔ کھانا کمرے پر منگوانے کے لئے پہلے سے اجازت لینی ہوتی تھی ۔ ناشتے کا انتظام طلبار اپنے طور پر کرتے تھے ہفتے میں

ایک دفعہ ورائٹی ملتی تھی۔ کبھی بلیڈ، کبھی شاہی ٹکڑا۔ میرے کمرے کے ساتھی علی قدیر لینس کپتان تھے۔ ان کے پاس کھیلنے والے آتے رہتے تھے۔ میرے پاس یونین کے مقرر اور دوسرے سربرآوردہ طلبار اکثر آتے رہتے تھے۔ ہم لوگ بیک روم میں سوتے تھے اور سامنے کا کمرہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کبھی کبھار قدیر کے پاس برج کھیلنے والے آجاتے تھے۔ ایک دفعہ تین بجے صبح کو یہ نشست ختم ہوئی۔ میں گیارہ بارہ بجے تک دوسرے کمرے میں مطالعہ میں مصروف رہا۔ پھر آکر بیک روم میں لیٹ گیا۔ مگر شور کی وجہ سے نیند نہ آئی۔ دوسرے دن میں نے بشیر صاحب سے کہا کہ میرے لئے کسی دوسرے کمرے کا انتظام کر دیجئے کیوں کہ میری پڑھائی اور نیند میں خلل ہوتا ہے۔ بشیر صاحب نے کہا کہ انتظام تو فوراً ہوسکتا ہے مگر تھوڑے دن کی بات ہے اپریل میں سشن ختم ہو جائے گا قدیر جولائی میں واپس نہیں آئیں گے اس وقت آپ کو آپ کی مرضی کا پارٹنر دیدیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جولائی سے عثمان احمد انصاری جو مجھ سے پہلے نائب صدر رہ چکے تھے اور میرے دوست تھے میرے کمرے میں آگئے۔

یہ زمانہ راس مسعود مرحوم کی وائس چانسلری کا تھا۔ فروری میں آغا خاں علی گڑھ آئے تو یونین میں بھی ان کو ایڈریس دیا گیا۔ نائب صدر کی حیثیت سے جب میں ایڈریس پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو مولانا شوکت علی، ڈاکٹر اشرف اور دوسرے ممتاز اشخاص جو یونین کے عہدہ دار رہ چکے تھے تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آغا خاں کے خیر مقدم کے لئے اور انھیں رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن پر یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے ساتھ میں بھی تھا۔ راس مسعود صاحب بڑی محبت کرتے تھے۔ اور رئیس بالخصوص تو خاصے سخت مشہور تھے لیکن مجھ پر بہت مہربان تھے۔ یونین کے عام مباحثوں میں بھی پروفیسر ابوبکر احمد حلیم خواجہ غلام السیدین ڈاکٹر اشرف وغیرہ اکثر شرکت کرتے تھے۔ باہر سے جو معزز مہمان آتے تھے ان کی بھی کبھی کبھار تقریریں ہوتی تھیں۔

۱۹۳۳ء کے آخر میں جواہر لال نہرو بھی علی گڑھ آئے تھے۔ میں یونین کا نائب صدر منتخب ہو چکا تھا مگر ابھی تنصیب کی رسم نہیں ہوئی تھی اس سال آفتاب ہوسٹل بنا تھا پروفیسر حبیب اس کے پرووسٹ تھے انہوں نے وہاں ایک آفتاب مجلس بھی بنائی تھی جس کی طرف سے انہوں نے جواہر لال نہرو کو دعوت دی تھی کہ علی گڑھ آئیں اور آفتاب مجلس میں تقریر کریں۔ جب راس مسعود صاحب کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے حبیب صاحب سے کہا کہ جواہر لال نہرو تمہارے نہیں میرے مہمان ہوں گے۔ جلسہ آفتاب ہال میں نہیں اسٹریچی ہال میں ہوگا اور صدارت تم نہیں میں کروں گا۔ اسٹریچی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ راس مسعود جواہر لال نہرو کو لے کر آئے۔ میں اس سے پہلے آگرے میں گاندھی جی کے ساتھ انہیں دیکھ چکا تھا مگر ان کی تقریر سننے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ راس مسعود کے تعارفی کلمات اب تک مجھے یاد ہیں انہوں نے کہا تھا کہ میں جواہر لال نہرو کا خیر مقدم نہ صرف ہندوستان کے مایۂ ناز فرزند کی حیثیت سے بلکہ اپنے دوست موتی لال کے بیٹے کی حیثیت سے کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت جواہر لال نہرو کی علی گڑھ میں آمد کو ملکی مصالح کے خلاف سمجھتی تھی۔ چنانچہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت کے گورنر مالکم ہیلی نے راس مسعود کی شکایت مرکزی حکومت سے کی تھی اور راس مسعود نے جواب دیا تھا کہ جواہر لال نہرو کے سیاسی خیالات سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی میں انہیں ہندوستان کے نوجوانوں کا ایک بہت بڑا رہنما سمجھتا ہوں اور یونیورسٹی میں ان کی آمد کو ہر طرح مناسب قرار دیتا ہوں۔ اس لئے میں نے خود اس جلسے کی صدارت کی تھی۔ راس مسعود کی انگریزوں سے بڑی دوستی تھی۔ مگر وہ قوم پرستی کا جذبہ بھی رکھتے تھے ان کے اندر گہری مشرقیت اور مغربیت کا ایک عجیب وغریب امتزاج تھا۔ شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ گل افشانی گفتار میں ان کا جواب نہ تھا۔ مسز نائیڈو نے ان کے انتقال کے بعد حیدر آباد میں مجھ سے کہا تھا کہ ان جیسے گفتگو کے فن کے ماہر انہوں نے کم

دیکھیے۔ ان کا حافظہ بہت ہی قوی تھا بہت سے طلبار کے نام جانتے تھے۔ مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے۔

اپریل کے شروع میں جب ایم اے کے امتحانات ختم ہو گئے تو میں ہوسٹل سے ڈاک خانے کے مکان میں آگیا۔ لیکن میری شامیں ہوسٹل میں ہی گذرتی تھیں۔ آخر اپریل میں کورٹ کی میٹنگ تھی۔ شام کو ہوسٹل پہونچا تو معلوم ہوا کہ راس مسعود نے کورٹ سے ناراض ہو کر استعفیٰ دیدیا ہے۔ اس وقت صرف قانون کے امتحان باقی تھے۔ خواجہ احمد عباس اور عبدالرؤف صدیقی امتحان دینے والے تھے ان طلبار نے محسوس کیا کہ راس مسعود صاحب کے اس طرح ناراض ہو کر جانے میں یونیورسٹی کا نقصان ہے اس لئے بطور احتجاج طلبار امتحان نہ دیں۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ یہ معاملہ کورٹ اور وائس چانسلر کے درمیان ہے۔ تمہیں امتحان دینا چاہیئے۔ ہاں، راس مسعود صاحب کے پاس جا کر درخواست کرنی چاہیئے کہ وہ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ میری بات لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔ اور کوئی پچاس ساٹھ طلبار کا ایک وفد سر سید ہاؤس پہونچا۔ راس مسعود صاحب کو خبر ہوئی تو انہوں نے ہم سب کو اندر بلا لیا۔ ڈرائینگ روم کے فرش پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم لوگوں کو یہ سنکر بہت صدمہ ہوا ہے کہ آپ نے کسی بات پر کورٹ سے برہم ہو کر استعفیٰ دے دیا ہے۔ ہم آپ کی جدائی برداشت نہیں کرسکتے ہمارے کچھ ساتھی غم و غصہ کی وجہ سے امتحان میں شرکت نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کی دلی خواہش یہ ہے کہ آپ اپنا استعفیٰ لے لیں۔ یونیورسٹی کے مفاد کے لئے آپ ہمیں جو کچھ حکم دیں ہم اس کے لئے حاضر ہیں۔ مگر آپ کو علی گڑھ نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ راس مسعود صاحب نے پہلے تو اس بات پر بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ طلبار ان سے اس قدر محبت کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو خوب ڈانٹا۔ فرمانے لگے کہ میں نے کورٹ کے ممبروں سے اختلاف کی وجہ سے استعفیٰ دیا ہے۔ یہ میرا اور کورٹ کے ممبروں کا معاملہ ہے۔ کورٹ بہرحال یونیورسٹی کی سب سے بااقتدار جماعت کا نام ہے۔ تم لوگوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ تم لوگوں کے جذبات کی میں

قدر کرتا ہوں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بدستور استوار رہے گا۔ مگر تم لوگ امتحان کا بائیکاٹ نہ کرو۔ یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوگی۔ اس کے بعد ہم سب لوگ خاموش چلے آئے۔ طلبا ربعد میں میرے ممنون ہوئے کہ میں نے ایک غلط قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ خردی اور بزرگی دونوں کے آداب اس وقت برتنے جاتے تھے۔

میں فرسٹ ڈویژن میں انگریزی میں ایم اے کرچکا تھا اور آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری شروع کردی تھی۔ اس لیے جب جولائی میں اس سال یونیورسٹی کھلی تو میں نے قانون میں داخلہ لیا۔ مولانا عبدالخالق صاحب ہمیں قانون پڑھاتے تھے۔ میں درس سے بے نیاز پیچھے بیٹھا C.O.D.H.J. کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ دھرم ویر آئی سی ایس سے عثمان انصاری سے بہت دوستی تھی۔ وہ انور کو ہمارے کمرے پر آجاتے چائے چلتی اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتیں۔ یونین میں ہر ہفتے مباحثے ہوتے۔ باہر کے مہمانوں کی بھی تقریریں ہوتیں۔ مگر گرمی میں فیروز نانا غلام علی چلے گئے تھے۔ ان کی جگہ پر کرنے کے لیے ضمنی انتخاب ہوا۔ جس میں خواجہ احمد عباس بھی کھڑے ہوئے۔ مگر باوجود بہت اچھے مقرر ہونے کے 'ڈے اسکالر' ہونے کی وجہ سے ہار گئے۔ یونین کے اچھے مقرروں میں اس وقت عثمان احمد انصاری، خواجہ احمد عباس، بدیع الدین (لنکا کے)، نفیس احمد (ڈاکٹر رئیس احمد کے بڑے بھائی) انصار ہروانی اور کرشنا مورتی (حیدر آباد) کے تھے۔ مباحثوں کا بڑا اچھا معیار ہوتا تھا۔ انصار ہروانی اردو کے مقرر تھے۔ باقی سب انگریزی میں تقریر کرتے تھے۔ مشاعروں میں اور ادبی نشستوں میں اس وقت مجاز کا طوطی بولتا تھا۔ مجاز کے دوستوں میں جاں نثار اختر بھی تھے۔ جو وہی ایم۔ ہال میں رہتے تھے ان کے ایک اور دوست اختر امام تھے۔ جو عثمانیہ میں رہتے تھے۔ میری اور مجاز کی آگرہ سے ملاقات تھی۔ علی گڑھ میگزین کے چار شمارے میری ادارت میں نکلے تھے سب میں مجاز کی کوئی نہ کوئی نظم تھی۔

بروائس چانسلر میں باقاعدہ چوں کہ یونین کے صدر تھے اس لئے ان سے کسی نہ کسی سلسلے میں اکثر ملنا ہوتا تھا۔ وہ میرے بڑے قائل تھے مگر ساتھ ہی اپنے اصولوں کے پابند بھی۔ ایک دفعہ کسی کام کے سلسلے میں انہوں نے گھر پر ملنے کے لئے وقت دیا۔ میں ہوسٹل سے چلا تو بارش شروع ہو گئی۔ جب بارش رکی تو میں ان کی قیام گاہ پر پہونچا۔ پندرہ منٹ کی دیر سے۔ حضرت برآمدے میں کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہا کہ آپ نے میرے پندرہ منٹ ضائع کر دیئے۔ اب ملاقات کے لئے دوسرا وقت مقرر ہوگا۔ میں نے بارش کا عذر کیا مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ کی۔ میں خاموش واپس آگیا۔ دوسرے دن گیا تو کام کی باتوں کے بعد مجھے کھانے کی دعوت دی اور کہا کہ کل کی بات کا بُرا نہ مانیئے۔ آپ طلبا کے سربراہ ہیں۔ آپ کے ذریعے سے مجھے طلبا کو وقت کی پابندی سکھانی ہے۔ ذاتی طور پر میں آپ کا بڑا قائل ہوں۔

چند دن بعد ایک واقعہ پیش آیا۔ اس زمانہ میں چوں کہ نہ کوئی پارک تھا، نہ یونیورسٹی کے قریب کوئی سینما۔ اس لئے خاصی تعداد میں لڑکے گھومنے اسٹیشن جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ پلیٹ فارم ٹکٹ کوئی نہ لیتا تھا۔ اچانک ریلوے والوں نے پلیٹ فارم ٹکٹ کے سلسلے میں سختی شروع کر دی۔ ایک نیا انگریز جوائنٹ مجسٹریٹ تھا۔ لڑکوں نے جب پلیٹ فارم ٹکٹ لینے سے انکار کر دیا تو وہ پولیس کی ایک جماعت لے کر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ اب ایک طرف کئی سو لڑکے تھے۔ دوسری طرف پولیس۔ تصادم کا اندیشہ بہت قوی تھا۔ مجھے خبر ہوئی تو میں بھاگا بھاگا پرو وائس چانسلر کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ آپ کسی طرح پولیس کو وہاں سے ہٹوا دیجئے۔ میں سب کے بعد طلبا کو سمجھا بجھا کر واپس لے آؤں گا۔ مگر محض پولیس کے کہنے سے طلبا وہاں سے نہ ہٹیں گے۔ پلیٹ فارم ٹکٹ کا مسئلہ بعد میں سلجھ جائے گا۔ ہم دونوں فوراً اسٹیشن پہونچے۔ میں طلبا کی صف کے سامنے کھڑا ہو گیا اور طلبا سے اپیل کی کہ وہ کوئی پیش قدمی نہ کریں کیوں کہ پرو وائس چانسلر پولیس کو وہاں سے ہٹانے کے سلسلے میں بات

چیت کر رہے ہیں۔ ہم لوگوں کے سامنے رئیس ہاشم نے اس نوجوان جوائنٹ مجسٹریٹ سے کہا کہ میں نے ساری عمر تعلیمی اداروں میں گذاری ہے، تم ابھی نئے نئے انگلستان سے آئے ہو تم اسی وقت اپنی پولیس کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ میں گورنر سے تمہاری شکایت کردوں گا کہ تم طلبار کے مجمع سے نپٹنے کے اہل نہیں ہو۔ تمہارا تبادلہ ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس اوپر سے احکام آئے ہیں کہ طلبار سے ریلوے کے قوانین کی پابندی کراؤں غلطی میری نہیں طلبار کی ہے انہوں نے آدھے پلیٹ فارم کو گھیر رکھا ہے اور ان کا شور بڑھ رہا ہے۔ آدھے گھنٹے میں دہلی سے گاڑی آنے والی ہے۔ پلیٹ فارم میں خالی کرا کے رہوں گا۔ رئیس ہاشم نے اس کے بعد بگڑ کر کہا کہ تم پہلے پولیس کو باہر لے جاؤ میں ذمہ لیتا ہوں کہ طلبار بھی باہر چلے جائیں گے لیکن اگر تم نے پہلے پولیس کو نہیں ہٹایا تو نتائج کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ ہم لوگ یہ مکالمہ سن رہے تھے اور محظوظ ہو رہے تھے۔ بالآخر مجسٹریٹ نے رئیس ہاشم کی بات مان لی اور پولیس کو ہٹا لیا۔ جب پولیس کا آخری سپاہی باہر چلا گیا تو میں نے طلبار کے مجمعے سے کہا کہ اب یونیورسٹی واپس چلو ہماری فتح ہو گئی۔ چنانچہ سب لڑکے بھی واپس چلے آئے۔ بعد میں ایک ایک دو دو کر کے طلبار اسٹیشن جاتے رہے مگر ان سے کسی نے پلیٹ فارم ٹکٹ کا مطالبہ نہ کیا۔ رئیس ہاشم نے میرا دوریونین کا ایک خط میں شکریہ ادا کیا۔

اس زمانہ میں سینئر طلبار کا بڑا اثر تھا۔ انھیں کے ذریعے سے ہوسٹل اور یونیورسٹی کے معاملات پرووسٹ اور وارڈن طے کرتے تھے۔ طلبار کی تعداد زیادہ نہ تھی اور خود پرووارڈن ہر طالب علم سے اچھی طرح واقف ہوتا تھا۔ شریف صاحب، بشیر خان صاحب، ڈاکٹر احمد علیم صاحب، پروفیسر حبیب، خواجہ غلام السیدین صاحب، ڈاکٹر سید ظفر حسن کے یہاں طلبار بیدھڑک چلے جاتے تھے اور وہ ان کی بڑی خاطر کرتے تھے کوئی طالب علم شیروانی پہنے بغیر ہوسٹل کے کمرے سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ لوٹا لے کر صرف بیت الخلاء جانے کے لئے جب کمرے سے چند گز کے

فاصلے پر پودوں کی آڑ میں تھا اور گورنمنٹ ہاؤس کہلاتا تھا۔ وہ تین خانچے والے ہی جن کے پاس لائسنس تھا کمروں تک آسکتے تھے۔ کوئی جاتا تو اس کے ساتھی رخصت کرنے اسٹیشن جاتے اور اسے چائے پلانی پڑتی۔ ویسے کسی مجمعے میں مجال نہ تھی کہ سینیئر طالب علم کے علاوہ کوئی دوسرا چائے کے پیسے دے سکے۔

آخر ستمبر میں یونیورسٹی تعطیل خزاں کے لئے بند ہونے والی تھی۔ قانون کے کلاس میں قانون فوجداری کا درس ختم ہونے والا تھا۔ کہ مولانا عبدالخالق صاحب نے ایک دن لکچر کے بعد مجھے بلایا اور کہا کہ آپ درس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ پیچھے کی نشست پر خاموش بیٹھے کتاب پڑھا کرتے ہیں۔ آپ کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے لوگ درس میں دلچسپی نہیں لیتے۔ میں نے کہا کہ میرا ارادہ قانون پڑھنے کا نہیں ہے۔ آئی سی ایس کے امتحان کے سلسلے میں معلومات عامہ کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ لیکن اگر میری وجہ سے آپ کو کوئی بھی زحمت ہے تو کل سے میں کلاس نہیں آؤں گا۔ ویسے بھی تعطیل کے بعد میرا تقرر شعبۂ انگریزی میں لکچرر کی حیثیت سے ہونے والا ہے۔ اس لئے یونین کے عہدے سے بھی استعفیٰ دے رہا ہوں۔ دراصل کچھ دن پہلے ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ آئی سی ایس کرکے کیا کریں گے آپ کو یونیورسٹی میں درس و تدریس کا کام انجام دینا چاہیئے۔ شعبۂ انگریزی کے صدر ہیرلڈ ہیرسن نے مجھ سے کہا تھا کہ غلام سرور صاحب دو سال کے لیے رخصت لے کر انگلستان جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ پر میں آپ کا تقرر کر سکتا ہوں بشرطیکہ آپ کا کوئی اور خیال نہ ہو۔ میں نے اپنے دل سے مشورہ کیا۔ تعلیمی زندگی مجھے پسند تھی اس لئے آئی سی ایس کی تیاری کا خیال چھوڑ کر یونیورسٹی میں جونیئر لکچرر ہوگیا۔ بقول فراسٹ میرے سامنے دو راہیں تھیں ایک پر سب چلتے تھے دوسری پر کم لوگ جاتے تھے۔ میں نے جان بوجھ کر دوسری راہ اختیار کی اور اس سے بہت بڑا فرق پڑا۔

ایس ایس ایسٹ میں میرے قیام کا زمانہ بہت مختصر تھا۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا کہ

جب اقامتی زندگی کی شاندار روایات کے ساتھ علی گڑھ میں ایک ذہنی بیداری تھی۔ مطالعے، تحریر، تقریر، شاعری سب کے دیوانے موجود تھے۔ گالیوں میں بھی ایک سلیقہ تھا اور یہ گالیاں برآمدے میں یا سڑک پر نہیں کمرے کے اندر مخصوص احباب کی صحبت میں ہوتی تھیں۔ حسب روایت ڈائننگ ہال کے کھانے کی شکایت بھی ہوتی تھی مگر کوئی ہنگامہ نہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں شہر لوگ اکّے میں بیٹھکر جانے تھے۔ کچھ لوگوں کے پاس سائیکل بھی تھی۔ کچھ دوستوں کے ساتھ میں کبھی کبھار چاندنی راتوں میں اکّے میں بیٹھ کر ڈگّی والی سڑک پر اسٹیشن تک ہو آتا تھا۔ ناشتہ کر کے آٹھ نو بجے ہم لوگ کلاس چلے جاتے۔ ایک ڈیڑھ بجے آکر کھانا کھاتے اور کچھ دیر آرام کرتے۔ پھر میں یونین چلا جاتا اور وہاں کے کاموں کی دیکھ بھال کرتا۔ وہاں کوئی تقریب ہوئی تو دیر تک ٹھہرنا پڑتا۔ ورنہ شام کو کبھی خواجہ منظور حسین صاحب کے یہاں کبھی ستیدین صاحب کے یہاں، کبھی رشید صاحب کے یہاں، کبھی علی صغیر کے کمرے پر ممتاز ہاؤس چلا جاتا۔ اس زمانے کے دوستوں میں قیصر حسین زیدی (جن کا ۱۹۷۳ء میں انتقال ہوا) افضل بیگ۔ خواجہ غلام محمد صادق (سابق وزیر اعلیٰ کشمیر) عثمان احمد انصاری (جو اب لندن میں قیام پذیر ہیں اور کبھی کبھی ادھر آتے ہیں)۔ معاصرین میں اختر رائے پوری، سبط حسن۔ حیات اللہ انصاری بھی تھے۔ یہ سب آفتاب ہاسٹل میں رہتے تھے۔ اسی سال سجاد ظہیر نے آکر یونین میں سرمایہ داری کے بحران پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے میری درخواست پر سرمایہ داری پر یونین کے اہتمام میں اور میری صدارت میں ایک بصیرت افروز مقالہ سنایا تھا۔ یونین کے معاملات میں ڈاکٹر اشرف، ستیدین صاحب، شبیر احمد ہاشمی، محمود احمد (افسوس یہ سب مرحوم ہو چکے) گہری دلچسپی لیتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی یونین کے کسی جلسے میں سگریٹ پی سکے۔ کیسی کیسی سہانی، دلکش، رنگا رنگ یادیں طالب علمی کے اس دور

سے وابستہ ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں پروست کی حیثیت سے مہدیہال کی خدمت کا موقع ملا۔ یہ داستان بشرطِ فرصت پھر کبھی سنائی جائے گی۔ اس وقت تو تھوڑے سے تصرف سے اصغر گونڈوی کا یہ شعر پڑھ کر اجازت چاہتا ہوں۔

یہی تھوڑی سی مے تھی اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اسی سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے تھے

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں
کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غم کدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

(اقبالؔ)

پروفیسر مختارالدین احمد

یادوں کے چراغ

میں ۱۹۴۷ء میں سرسید ہال میں داخل ہوا اور ۷/۵ ایس ایس ویسٹ میں مقیم ہوا۔ ۱۹۵۲ء تک میرا وہاں قیام رہا۔ جب اس ہال میں آیا تھا تو ایم اے کا طالب علم تھا۔ جب میں نے ہال چھوڑا تو ڈاکٹریٹ کا کام مکمل کر چکا تھا۔ اس ہال کے پنج سالہ قیام کے زمانہ میں جن شخصیتوں سے متعارف ہوا۔ ان میں کچھ ایسی ہیں کہ انھیں بھلانا چاہوں بھی تو نہیں بھلا سکتا۔

سب سے پہلے حافظے کے افق پر اپنے شفیق پرووسٹ شفیع صاحب کی تصویر ابھرتی ہے۔ وہ اپنے ہال کے ذہین طالب علموں، یونین کے مقرروں اور نامور کھلاڑیوں میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے تھے اور یونیورسٹی کے دوسرے ہال کے ایسے طلبا کو جو ان صفات سے متصف ہوتے اپنی محبت اور کشش سے اپنے ہال میں کھینچ لاتے۔ میرے اور سید شاہ حسن عطا صاحب کے اس ہال میں آنے کے محرک شفیع صاحب ہی تھے۔ ہم دونوں یونیورسٹی کے پوسٹ ہولڈر تھے میں علی گڑھ اردو میگزین کا ایڈیٹر تھا اور شاہ حسن عطا صاحب یونین کے نامور وائس پریسیڈنٹ۔ شفیع صاحب کو انتظامی امور میں بڑی گہری دلچسپی تھی۔ وہ جفاکش، محنتی اور فرض شناس

آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے پرووسٹ شپ کے زمانہ میں ایس ایس ہال کو بہت نمایاں ترقی دی۔ ان کی صبح و شام اسی فکر میں کٹتی تھی کہ کیا وسائل اختیار کیے جائیں جن سے طلبا کو فائدہ ہو اور ہال کی عظمت میں اضافہ ہو۔ وہ جس نظم و ضبط، ہمت و استقلال، محنت اور فرض شناسی سے کام لیتے تھے وہ ہم سبھوں کے لئے اب بھی باعثِ تقلید ہے۔ شفیع صاحب کی شفقت و محبت کو ربع صدی گذرنے کے بعد بھی بھول نہیں سکا ہوں۔

متحدہ ہندوستان کے نہایت ممتاز عربی کے فاضل، پروفیسر عبدالعزیز میمنی سے بھی تعلقات اسی زمانہ میں بڑھے۔ اگرچہ میں واقف ان سے پہلے سے تھا۔ اس وقت شعبۂ عربی ایس ایس ہال کے اس مغربی گوشے میں تھا جہاں اب کامرس کا شعبہ ہے۔ عمارت کے اس حصے پر شعبۂ عربی کا کتبہ جو عربی زبان میں سرخ پتھر پر منقوش ہے اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وسیع لکچر ہال کے بعد مشرق کی طرف پہلا کمرہ صدر شعبۂ عربی کا آفس تھا جہاں پروفیسر عبدالعزیز میمن بیٹھا کرتے تھے۔ جب ذاکر صاحب کے زمانہ میں شعبۂ عربی منتقل ہو کر عثمانیہ ہوسٹل کے اوپر جغرافیہ اور انگریزی کے شعبوں کے پہلو میں چلا گیا تو یہاں کامرس کا شعبہ (جس کے پہلے صدر شفیع صاحب تھے) آگیا اور عربی کے صدر کا کمرہ شفیع صاحب نے مجھے تفویض کر دیا یہ ۵ ایس ایس ویسٹ قرار پایا۔ میمن صاحب کی مناسبت کی وجہ سے یہ کمرہ مجھے عزیز تھا اور میں آفتاب ہال سے فوراً یہاں منتقل ہو گیا۔

میمن صاحب سے میری پہلی اہم ملاقات، جس نے میری زندگی کا رُخ متعین کر دیا اسی کمرے میں ہوئی۔ علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد میں ایم اے میں داخلہ کے لئے متردد تھا کہ اردو میں داخلہ لوں یا عربی میں۔ میری دلچسپی دونوں مضامین میں برابر کی تھی۔ سیاہ شیروانی کی ایک جیب میں ایم اے اردو کا اور دوسری میں ایم اے عربی کا فارم پُر کر کے میں نے رکھ چھوڑا تھا اور طے نہیں کر پایا تھا کہ کس مضمون کو چھوڑوں اور کسے اپناؤں۔ میمن صاحب سے اس تردد کا ذکر کیا تو بولے کہاں ہیں فارم؟ میں نے دونوں فارم ان کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ انہوں نے

اردو کا فارم چاک کرکے دفتر کی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور عربی کے فارم پر اپنے دستخط کرکے میرے حوالہ کر دیا اور اپنا مخصوص قہقہہ لگا کر بولے: "لیجئے فیصلہ ہو گیا"۔

میں بہت کم دوسرے علماء کے تبحرِ علمی سے اس قدر متاثر ہوا ہوں جس قدر ان سے ہوا ان کا علم بڑا وسیع ہے اور حافظہ بے پناہ۔ انہیں عربی کے ایک لاکھ سے زیادہ شعر یاد ہوں گے اور معلوم نہیں کس قدر ضرب الامثال اور نثر کی عبارتوں کے ٹکڑے۔ میمن صاحب بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں اور یورپ کے مستشرقین کی نگاہوں کے مرکز اور عربی زبان وادب کے طالب علموں کے مرجع رہے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے پہلی ملاقات یہیں ایس ایس ہال میں ہوئی۔ ہمارے پرووسٹ شفیع صاحب نے اپنے ہال کے ممتاز طلباء کو نئے وائس چانسلر سے ملانے کے لئے ایک شب انہیں مدعو کیا۔ ہم لوگ سر سید ہال کا من روم میں جمع ہوئے۔ ہر ایک سے تعارف شروع ہوا۔ جب شفیع صاحب نے مجھ کو ذاکر صاحب سے متعارف کیا تو بولے: "میں آپ کو جانتا ہوں۔ میرا قیاس ہے کہ رشید صاحب نے جو اردو میگزین کے سنسر تھے غائبانہ تعارف کرایا ہوگا۔ کل ہی آپ کے نام کے دو چیکوں پر میں نے دستخط کئے ہیں۔" ذاکر صاحب اس زمانہ میں وائس چانسلر کے ساتھ یونیورسٹی کے ٹریژرر بھی تھے اور غالباً یہ دونوں چیک میگزین کی طباعت کے سلسلے کے ہوں گے۔

ذاکر صاحب کے زمانہ میں آئے دن ہندوستان اور بیرونِ ہند کی اہم شخصیتیں علی گڑھ آتی رہتی تھیں۔ ایس ایس ہال اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے یونیورسٹی کے اہم ہالوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ہال چونکہ وکٹوریہ گیٹ، اسٹریچی ہال، لٹن لائبریری، جامع مسجد اور تربت سر سید اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے اور اپنے خوبصورت لان اور سبز و شاداب روشوں کے حسن کی وجہ سے ممتاز ہے اس لئے ممتاز مہمان یہاں ضرور آتے تھے۔ ان مہمانوں میں وہ چند شخصیتیں اس وقت یاد آ رہی ہیں جنہوں نے میرے ہوسٹل کے کمرے میں اپنی آمد

سے میری عزت افزائی فرمائی تھی۔

حکومتِ ہند نے اس زمانہ میں ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا جس کے چیرمین ڈاکٹر رادھا کرشنن تھے جو بعد کو ہندوستان کے صدر مقرر ہوئے۔ دورانِ تحقیقات میں یہ کمیشن علی گڑھ بھی آیا اور متعدد اساتذہ اور طلبا سے اس نے تبادلۂ خیال کیا۔ ایس ایس ہال کے طلبا میں میرا اور شاہ حسن عطا کا انتخاب ہوا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ کمیشن کے اراکین ہم لوگوں کے کمروں میں ملیں گے۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ علی گڑھ کے طالب علموں کے رہنے سہنے کا طریقہ بھی دیکھیں۔ مجھے یاد ہے ایک رات پہلے یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارے کمرے کمیشن کے ممبروں کی آمد اور نشست کے لیے مناسب ہیں یا نہیں۔ ذاکر صاحب شفیع صاحب کے ساتھ خود تشریف لائے اور انتظام مکمل دیکھ کر بہت مسرور واپس گئے۔ دوسرے دن پروگرام کے مطابق ذاکر صاحب (وہ خود بھی کمیشن کے ممبر تھے اور رپورٹ لکھنے کا بیشتر کام یہی کر رہے تھے) رادھا کرشنن اور دوسرے ممبروں کو (جن میں دو انگریز بھی تھے) لے کر آئے اور تھوڑی دیر رہ کر چلے گئے۔ گفتگو زیادہ تر رادھا کرشنن نے کی، میز کی طرف بڑھے اور دو تین کتابیں اٹھا کر دیکھیں اور پوچھا اپنے مضمون کے علاوہ کس قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں، وہ غالباً جاننا چاہتے تھے کہ علی گڑھ کے طلبا کا عام رجحان کیا ہے اور کس قسم کی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ جہاں تک یاد آتا ہے میز پر عبداللہ یوسف علی کا ترجمۂ قرآن پاک، عرب کے مشہور شاعر ابو العلاء المعری کے خطوط کا انگریزی ترجمہ جو آکسفورڈ سے چھپ کر آیا تھا، سمرسٹ مام کی نئی تصنیف "سمنگ اپ"، ولکی کی "ون ورلڈ"، "بیلیز ایج" کا تازہ شمارہ اور اسی طرح کی ایک دو چیزیں اور بھی تھیں۔

ایک ممبر نے پوچھا تم ورزش کرتے ہو یا یونین جاتے ہو؟ مجھے ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آیا لیکن معاملہ جلد نمٹانے کی خاطر میں نے عرض کیا دونوں کام کرتا ہوں، صبح کو ورزش کرتا ہوں اور شام کو یونین جاتا ہوں۔ ایک صاحب نے ڈائننگ ہال کے کھانوں

کا حال پوچھا کر کھانا کیسا ملتا ہے؟ (یہاں کے طلب غالباً سرسید کے عہد سے لے کر موجودہ زمانے تک ڈائننگ ہال کے کھانے کے ہمیشہ شاکی رہے اور ڈائننگ ہال کی شکایت جملا محبوب مشغلہ رہا ہے ذاکر صاحب کا زمانہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا) میں نے جواب میں کہا، ہال کا کھانا حفظانِ صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ مجھے یاد ہے اس جواب پر ذاکر صاحب کے چہرے پر ایک خاص قسم کی مسکراہٹ پیدا ہوئی تھی۔

میرے دوسرے مہمان یو پی کے گورنر سر ہومی مودی (مشہور سیاسی کارکن پیلو مودی کے والد تھے) ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ آئے تھے ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۱ بجے صبح کو وہ ۱۷ ایس ایس ویسٹ میں تشریف لائے اور سہ پہر کو کانفرنس ہال کے شعبۂ مخطوطات و نوادر میں جس کا میں نگراں تھا، وہاں کے قلمی نوادر اور تحریرات و تصاویر دکھلانے کا کام ذاکر صاحب نے میرے سپرد کیا تھا۔

مصر کے مشہور ادیب اور سیاست داں عبدالوہاب عزّام (عبدالرحمٰن عزّام سکریٹری عرب لیگ کے بھائی، جو بعد کو پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے) یاد آتا ہے میرے ایس ایس ہال کے قیام کے ابتدائی زمانے میں علی گڑھ آئے تھے۔ یہ ایشین ریلیشن کانفرنس دہلی میں مصر کے مندوب بن کر آئے تھے۔ مصطفیٰ مومن مصری وفد کے صدر تھے اور عزّام عرب لیگ کے نمائندہ ملایا کے وفد کے صدر ڈاکٹر برہان الدین بھی ساتھ تھے، ہم عربی کے طالب علم ان کی پیشوائی میں پیش پیش تھے ایس ایس ویسٹ کے اس لان پر جو جامع مسجد کے قریب ہے ایک جلسے کا انعقاد ہوا، میمن صاحب قبلہ نے عزّام کی تقریر کا برجستہ ترجمہ کیا تھا۔ دوسرے دن اسٹریچی ہال میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔ عزّام صاحب سے تعلقات کی بنا پر میمن صاحب نے دوسرے دن بھی ان کی تقریر کا ترجمہ کرنا منظور کر لیا تھا۔ مصطفیٰ مومن وغیرہ کی تقاریر کا ترجمہ مانسہرہ ضلع ہزارہ کے ایک ذہین اور مستعد ایم اے عربی کے طالب علم اور میرے دوست مفتی محمد ادریس نے کیا تھا اور حاضرین سے خراجِ تحسین حاصل کیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد مصر کے اخبار نویسوں کا ایک وفد علی گڑھ وارد ہوا، ان میں عبدالحمید حدیدی، زکریا الشربنی، عبدالقدوس، احمد قاسم جودہ، احمد ابوالفتح، صالح عبدالحمید کے نام یاد آتے ہیں۔ ہم عربی کے طالب علموں نے شعبے میں ایک محبت منعقد کی، چائے کا اہتمام کیا بڑے ہال میں ہوا تھا جہاں اب پروفیسر قمرالحسن فاروقی ڈین فیکلٹی آف کامرس اور وہاں کے اساتذہ بیٹھتے ہیں۔ ان مصری مہمانوں میں بعض کو میں نے اپنے کمرے پر بھی مدعو کیا تھا۔

ایک بار علی گڑھ کے مشہور اولڈ بوائے "خادم قوم" ڈاکٹر سید محمود علی گڑھ آئے ہوئے تھے، عبدالمجید خواجہ صاحب کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ شاہ حسن عطا صاحب نے انہیں صبح کے ناشتے پر مدعو کیا، ان کے کمرے میں کوئی ۳۰، ۳۵ آدمی مدعو تھے، ملک کی عام سیاسی حالات پر گفتگو رہی، اس نشست کے بعد کچھ دیر کے لیے، کچھ اس تعلق سے بھی کہ ان کے صاحبزادے سید حبیب صاحب میرے دوست تھے، کرم فرما کر میرے کمرے پر آئے اور کافی نوش کی۔ گفتگو کے موضوعات مرزا غالب (جس سے ان کو دلچسپی تھی اور میں اس زمانے میں میگزین کا غالب نمبر مرتب کر رہا تھا) قدیم علی گڑھ کی روایات اور ایم اے او کالج کے سابق طلبا تھے میری جس آٹوگراف بک پر انھوں نے اردو اور ہندی دونوں میں دستخط کئے تھے اب بھی میرے پاس موجود ہے۔

ان کے علاوہ شیخ عبداللہ بانی گرلز کالج کئی بار اس کمرے میں تشریف لائے۔ ذاکر صاحب بھی متعدد بار آئے۔ پہلی مرتبہ اس شام تشریف لائے جب علی گڑھ اور بیرون علی گڑھ کے متعدد اصحاب ان کے اعزاز میں میرے یہاں مدعو تھے، ان میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) خواجہ محمد اشرف (حیدرآباد) اور پروفیسر عبدالعزیز میمن، ڈاکٹر عبدالعلیم پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر سید بشیرالدین صاحب لائبریرین کے اسمائے گرامی اس وقت یاد آتے ہیں۔

علی گڑھ میں ۱۷ اکتوبر کو سرسید ڈے بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ سرسید ہال کے دوران قیام میں ایک بار خیال ہوا کہ اس موقع پر سرسید کی تصانیف و نوادر کی نمائش کرنی چاہیئے، دوستوں نے مدد کی، بزرگوں نے ہمت بڑھائی اور آخر ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو علی گڑھ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سرسیّد کی تصانیف، مطبوعات و مخطوطات، ان کے مکاتیب اور دوسری تحریرات اور بعض تصاویر و اشیا کی نمائش کا اہتمام کیا۔ سرسید ہال کے دوستوں میں مسعود صدیقی، نفیس احمد ترمذی نے بہت ہاتھ بٹایا۔ صاحبزادہ شہزاد احمد صاحب (خلف آفتاب احمد خاں مرحوم) نے ایک طالب علم پر بھروسہ کر کے سرسید کے متعدد قلمی خطوط اور ان کی بعض استعمال کردہ اشیاء عنایت کی تھیں۔ سید بشیر الدین صاحب لائبریرین نے سرسیّد کی تصانیف اور لائبریری کے دوسرے نوادر نمائش کے لیئے ہم لوگوں کے حوالہ کیئے، سائنس کے شعبوں سے شوکیس مستعار لیے، شفیع صاحب نے جو ہمارے پروسٹ تھے ہر طرح مدد کی اور بڑی ہمت افزائی کی۔

۱۶ اکتوبر کو آدھی رات کو جا کر نمائش کی ترتیب مکمل ہوئی، نمائش کا انتظام نظام میوزیم کے متصل ہال میں ہوا تھا اب فکر ان اشیاء کی حفاظت کی ہوئی، اس کا انتظام یہ کیا کہ میں نے اور میرے چند دوستوں نے ہاسٹل سے بستر منگوا لیئے اور پوری رات نمائش کے ہال میں گذاری، دوسرے دن ذاکر صاحب نے نمائش کا باقاعدہ افتتاح کیا اور ہم لوگوں نے سرسید ہال میں جو شام کو جلسہ منعقد کیا تھا اس کی صدارت فرمائی، جلسہ کوئی دس بجے رات کو ختم ہوا اور نمائش کئی دن تک چلتی رہی۔ ذاکر صاحب نے اور یونیورسٹی کے لوگوں نے اس نمائش کو اس قدر پسند کیا کہ اس دن کے بعد سے سرسید ڈے کے موقع پر نمائش اس دن کے پروگرام کا ضروری جزو بن کر رہ گئی ہے یہ بات اب بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ آج سرسید ڈے کے موقع پر جوان کے آثار، تصانیف کی نمائش یونیورسٹی لائبریری میں ہوتی ہے

اور جو ایک جلسے کا انعقاد یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہوتا ہے اس کی داغ بیل آج سے بیس پچیس سال پہلے سرسید ہال کے ایک طالب علم کی کوششوں سے پڑی تھی۔

O

ایس ایس ہال میں میرے زمانہ کے طالب علموں میں اور میرے ملنے والوں میں مختلف قسم کے لوگ تھے، ایک سے ایک پڑھنے والے بھی، گپ باز بھی، کھلاڑی بھی، شکاری بھی یونین کے مقرر بھی، ادب سے دلچسپی رکھنے والے بھی۔ ان میں سید شاہ حسن عطا تھے۔ سلون کے سید زادہ تھے اور مشائخ کے خاندان سے۔ بی اے میں مرے ساتھی بنے۔ مولانا بدرالدین علوی کی عربی کلاس میں ہم لوگ ایک ساتھ بیٹھتے تھے۔ ایم اے کے زمانہ میں دونوں ایس ایس ہال آ گئے تھے، پہلے وہ شعبۂ انگریزی میں داخل ہوئے، لیکن پروفیسر عمرالدین صاحب کی شفقت نے انھیں شعبۂ فلسفہ میں کھینچ لیا، یونین کے وائس پریسیڈنٹ تھے بہت ذہین آدمی تھے اور بے پناہ اچھے مقرر۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی جس زبان میں اور جس موضوع پر چاہے تقریر کرا لیجیے۔ راج گوپال آچاری جو اس زمانے میں گورنر جنرل تھے ایک بار علی گڑھ تشریف لائے، راجہ جی یونین میں ان کی تقریر سنکر مبہوت ہو گئے تھے۔ لکھتے کم تھے، لیکن انہوں نے اردو خطوط جو بے تکلف احباب کو لکھے ہیں وہ پڑھنے اور محفوظ رکھنے کے لائق ہیں، ان ساری خوبیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ نیک نفس شریف اور بڑے مخلص دوست ثابت ہوئے۔ اب پاکستان میں ہیں، مختلف ملازمتیں انہوں نے کیں، لیکن انھیں شاید ہی کوئی ملازمت راس آئے۔ افسوس ایسی اعلیٰ صلاحیت کے آدمی کو حکومتِ پاکستان ان کے شایانِ شان کوئی خدمت نہیں تفویض کر سکی۔

— مسعود صدیقی تھے، بھوپال کے رہنے والے، نہایت خوبصورت اور وجیہ آدمی جس قدر خوبصورت چہرہ رکھتے تھے اسی قدر خوبصورت دل کے مالک تھے، جو ناگڑھ سے بی اے کر کے آئے تھے اور یہاں میرے ساتھ ایم اے (عربی) کر رہے تھے۔ ذہین اور محنتی طالب علم

تھے اور بڑے خوش ذوق آدمی، انتظامی صلاحیتوں کے مالک، میں صاحب قبلہ ان سے بہت محبت کرتے تھے، ڈراموں میں بھی کبھی کبھی حصہ لیا کرتے تھے، ایم اے کے بعد بھوپال چلے گئے تھے، جہاں سے ایک قلمی رسالہ نکالتے تھے اور غالباً کسی علمی ادارے سے منسلک تھے، بعد کو سیفیہ کالج بھوپال میں وائس پرنسپل ہو گئے تھے، آج کل سعودی عرب میں محکمہ تعلیمات میں ملازم ہیں، مسعود صاحب کے ساتھ ان کے دو رفیق حشمت صاحب اور شیخ صاحب کی یاد بھی آتی ہے، حشمت اللہ انصاری صاحب بڑے سنجیدہ اور وفاشعار آدمی تھے، کامرس کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ معلوم نہیں اب کیا کر رہے ہیں، شیخ عبدالمجید صاحب قانون کا مطالعہ کر رہے تھے اور باتیں بھی قانونی کرتے تھے، قیاس غالب ہے کہ انہوں نے وطن جاکر وکالت ہی کا پیشہ اختیار کیا ہوگا۔

____ نفیس احمد زندی تھے۔ کامرس میں بی اے کر رہے تھے۔ بڑے جفاکش اور محنتی، لیکن ایسے مخلص لوگ کم دیکھنے میں آتے ہیں، بڑے بڑے سخت حالات سے نبردآزما ہوتے رہے لیکن چہرے پر زہی شگفتگی برقرار رہی جو ان کی طبیعت کا خاصا تھی، ہر ایک کی مدد کو آمادہ رہتے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، غیر تعلیمی کاموں میں بھی خاصی دل چسپی رکھتے تھے، ایس ایس ہال ڈرامیٹک سوسائٹی کے پرجوش کارکن تھے اور خود بھی ڈراما میں حصہ لیتے تھے، ایک بار اسٹریچی ہال میں ایک پاگل کی نقل انہوں نے ایسی کی تھی کہ ایک استاد میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو ان سے واقف تھے، لیکن انھیں شبہ ہوا کہ نفیس واقعی پاگل ہو گئے ہیں اور زبردستی اسٹیج پر گھس آئے ہیں۔ علی گڑھ سے ام کام کرنے کے بعد جموں یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے تھے وہاں جگر کی تکالیف میں مبتلا ہوئے اور بعد کو علی گڑھ میڈیکل کالج کے ہسپتال میں داخل ہوئے معالجین نے بہت کوشش کی لیکن وقت پورا ہو چکا تھا، انتقال کے کئی دن پہلے انھیں دیکھنے گیا تھا، حسب معمول ہشاش بشاش تھے اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند دنوں کے بعد وہ وفات پا جائیں گے، خوب آدمی تھے خدا ان پر رحمتوں کے پھول برسائے اور ان کی مغفرت کرے۔

—— صلاح الدین احمد تھے، ذہین کھلے اور مرنجانِ مرنج آدمی، سیاسیات میں ایم اے کر رہے تھے بعد کو پاکستان چلے گئے اور پی سی ایس کے مقابلے میں کامیاب ہوئے، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۵ء میں ہسپانیہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، اور کچھ دنوں کے لیے لندن آکر بھی ٹھہرے تھے، مجھ سے ملنے آکسفرڈ بھی آئے تھے، اب پاکستان میں یقیناً وہ کسی اچھے عہدے پر فائز ہوں گے۔

—— حفیظ زیدی تھے، فلسفے میں ایم اے کر رہے تھے، ذہین آدمی تھے اور اپنے مضمون میں بہت اچھے، چھوٹا قد، روشن آنکھیں، جب چاہیں ناراض ہو جائیں اور جب چاہیں مسکرا دیں، دونوں باتیں اس طرح ان کی قدرت میں تھیں کہ دونوں کیفیتوں میں اگر وہ چاہیں تو چند ثانیوں کا بھی فرق نہ آنے دیں، پاکستان جا کر کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ میں لکچرر ہو گئے تھے وہاں سے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے، میرے دورانِ قیام یورپ میں لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور وہیں سے انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، غالباً اب وہ کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ہوں گے اور ممتاز استاد۔

—— معین الدین مرزا تھے، بہت خوبصورت وجیہ آدمی، میرے ہوسٹل کے آخری کمرے میں رہتے تھے جو باب الرحمۃ کے قریب ہے اور جامع مسجد سے متصل، خاموش آدمی تھے اور ہوسٹل میں خاصا اثر رکھتے تھے، جونیر لڑکے خاص طور پر ان سے گھبراتے تھے، ۱۹۵۷ء میں ان سے لندن میں انڈین ہائی کمشنر کے دفتر میں اچانک ملاقات ہوئی، معلوم ہوا انگلستان میں سکونت پذیر ہو گئے ہیں اور وہیں ایک انگریز خاتون سے شادی کر لی ہے غالباً اب بھی وہیں ہوں گے، ان کے ساتھ ہوسٹل میں ایک طالب علم تھے گورے گورے سے خوبصورت آدمی جب معین مرزا صاحب مرغ کا اہتمام کرتے تھے تو آس پاس کے لوگوں کو اس کی اطلاع اس طرح ہو جاتی تھی کہ یہ حضرت مرغ کی ایک دبیز سی ٹانگ لے کر کمرے میں باہر برآمدے میں چلے آتے تھے اور وہاں ٹہلتے ہوئے اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھستے جاتے نوش فرماتے تھے۔

اس طرح آس پاس کے کئی کمروں کو اور راہ چلتے والوں اور مسجد جانے والوں کو بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ مرغ تناول کیا جا رہا ہے۔

—— احمد شاہ تھے، پٹنہ کے مشہور ڈاکٹر محمود شاہ کے صاحبزادے، دبلے پتلے چھوٹے سے ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے، ڈاکٹر محمود شاہ نے مجھے ان کا نگراں مقرر کر دیا تھا۔ میں انھیں احمد شاہ بخاری کہا کرتا تھا۔ بات مانتے تھے اور پڑھنے میں معروف رہتے تھے بعد کو ڈاکٹر ہوئے اور لندن جا کر ہارٹ اسپیشلسٹ ہوئے۔ اب پٹنہ میں ان کا اپنا نرسنگ ہوم ہے اور قلب کے مریضوں کے علاج کے لئے مشہور ہیں، ان کے چچا زاد بھائی محمد شاہ تھے، یہ بھی مجھ پر بڑے مہربان تھے، میری بات سن لیتے تھے اگرچہ ماننے کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے، تعلیم کے علاوہ بھی بہت سی دلچسپیاں رکھتے تھے۔

—— حسین مجید اور حسن مجید تھے، یہ دونوں بھائی علی گڑھ کے اولڈ بوائے پروفیسر عبدالمجید صدر شعبۂ جغرافیہ پٹنہ یونیورسٹی کے صاحبزادے تھے چھوٹے بھائی حسن مجید میرے روم فیلو تھے اور نہایت سعادت مند اور ہونہار، بڑے بھائی حسن مجید بھی پاس ہی رہتے تھے اور سنجیدہ طالبعلم تھے، اور اب دونوں پٹنہ میں اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔

—— پرنس تھے، نام یاد نہیں رہا، بہت نازک اندام خوبصورت سے، ناز و نعم کے پلے ہوئے۔ ان کے دوست احباب انھیں پرنس کہتے تھے، اور یہ شہزادوں جیسی حرکتیں بھی کرتے تھے آرہ (بہار) کے رہنے والے تھے، معلوم نہیں کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں پرنس کہلانا اس حد تک پسند کرتے تھے کہ اس زمانہ کے ہوسٹل گروپ فوٹو میں ان کا نام صرف پرنس ہی چھپا ہے۔

—— عنایت آفتاب تھے، بہار کے رہنے والے، نہایت گورے چٹے اور مردانہ حسن کا بہترین نمونہ، معاشیات میں ایم اے کر رہے تھے، فنونِ لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور یونین پریسیڈنٹ شپ کے لئے امیدوار ہوئے تو الکشن کے دوران میں حسب دستور ان کے خلاف

جو پمفلٹ نکلے تھے اس میں ایک الزام ان پر یہ بھی تھا کہ وہ رقص کرنا جانتے ہیں اور یونین کے لئے ہمیں اچھا مقرر چاہیئے رقاص نہیں لیکن وہ تقریروں میں بھی کسی سے کم نہیں تھے، آخر کثرت رائے سے یونین کے پریسیڈنٹ مقرر ہوئے، اپنی پریسیڈنٹ شپ کے دوران میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف سیاسی جماعتوں کے بعض زعماء کو یونین میں بلا کر ایک سمینار منعقد کیا تھا، اڑیسہ کے سری مہتاب بھی مدعو تھے، انہوں نے اپنی تقریر میں کہا، صاحبو! آفتاب کی عنایت سے علی گڑھ میں مہتاب آ گیا، یہ کیسے ممکن تھا کہ نہ آتا، مہتاب تو آفتاب کے تابع ہے اسس پر بہت دیر تک یونین میں تالیاں بجتی رہیں، جب ذاکر صاحب کے زمانہ میں صدر جمہوریہ ہند راجندر پرشاد علی گڑھ آئے تو عنایت آفتاب نے انھیں حسب دستور یونین میں بلایا اور نہایت اچھی انگریزی میں انھیں خوش آمدید کہا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ یونین پبلک سروس کمیشن کے مقابلہ کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوئے اور ریلوے کے اکاؤنٹس کے محکمے میں آفیسر مقرر ہوئے۔ کچھ سال پہلے اجمیر میں تھے اب مرکزی حکومت کے فنانشل ایڈوائزر ہیں اور لکھنؤ میں مقیم ہیں۔

خورشید میر تھے، یہ کشمیر سے آئے تھے، پُرجوش نوجوان تھے اور یونین کے سرگرم ممبر، غالباً یونین کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے تھے، بعد کو پاکستان چلے گئے ان کی حاضر جوابی اب بھی یاد آتی ہے، میاں افتخار الدین علی گڑھ آئے ہوئے تھے وہ خواجہ منظور حسین (استاد شعبۂ انگریزی) کے ہم زلف اور پروفیسر میاں محمد شریف (صدر شعبہ فلسفہ) کے داماد تھے، بدر باغ میں پروفیسر محمد حبیب کی کوٹھی کے پاس میاں صاحب کی شاندار کوٹھی تھی اسی میں ٹھہرے ہوئے تھے، میں اور خورشید میر، افتخار الدین صاحب سے ملنے گئے، مقصد صرف ملاقات کرنا تھا لیکن خورشید صاحب نے باتوں باتوں میں انھیں یونین میں تقریر کرنے کے لئے مدعو کر لیا، میاں صاحب نے اچانک پوچھا! کتنے مائکروفونوں کا انتظام ہے، میرے لئے کم از کم دو چاہئیں، (یونین کے مختصر ہال کے لئے ہمیشہ ایک مائکروفون کافی ہوتا ہے)

خورشید صاحب نے فوراً جواب دیا دو نہیں آپ کے لئے تین مائکروفون کا انتظام ہے، میاں صاحب فوراً راضی ہو گئے، ایک خورشید میر صاحب جو ابھی تک پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیر کے عہدے پر فائز ہیں مجھے معلوم نہیں یہی علی گڑھ والے خورشید میر ہیں یا کوئی اور۔

—— شوکت حمید تھے باغپت کے رہنے والے۔ ایس ایس ایسٹ میں مقیم تھے، فارسی میں ایم اے کر رہے تھے اور قانون کا مطالعہ بھی کر رہے تھے۔ بہت اچھے مقرر تھے یونین میں عام طور پر شوکت حمید اپنے دو احباب سلیم صاحب اور عشرت حسین قیصر کے ساتھ پچھلی بنچوں پر بیٹھتے اور نوخیز مقرروں کی تادیب کرتے تھے۔ میرے دوست مونس رضا صاحب نے جو آج کل نہرو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اسی زمانہ میں یونین میں بولنا شروع کیا تھا کیسی کیسی ہوٹنگ ہوتی تھی، لیکن مونس دھن کے پکے اور ارادے کے مضبوط تھے برابر تقریریں کرتے رہے کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا علی گڑھ کے کامیاب مقرروں میں شمار ہونے لگا، سلیم صاحب ستار بہت اچھا بجاتے تھے۔ قیصر صاحب تقریریں بہت اچھی کرتے تھے، اور یونین کے وائس پریسیڈنٹ بھی مقرر ہوئے تھے۔ کوئی بیس۲ سال کے بعد حبیب منزل میرس روڈ کی ایک ضیافت میں جو پروفیسر عبدالعلیم صاحب کے وائس چانسلر مقرر ہونے پر ترتیب دی گئی تھی، ان سے ملاقات ہوئی، داڑھی بڑھالی تھی اور خاصے خاصانِ خدا میں معلوم ہوتے تھے معلوم ہوا کہ کراچی میں مقیم ہیں اور سمندر میں ان کے کئی جہاز چلتے ہیں۔ شوکت حمید صاحب باغپت ہی میں مقیم رہے، علی گڑھ یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر تھے، کبھی کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی تھی کئی سال ہوئے انہوں نے باغپت میں وفات پائی۔

—— اے۔ ٹی۔ ایم مصطفےٰ تھے مشرقی بنگال کے رہنے والے قانون پڑھ رہے تھے اور یونین کے بہت اچھے مقرروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ بہت اچھی انگریزی بولتے تھے اور اپنی پرجوش تقریروں کے لئے مشہور تھے، یونین کے الکشن میں وائس پریسیڈنٹ شپ کے لئے

امیدوار ہوئے۔ میرے ان کے پہلے سے تعلقات تھے۔ الکشن میں کامیابی کے بعد تعلقات میں مزید اضافہ ہوگیا۔ بہار کے فسادات میں ریلیف کے سلسلے میں جو یونین نے ایک سب کمیٹی بنائی تھی اس میں مصطفےٰ تھے، شہاب الدین محمد مفتی تھے اور راقم الحروف تھا ہمارا کام وہاں جاکر فساد زدہ علاقہ کا دورہ کرنا اور ملبوسات اور دوسری اشیاء جیسے یونین نے فراہم کیا تھا مصیبت زدگان تک پہونچانا تھا، مصطفےٰ یاد آتا ہے، گاندھی جی سے بھی ملے تھے جو اس پر آشوب دور میں وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پنڈت نہرو اور سردار عبدا لرب نشتر اپنا طوفانی دورہ ختم کرکے واپس جاچکے تھے، لیکن سر فیروز خان نون وہاں ٹھہرے ہوئے تھے ہم لوگ مسٹر محمد یونس وزیر اعظم بہار کے گرینڈ ہوٹل میں ان سے جاکر ملے جہاں وہ فروکش تھے۔ مفتی صاحب ہجرت کے نام پر جو فرار کی راہ بہار کے لوگ اختیار کر رہے تھے اس کے بہت خلاف تھے اور وہ اس کے لئے لیگ کی قیادت کو ذمہ دار قرار دیتے تھے، انھوں نے فیروز خاں نون سے بہت طویل گفتگو کی اور انھیں بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ مسلم لیگ جو بہار کے لوگوں کو بنگال منتقل کر رہی ہے یہ صحیح طریقہ کار نہیں اسے روکئے اور یہیں ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگ امن وسکون سے رہ سکیں، لیکن سر فیروز خان پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ہوا بگڑ چکی تھی، پٹنہ کے انجمن اسلام ہال میں ریلیف کیمپ کا دفتر کھل گیا تھا اور فساد زدہ علاقوں کے مصیبت زدگان کو کلکتہ کا ریلوے ٹکٹ اور خرچ کے لئے رقمیں دی جارہی تھیں اور لوگ بے تحاشا بنگال ہجرت کر رہے تھے۔ اے۔ ٹی۔ ایم مصطفےٰ کو ہم لوگ ان کی پرجوش اور بے باک تقریروں کی وجہ سے ایٹم مصطفےٰ کہتے تھے۔ ان کی بے باکی وجہ سے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد بھی انہیں پسند نہیں کرتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہی نے شوکت حمید کو ان کے خلاف کھڑا کیا تھا جب مصطفےٰ رایوں کی کثرت کی وجہ سے وائس پریسیڈنٹ مقرر ہوگئے تو ڈاکٹر صاحب نے شوکت حمید کو پریسیڈنٹ مقرر کر دیا، ورنہ اس سے پہلے یونین میں وائس پریسیڈنٹ ہوتے تھے، یونین کے پریسیڈنٹ وائس چانسلر یا پرو وائس چانسلر ہوا کرتے تھے، مصطفےٰ

مشرقی پاکستان سے بار ایٹ لا کرنے کے لئے لندن گئے اور واپسی کے بعد سیاست میں داخل ہوئے اور ترقی کر کے پاکستان کی مرکزی وزارت میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ ایک کانفرنس میں مندوب بن کر جاپان گئے ہوئے تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور وہیں جان، جان آفرین کے سپرد کی۔

—— سیف الدین تھے۔ جنوبی ہند کے رہنے والے، ال ال بی کر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا خاصے دنیادار ثابت ہوں گے لیکن برسوں کے بعد ایک دن علی گڑھ آ کر ملے تو معلوم ہوا خاصے اللہ والے ہو گئے ہیں، لمبا کرتا، چہرے پر داڑھی، تبلیغی جماعت کے ساتھ دورہ پر علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ تقریریں بھی کرنے لگے ہیں، ان کی بے نفسی اور خلوص پر دل بہت متاثر ہوا، کہنے لگے وکالت کرتا تھا اور ہزاروں کی پریکٹس تھی، لیکن کسب معاش کا یہ ذریعہ پسند نہیں آیا اب اسے چھوڑ کر جمال محمد کالج ترچناپلی میں معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور خدا توفیق دیتا ہے تبلیغی دوروں پر چلا آتا ہوں۔ ابھی یہ سطور لکھ رہا تھا کہ ان کا ایک خط ملا " میرا ایک فرزند میڈیکل میں داخلہ لیے تھے، اللہ سے دعا فرمائیں کہ اس کا کورس پورا ہو اور دین کی خدمت والا بنے، دوست کبھی کبھی یاد آ جاتے ہیں تو علی گڑھ کی زندگی آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے اور آپ سب اور سرسید ہوسٹل کی زندگی کا خیال آ جاتا ہے، آپ کی پُرخلوص محبت ہمیشہ مجھے یاد آتی ہے، اللہ سے دعا ہے کہ آپ سب کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے آمین، وہاں سب احباب کو سلام علیک، پروفیسر فاروقی صاحب ابھی ملازمت میں ہیں یا ریٹائر ہو گئے اگر ملاقات ہوئی تو یاد دہانی کے ساتھ ہمارا سلام علیک سنا دیں "

—— احتشام تھے۔ شاید ملیح آباد کے رہنے والے، لیکن مونچھیں خطرناک رکھتے تھے اور چہرے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قائم گنج کے قرون اولی کے مسلمان ہیں، جب چاہیں اور جس کو چاہیں ٹھونک دیں، ہوسٹل کی بہت سی پابندیوں سے آزاد تھے، ضرورت کے وقت لوگوں کے بہت کام آتے تھے، خاصے خوش گفتار تھے، جم جائیں تو گھنٹہ دو گھنٹہ کیا گپ میں پوری رات

گذار دیں، ان پر علی گڑھ کی پوری چھاپ تھی، چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے اور بڑوں کی عزت،

—— محمد علی تھے، پٹنہ کے رہنے والے، پہلے بھی بھاری بھر کم تھے اور اب بھی تنومند جسیم ہیں، عمدہ انسان اور بہت اچھے طالب علم، زوالوجی میں تعلیم مکمل کر کے کلکتہ میوزیم میں افسر مقرر ہو گئے ہیں، وہیں ان سے کئی سال پہلے سید محمد ناظم صاحب نے جو اس میوزیم میں مسکوکات و مخطوطات کے انچارج ہیں ان سے ملاقات کرائی، محمد علی ہم لوگوں کو اپنے خاص شعبے میں لے گئے اور ہزاروں سال پہلے کے ایک مفقود النسل جانور کے عظیم الشان اور ہیبت ناک ڈھانچے کے سامنے میں کھڑے ہو کر انہوں نے مرحوم کے اوصاف و خصائل اور شجرۂ نسب تک اس روانی سے سنا دیا جیسے ان کا مرحوم سے برسوں کا دوستانہ ہو، محمد علی صاحب نے اپنے مضمون میں بہت ترقی کی ہے اور ان کا محکمہ ان کی کارکردگی سے بہت خوش ہے۔

—— خالد محمود تھے۔ باٹنی میں ایم ایس سی کر رہے تھے، میرے ایس ایس ویسٹ کے ساتھیوں میں تنہا وہی ہیں جو میری طرح علی گڑھ میں مقیم ہیں، آج کل باٹنی ڈپارٹمنٹ میں ریڈر ہیں، پہلے بھی کم آمیز تھے اور غالباً اب بھی کم آمیز ہیں، ہم دونوں چار پانچ سال ایک ہال بلکہ ایک ہوسٹل میں ساتھ رہے اس پورے عرصے میں مشکل سے چار پانچ جملے ہم لوگ ایک دوسرے سے بولے ہوں گے۔

—— محمد علی ایک اور بھی تھے۔ یہ آسام کے رہنے والے تھے، قانون پڑھ رہے تھے، بہت نرم و نازک آدمی تھے، بہت آہستہ آواز میں گفتگو کرتے تھے اور میرے کمرے، ۵ ایس ایس ویسٹ کے قریب ہی رہتے تھے۔ ان کی ایک دلچسپ عادت اب بھی نہیں بھولا ہوں وہ میرے کمرے میں داخل ہو کر پہلا نیک کام یہ کرتے تھے کہ الماری سے تیل کی بوتل نکال کر سر میں تیل مالش کرنے اور ساتھ ہی ساتھ باتیں بھی کرتے جاتے تھے، کچھ وقفے کے بعد بالوں کو مزید کمک پہونچانے اور مزید روغن سر پر ڈال لیتے، لیکن بوتل کی کارک کبھی نہ لگاتے، اس طرح جب کبھی میں واپس آتا اور الماری میں بوتل الگ اور کارک علیحدہ رکھا ہوا ملتا تو سمجھ لیتا کہ محمد علی صاحب نے کمرے کا سر بلا اثر

وزٹ کیا ہے، عرصہ کے بعد کئی سال ہوئے علی گڑھ میں اچانک ملاقات ہوگئی، دہلی جارہے تھے۔ آج کل آسام میں جج ہیں، یہ ایسے نیک نفس اور رحم دل ہیں کہ کسی کو پھانسی کیا معنی طویل میعاد کی سزا بھی شاید ہی کسی کو دی ہوگی، معمولی چوروں کو تو یہ کہکر معاف کر دیتے ہوں گے کہ دیکھیے آئندہ ایسی حرکت نہ کیجیے گا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

سرسید ہال کے قیام نے مجھے بہت کچھ بخشا۔ ہندوستان اور بیرونِ ہند کے لوگوں سے ملنے ملانے کے مواقع ملے، علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبا کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے، طرح طرح کے لوگوں سے ملنے اور انھیں برتنے کا اتفاق ہوا، بہت تجربے ہوئے۔ بہت کچھ سیکھا، کھویا کم پایا بہت زیادہ، سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ایک پرسکون گوشۂ عافیت (۵/۷ ایس ایس ویسٹ) ملا۔ جہاں میں نے اس زمانے میں بہت سے علمی کام کیے اور بہت سے منصوبے بنائے، علی گڑھ میگزین کا ایک شمارہ مرتب کیا، جسے بہت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا، غالب نمبر شائع کیا، جس کی ہندوستان اور پاکستان میں بہت شہرت ہوئی، ان مقالات کو ذاکر صاحب اور علیم صاحب کی فرمائش سے دوبارہ مرتب کیا اور کچھ نئے مضامین لکھ کر اور لکھوا کر دو مجموعے تیار کیے، جنہیں احوالِ غالب اور نقدِ غالب کے نام سے قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم نے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا، اکبر کے خطوط کی ترتیب و اشاعت بھی اسی زمانۂ طالب علمی کی یادگار ہے۔ سرسید ہال سے پہلی مرتبہ شفیع صاحب کی توجہ سے سرسید ہال میگزین کی اشاعت کی داغ بیل پڑی، اس کی ترتیب و اشاعت میں اپنے دوست اور ہم سبق مسعود صدیقی صاحب کی جو اس رسالے کے اڈیٹر تھے پوری مدد کی اس میں بعض بہت اچھے مضامین شائع ہوئے، دوسرے سال رام پور کے ایک نوجوان شکیب صاحب جو شعبۂ اردو میں ایم اے کے طالب علم تھے اس رسالے کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ انھوں نے بھی اپنا شمارہ بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا تھا اس کے بعد معلوم نہیں اس کے کچھ دنوں بعد میں یورپ

چلا گیا اور معلوم نہیں اس کے کتنے شمارے پھر شائع ہوئے۔

ــــــ ایم اے کے لئے ایک تحقیقی مقالہ صلاح الدین ایوبی کے ایک معاصر اسامۃ بن منقذ الشیزری پر لکھا۔ پی ایچ ڈی کے لئے ڈاکٹریٹ کا کام بھی یہیں شروع کرکے دو سال میں مکمل کیا ان کے علاوہ اور بہت سی تحریریں اس زمانے کی یادگار ہیں۔

"مجھے اپنے عہد کا علی گڑھ اس لئے خاص طور پر عزیز رہا ہے کہ اس زمانے میں کالج کی ناموری تمام تر طلبہ کی کارگذاریوں کی رہینِ منت رہتی۔ اچھے سے اچھے طالب علم ہونے کے علاوہ بڑے اچھے مقرر بڑے اچھے کھلاڑی، بڑے اچھے انشاپرداز اور شاعر ہوتے۔ جرأت، ذوق اور ذہانت کے مواقع تلاش کرتے کوئی مشہور مقرر یا لیڈر اس زمانے میں باہر سے آنے والا ہوتا تو ہم اس پر خوش ہوتے کہ آج ہمارے فلاں بولنے والے کا جوہر چمکے گا اور مہمانوں کو معلوم ہوگا کہ اس کا سابقہ کیسے طالب علموں سے ہے اس پر فخر نہیں کرتے تھے کہ معزز مہمان کے تشریف لانے اور گہر افشانی فرمانے سے کلاہ گوشہ دہقاں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔"

(رشید احمد صدیقی)

قاضی ارشد مسعود گنگوہی

یادوں کی دھوپ چھاؤں

۲۰ر اگست ۱۹۴۹ء کی گرم اور مچھروں بھری رات میں ہم اپنے عزیز سلیمان مشہود صاحب کے ساتھ انٹرکامرس میں داخلہ لینے کے لئے علی گڑھ پہونچے، ٹرین رکتے ہی ایک عجیب منظر دکھائی پڑا، پلیٹ فارم پر شیروانیوں میں ملبوس سیکڑوں طلباء اپنے آنے والے ساتھیوں سے بغل گیر ہو رہے تھے اور ہر طرف "سامالیکم"، "سامالیکم" کا غلغلہ بلند تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "سلام علیکم" کے لفظ سے لوگ نا آشنا ہیں اور "وعلیکم السلام" تو کوئی لفظ ہی نہیں، اسٹیشن کے باہر نکلے تو رکشوں کی قطار کے ساتھ ساتھ اِکّوں کی قطار بھی نظر پڑی، یہ سواری ہمارے لئے نئی تھی اور اس وقت ہم تجربہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اس لئے رکشا پر ہی سوار ہونے میں عافیت جانی، چلتے ہوئے راستے میں طلباء کی بہت سی ٹولیاں خوش گپیاں کرتی ہوئی ملیں جو منظر اس وقت دیکھا تھا اب تو اس کے لئے آنکھیں ترستی ہیں کیوں کہ آج کل تو اسٹیشن پر اور سڑکوں پر خوش پوش اور خوش گفتار طلباء کم اور بال بڑھائے پیوند لگی پتلونیں پہنے بدکلامی کرتے لوگ زیادہ نظر آتے ہیں۔

رات ہم نے سلیمان صاحب کے کمرہ پر کوٹھی الحمرا میں گذاری صبح کو ان کے ہمراہ یونیورسٹی دیکھنے کے لئے نکلے۔ جب شعبۂ جغرافیہ کے قریب پہونچے تو دور سے ایک چینی کی گڑیا کی طرح گورے چٹے اور گول مٹول صاحب کو شیروانی میں ملبوس سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا۔ وہ بڑے زور سے سلام علیکم کہکر سلیمان صاحب سے بغلگیر ہوئے۔ سلیمان صاحب نے ہماری طرف اشارہ کرکے کہا "یہ میرے عزیز ہیں" وہ صاحب یہ کہتے ہوئے ہم سے بھی بغلگیر ہوئے "یہ آپ کے عزیز ہیں تو میرے بھی عزیز ہیں!" سلیمان صاحب نے تعارف مکمل کرایا "یہ ہیں سعید احمد صاحب میرے ساتھ جامعہ ملیہ میں تھے"۔ یہ ہماری پہلی ملاقات احمد سعید صاحب سے تھی جو کانپور کے رہنے والے تھے اور یونیورسٹی کے مشہور طالب علم لیڈر تھے۔

سرسید ہال میں گھوم پھر کر ہم الحمرا واپس آئے اور وہاں سے اپنے ایک ہم وطن نور محمد صاحب کے پاس اس کمرہ میں منتقل ہو گئے جو آج کل بے کشن ہاسٹل، سلیمان ہال کا کمرہ نمبر ۲ ہے۔ اس زمانہ میں طلبار کو ملیریا، مچھر اور گرمی سے محفوظ رکھنے کے لئے تعلیمی سال یکم ستمبر سے شروع ہوا کرتا تھا اس لئے داخلہ سے پہلے وہاں رکنا ضروری تھا۔

اس زمانہ میں طلبار کے لئے چار ہال تھے۔ سرسید ہال، آفتاب ہال، سر شاہ سلیمان انجینیرنگ ہال، وقار الملک ہال، کامرس کا شعبہ ایس ایس ہال کے جنوب مغربی کونے پر واقع ہونے کی وجہ سے ہم نے اسی ہال میں داخلہ لینے کا ارادہ کر لیا تھا، حالاں کہ ہمارے دو عزیز نفیس مسعود اور ارشد مسعود اور نور محمد صاحب کے چھوٹے بھائی گلزار احمد سائنس کے طالب علم ہونے کی وجہ سے ڈی، ای ایم۔ ہال میں داخلہ لینے کے خیال سے علی گڑھ میں موجود تھے مگر ہمیں ان کے ساتھ "جمگھٹ" بنانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

یکم ستمبر کو داخلہ کرانے کے لئے نکلے۔ آسمان منزل میں داخلہ فارم مل رہے تھے، فارم حاصل کرکے پُر کیا اور اسٹریچی ہال پہونچ گئے جہاں پرا کٹر، پرووسٹ، برسر اور دیگر افراد متعلقہ موجود تھے، ایک دروازہ سے اسٹریچی ہال میں درخواست دے کر داخل ہوئے اور دوسرے دروازہ

سے داخلہ کا پروانہ حاصل کر کے نکلے۔

نور محمد صاحب نے ہمارے لئے ایس ایم ایسٹ ہاسٹل پسند کیا، اس کے وارڈن قمر الحسن فاروقی صاحب تھے (جو آج کل کامرس فیکلٹی میں پروفیسر اور ڈین ہیں) فاروقی صاحب نے جس مشفقانہ انداز میں ہم سے گفتگو کی اس نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ انہوں نے ہمیں ہدایت کی کہ "انٹروڈکشن کے لئے اگر کوئی شخص ہمیں اپنے کمرے میں بلائے تو ہم نہ جائیں اور "سر سید کی فاتحہ" کے لئے اگر کوئی شخص پیسے مانگے تو ہرگز نہ دیں۔

سینیئر ہاؤس مانیٹر نیاز قوی صاحب نے نور محمد صاحب کے کہنے پر ہمیں کمرہ نمبر ۱۴۲ دیدیا اس کمرہ میں نور محمد صاحب کے ایک دوست اکبر علی صاحب متعلم ایم، اے، ایل، ایل بی رہتے تھے، نور محمد صاحب نے ہمارا ان سے تعارف کرادیا اور اس طرح ہم کو بغیر کسی قسم کے پاپڑ بیلے کمرہ مل گیا، بازار سے چار پائی، میز کرسی، کھانے کی پلیٹیں اور چائے کے برتن خرید کر لائے اور ان چیزوں پر اپنا پیسہ خرچ کرنے کی وجہ سے ان سے زبردست قلبی تعلق محسوس کیا۔

ایس ایس ہال کا انداز تعمیر ہمیں بہت پسند آیا، ہر کمرہ بیک روم اور فرنٹ روم پر مشتمل ہے۔ بیک روم میں سینیئر طالب علم رہتا ہے جس کا کام اپنے فرنٹ روم میں رہنے والے جونیئر طلبا کو علی گڑھ کی روایات سے واقف کرانا۔ یہاں کے سانچے میں ڈھالنا، ان کی تربیت کرنا اور ان کے مسائل میں امداد بہم پہونچانا ہے، فرنٹ روم میں وہ طلبا رہتے ہیں جو تھوڑی ہی مدت سے یونیورسٹی میں موجود ہوں یا نئے آئے ہوں، ان جونیئر طلبا پر اپنے سینیئر ساتھی کا ادب، اور لحاظ فرض ہے اور وہ اس سے اسی قسم کی شفقت اور امداد کی امید رکھتے ہیں جیسے اپنے مربی اور بڑے بھائی سے، اس طرح خود بخود ایسا معاشرہ عالم وجود میں آجاتا ہے جس میں سینیئر کی عزت اور جونیئر کے حقوق خود بخود محفوظ ہو جائیں، ہر ایک روم میں ایک غسل خانہ تھا (جو غالباً ۱۹۷۱ء کے بعد سب توڑ دیئے گئے) جو سارے کمرے والے استعمال کرتے تھے۔

فرنٹ روم میں الماریاں ہیں جن کو سینیئر اور جونیئر پارٹنر استعمال کرتے ہیں اس طرح سب پارٹنروں

کو آرام اور پریشانی میں حصہ بٹانا لازمی ہے ان باتوں سے "اجتماعیت" کا تصور پروان چڑھتا ہے جو صحیح معنی میں یونیورسٹی کے اقامتی کردار کی روح ہے۔

ہمارا بیرا عنایت خاں جب پہلی بار ہمارا دوپہر کا کھانا لے کر آیا تو پلیٹ میں "بحرِ ظلمات" کو موجیں مارتے دیکھ کر ہمارا دل ڈوبنے لگا۔ ہم نے انداز بیکسی میں اکبر صاحب سے پوچھا "جناب یہ کیا ہے!" وہ بولے "میاں یہ سرسید کا دور روٹی دو بوٹی والا نسخہ ہے تاکہ آپ کی روح آپ کے جسم سے اٹکی رہے! کھایئے کھایئے! رفتہ رفتہ عادت پڑ جائے گی۔"

اکبر صاحب بہت ہی مخلص اور شریف انسان تھے۔ انہوں نے ہمیں علی گڑھ کی بہت سی روایات سے روشناس کرایا۔۔۔ کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دستک ضرور دیجئے۔ سلام کرنے میں پہل کیجئے۔ شیروانی کے پورے بٹن بند رکھیے۔ موزہ پہنیے۔ برآمدہ میں نہ تو سیٹی بجایئے، نہ زور زور سے بولیے۔ نہ بنیان پہن کر نکلیے نہ سائیکل چلایئے وغیرہ وغیرہ ۔۔۔

جو بات انہوں نے زور دے کر کہی وہ یہ تھی کہ بحیثیت جونیر ہماری یہ ذمہ داری ہوگی کہ ہم ان کا اور اپنا کھانا گرم کریں اور چائے بنائیں ہم نے بلا چون و چرا "داروغۂ مطبخ" کا یہ "اعزازی عہدہ" قبول کیا اور اپنی ذمہ داری نبھانے لگے۔ ایک روز شکر ختم ہو گئی۔ ہم شمشاد مارکیٹ سے ایک پاؤ شکر خرید لائے۔ اکبر صاحب نے چائے کے وقت کہا "ارے شکر تو صبح ختم ہو گئی تھی۔ مجھے لانا یاد ہی نہیں رہا ہے اب کیا ہوگا؟" ہم اپنی کارگزاری دکھانے کو بول اٹھے "فکر نہ کیجئے میں خرید لایا تھا" اتنا سنتے ہی ان کا انداز بدل گیا۔ بولے "یہ اختیار آپ کو کب سے حاصل ہو گیا؟ آپ کا کام صرف چائے بنانا ہے چائے کا سامان لانا نہیں!" ہم نے اس نئی روایت سے واقف ہونے پر ان سے معافی مانگی اور سوچنے لگے کہ واقعی جہاں سینیروں کا یہ طریقہ ہو وہاں جونیروں کی ہمت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ ان سے سرتابی کریں۔

پتہ نہیں کہ کن تجربات یا اطلاعات کی بنا پر وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ سینیر طلبا جونیر طلبا سے تعارف حاصل کرنے کے لئے جو "انٹروڈکشن نائٹ" مناتے

ہیں اس میں سخت مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے "شب تعارف" کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا جس پر سختی سے عمل درآمد ہو رہا تھا۔ مگر ذاکر صاحب کو یہ احساس بھی تھا کہ نئے طلبا کی جھجک دور کرنے کے لئے اور انہیں علی گڑھ کے رنگ میں رنگنے کے لئے "انٹروڈکشن" بہت ہی مؤثر ذریعہ ہے۔ اس لئے انہوں نے اسٹریچی ہال میں "انٹروڈکشن ڈے" منانے کی اجازت دے دی تھی۔

چاروں ہاسٹل یعنی ایس ایم ایسٹ، ہوسپ ایس ایسٹ، ایس ایس ویسٹ اور عثمانیہ کے طلبا کو اسٹریچی ہال کے چاروں کونوں میں جگہ دی گئی تھی، درمیان میں ایک تخت ڈالا گیا تھا۔ اس کے مشرقی جانب ذاکر صاحب، شفیع صاحب (پرووسٹ ایس ایس ہال) اور دیگر حضرات تشریف فرما تھے۔ اور مغربی جانب شاہ حسن عطا صاحب، نائب صدر یونین اور دیگر سینیئر طلبا بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے چائے وغیرہ سے تواضع ہوئی پھر نئے طلبا کا شاہ حسن عطا صاحب نے خیر مقدم کیا اس کے بعد نئے طلبا کو ایک ایک کرکے اپنا تعارف خود کرانے کے لئے تخت پر آنے کی دعوت دی گئی، ہر نیا طالب علم وہاں آکر کھڑا ہوتا، سلام کرتا اور اپنا تعارف کراتا، پرانے طلبا اس سے سوالات کرتے۔ ایک سینیئر طالب علم جناب اظہر صاحب عرف استاد چھوہارہ اس سلسلے میں خاصے پیش پیش تھے۔

ایک صاحب کے تخت پر کھڑے ہوتے ہی استاد چھوہارہ نے پوچھا "اماں کون سے جنگل سے آئے ہو؟" وہ بے چارا خاموش رہے کیا جواب دیتا، استاد نے پوچھا "کیا جنگل میں رہتے رہتے آپ کو گھاس پھوس کھانے کی عادت ہوگئی ہے؟" وہ منمنایا "جی نہیں تو!" استاد بولے "تو پھر اپنی جیب میں یہ کیلے کے چھلکے لئے کیوں گھومتے ہو؟" وہ گھبرا کر بولا "نہیں صاحب! میں تو چھلکے لئے نہیں گھومتا ہوں" اس پر استاد دوڑ کر آئے اور اس لڑکے کی جیب سے کئی چھلکے کیلے کے نکال کر دکھائے۔ مجمع نے زوردار قہقہہ مارا۔ لڑکا غریب سخت شرمندہ ہوا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ استاد نے چاپکدستی سے کیلے کے چھلکے اس کی جیب میں بڑی صفائی سے

رکھ دیئے گئے۔

بہت سے لڑکوں سے گا کر یا ناچ کر شعر پڑھنے کو کہا گیا، اور جب انہوں نے کوئی شعر سنایا تو کتے، بلّی کی آواز میں یا ہو بہو اسی میں کچھ نے سُر ملایا۔ اپنے ساتھیوں کی یہ درگت دیکھ کر ہمارا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ آخرکار ہمارا نام بھی پکارا گیا۔ ہم بھی لرزتے قدموں سے جا کر اسٹیج پر کھڑے ہو گئے، اور ابھی "سلام علیکم" کہا تھا کہ ایک طرف سے آواز آئی "ڈاکٹر اقبال کا کوئی شعر سنائیے" ہمیں اقبال کے بہت سے اشعار یاد تھے مگر اس وقت وہ سارے اشعار ہمارے دماغ سے اس طرح نکل گئے جیسے آج کل حسب پسند پرچہ نہ دیکھ کر طلبا امتحان سے واک آؤٹ کر جاتے ہیں، خدا کا کرنا کہ ایک شعر کہیں سے گھومتا ہوا دماغ میں آ گیا اور ہم نے لرزتی آواز میں پڑھا۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

جب کسی طرف سے کوئی آواز کتے، بلّی کی نہیں آئی تو ہمیں بڑا تعجب ہوا اور ساتھ ہی اقبال سے طلبا کی محبت اور عقیدت کا بھی اندازہ ہوا۔ کسی صاحب نے کہا "جائیے معاف کیا" ہم فوراً تخت سے اتر آئے۔ جب ذاکر صاحب کے قریب سے گزرے تو انہوں نے روک کر پیٹھ ٹھوکی۔

اس نوعیت کا تعارفی جلسہ ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ اس کے بعد نہیں ہوا۔ ذاکر صاحب نے "انٹروڈکشن" پر جو ضرب لگادی تھی اس نے اس روایت کو خاصا کمزور کر دیا۔ باوجود اپنی خرابیوں کے یہ روایت ایک لحاظ سے قابلِ قدر تھی اس کے ذریعہ نئے "ان گھڑ" طلبا پر ایسا "رندہ" پھر جاتا تھا کہ وہ بھی "چکنے" ہو جاتے تھے اور سینیئر طلبا کے زیرِ اثر آ جاتے تھے۔ جب سے یہ روایت کمزور پڑی جونیئر طلبا ہر طرح سینیئر طلبا کے اثرات سے دور ہوتے چلے گئے اور ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے لگا جس سے یونیورسٹی میں "اجتماعیت" کا تصور مجروح ہوتا جا رہا ہے۔

ہمیں جلد ہی ایک نئی روایت سے متعارف ہونا پڑا۔ اکبر صاحب کو دہلی کے لئے ہم اسٹیشن چھوڑنے گئے، وہاں انہوں نے چائے پلائی اور کیک کھلایا اور بولے "ارشد میاں! یہ بھی ہماری روایت ہے کہ جانے والا اپنے الوداع کہنے والے ساتھیوں کو چائے پلائے" ٹی اسٹال سے چل کر وہ ٹرین میں بیٹھ گئے اور ایک روپیہ نکال کر ہمیں دیا۔ ہم نے یہ سمجھا کہ یہ روپیہ کسی بیرے وغیرہ کو دینے کے واسطے ہے، ہم نے پوچھا "یہ روپیہ کس کو دے دوں؟" اکبر صاحب بولے "میاں یہ تو تمہارے لئے ہے۔ یہاں کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ جانے والا اپنے الوداع کہنے والے ساتھیوں کو رکشا کا کرایہ بھی دے"۔ ہم نے عقلمندی دکھائی "رہنے دیجئے۔ میرے پاس رکشا کے کرائے کے پیسے موجود ہیں"۔ اس پر اکبر صاحب بگڑے "رہے ناجونیر کے جونیر ہی" یہ سنتے ہی ہم بات سمجھ گئے اور فوراً روپیہ جیب میں رکھ کر بولے۔ "شکریہ۔ سلام علیکم"۔ افسوس کہ اب معاشی حالات نے ان روایات کو ناقابلِ عمل بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس زمانہ میں سائرن کمرہ ۱۳۰ کے اوپر لگا ہوا تھا اور اس کا سوئچ اسی کمرے کے برابر کونے میں تھا۔ ایک دن صبح کا سائرن بجا اور بند ہو گیا اور پھر بجا اور بند ہو گیا اور پھر بجا اور بند ہو گیا ہم سمجھے سائرن بجانے والا مذاق کر رہا ہے۔ مگر اکبر صاحب نے بتایا کہ تین بار سائرن بجنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی طالب علم کا انتقال ہو گیا ہے اور یونیورسٹی بند رہے گی۔ تھوڑی دیر بعد پتہ چلا کہ میکڈانل ہاسٹل میں ڈپٹی عسکری صاحب کے صاحبزادے چلتے ہوئے ہیٹر کو اٹھا کر ٹھیک کرنے لگے تھے اور اسی کوشش میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بہت ہی افسوس ہوا۔ ہم نے عہد کیا کہ ہیٹر کو بغیر کرسی پر بیٹھے ٹھیک نہیں کریں گے اور تاروں کو کھلا نہیں چھوڑیں گے۔ اس دن سے ہمیں کھلے تاروں سے ایسی ہی وحشت ہوتی ہے جیسی کتے کے کاٹے کو پانی سے۔ اب یونیورسٹی نے سائرن کو طلبا کی دسترس سے دور رکھنے کے خیال سے اسے مولانا آزاد لائبریری پر لگوا دیا ہے۔

۱۹۴۹ء میں تقسیم وطن نے پاکستان کے علاقوں سے نئے طلبا کی آمد کم کر دی تھی اور یونیورسٹی میں طلبا کی کل تعداد تین ہزار کے قریب رہ گئی تھی، اس وجہ سے ہاسٹلوں میں جگہ کی کوئی کمی نہ

نلت نہیں تھی ایس ایس ہال میں ہر بیک روم میں ایک سنیئر اور فرنٹ روم میں دو یا تین جونیئر طلبا کو جگہ دی جاتی تھی۔ اکبر صاحب کے دو پرانے ساتھی جو بی کام میں تھے ۱۴۲ میں رہنے کے ارادے سے تشریف لے آئے، نتیجۃً ہمیں "کمرہ بدر" ہونا پڑا۔ ۱۴۲ کو چھوڑتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ باہر کوئی بلا بیٹھی ہے جو کمرے سے نکلتے ہی ہمیں دبوچ لے گی۔ شاید ہر جونیئر کو یہ احساس ہر اس کمرہ کو چھوڑتے ہوئے ہوتا ہے جس میں وہ شروع میں آکر ٹھیرتا ہے۔

ہمیں ۱۳۴ الاٹ ہوا۔ ہم کے بیک روم میں احد خاں تھے۔ فرنٹ روم میں نجات اللہ صدیقی صاحب تھے (جو آج کل شعبۂ معاشیات میں ہیں) ہم جو کمرہ دیکھنے پہونچے تو نجات صاحب نے کہا "یہاں مت آنا یہاں احد خاں رہتے ہیں" ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ہم یہ سمجھے کہ احد خاں یا تو بھوت ہیں یا آدم خور اور فوراً بھاگتے ہوئے اکبر صاحب کو ماجرا سنانے پہونچے انہوں نے ڈھارس بندھائی اور ہمیں ۱۳۵ الاٹ کرادیا۔ اس کے بیک روم میں محی الدین بلبلیا صاحب اور فرنٹ روم میں ابراہیم بدت صاحب اور پٹیل صاحب تھے، کمرہ کی تینوں الماریاں ان تینوں حضرات کے قبضے میں تھیں اور ہمیں اپنا سامان صندوق میں یا میز پر رکھنا پڑتا تھا جو خاصی پریشانی کی صورت تھی۔

ہم ضلع سہارنپور سے آئے تھے جہاں شاید دنیا میں سب سے زیادہ "تشدید" کا استعمال ہوتا ہے مثلاً "جوتا" بروزن "کتّا" بولا جاتا ہے اور ایک خاص لہجہ اور انداز تکلم اختیار کیا جاتا ہے مثلاً "جناب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں" کی بجائے جھٹکے دار انداز میں کہا جاتا ہے "ا جی میں یوں کہوں" خدا کا فضل ہمارے حال پر یہ تھا کہ ہماری زبان ماشاء اللہ ہے لہٰذا ہم نے لڑنے سے زیادہ سننے کی طرف توجہ دینی شروع کر دی تھی مگر جب بولنے کی ضرورت پڑتی تھی تو بہت ہی سنبھل سنبھل کر بولتے تھے اور تشدید سے اپنے ہی بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے مہاتما گاندھی تشدد سے۔ مگر یہ دھیان بھی ہمیں رکھنا پڑتا تھا کہ ہمیں جوش میں "کتّا" کو "کتا" بروزن "جوتا" اس طرح نہ کہہ بیٹھیں جیسے ہمارے ہم وطن گلزار صاحب

کر چکے تھے اور ہیران کو یہ شعر سننا پڑا تھا۔

منہ جو کھولا تو مکھیاں بھنکیں
کتنی شیریں زبان ہے پیارے

علی گڑھ کی لغت ہمارے لیے بالکل ہی نئی تھی "بور" سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ تھا جو ایسی ہر چیز پر چسپاں کیا جاتا تھا جس سے کسی قسم کی گرانی کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ پڑھیے تو بور نہ پڑھیے تو بور۔ آسیئے تو بور نہ آیئے تو بور۔ چائے گرم ہے تو بور ٹھنڈی ہے تو بور! بور کے بھی درجات تھے یعنی پتھر بور، بکڑ بور، بلنڈر بور وغیرہ۔ انگریزی لفظ بور کی فارسی زبان سے سول میرج نے لفظ "بوریت" کو جنم دیا تھا۔ ہم نے اپنے ایک ہم وطن کو خط لکھا اور اس میں یہی لفظ "بوریت" استعمال کر ڈالا۔ انہوں نے لکھا "بھائی یہ بوریت کیا چیز ہے میں نے فیروز اللغات، کریم اللغات چھان ماری پر اس کا پتہ نہیں چلا!" "ورک" "ورکر" اور "ورکس" مارنا اصطلاحات تھیں جن کے معنی علم صدری سے تعلق رکھتے ہیں اور سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہیں، ان کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو غالب کے اس شعر کی تفسیر بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

جن الفاظ میں طلبا اپنے بیروں، بہتروں، بھشتیوں اور دوسرے کام کرنے والوں سے بات کرتے تھے اور جس طرح ان لوگوں کو "آپ" کہہ کر مخاطب کرتے تھے اس سے وقار انسانی کا تصور اجاگر ہوتا تھا مگر جب ہم نے "لفظ" "آپ" کو وطن واپس جاکر اپنے کھیت کے اور کام کرنے والوں سے بات کرنے میں استعمال کیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہمارا کام ہنسی میں کر کے دیتے تھے جب کہ ہمارے چھوٹے بھائی صاحب کا سارا کام وہ لوگ کرتے تھے۔ ہم نے جلد ہی دکھلائی سمجھ کا راز معلوم کر لیا، وہ یہ تھا کہ ہمارے بھائی صاحب خاص سے ہمارے چودھری کے سے تنزلا انداز میں گفتگو فرماتے

کئے، جیسے ہی ہم نے علی گڑھ کا چوغا اتار کر سہارنپور کا لبادہ اوڑھا اور "شریفانگی" کا مظاہرہ فرمایا تو وہ ملازم ہمارا کام بھی دوڑ دوڑ کر کرنے لگے۔

ہم فرسٹ ایر فول تو کہلے ہی سب سے بڑی بے وقوفی کا مظاہرہ کر بیٹھے یعنی ستمبر ہی میں پڑھائی شروع کر ڈالی، یہ حرکت ہم سے مارے خوف کے سرزد ہو گئی تھی کیوں کہ ہائی اسکول تک آرٹس کا طالب علم رہنے کی وجہ سے انٹر کا مرس میں سوائے انگریزی کے ہر مضمون ہمارے لئے نیا اور باعث وحشت تھا، ہماری یہ غیر روایتی حرکت دیکھ کر لوگ بڑے ہمدردانہ انداز میں کہتے "ارے میاں کیا فرسٹ ایر میں کسی نے آج تک پڑھا ہے جو آپ اس کام میں مشغول ہیں، یہ تو کھیلنے کھانے کے دن ہیں ان کو مغز پچی کرنے میں کیوں ضائع کر رہے ہیں!" اور واقعی ہمارے چاروں طرف ماحول کچھ اور ہی قسم کا تھا، ہر شخص خوش گپیوں میں مصروف اور قہقہے لگاتا نظر آتا تھا، اس دور کے طلبا، عمر، جسم، حوصلہ، ہمت، مال اور دل کے لحاظ سے آج کے طلبا سے خاصے مختلف تھے اس لئے ان کے قہقہے انتہائی بھرپور ہوتے اور دل کی گہرائیوں سے نکلتے تھے اور اس وقت کے اور آج کے قہقہوں میں وہی فرق ہے جو امریکی ایٹم بم اور ہندوستانی آتشبازی میں۔ بسا اوقات ہمارے لئے کمرہ کا دروازہ بند کر کے بیک روم میں بیٹھ کر پڑھنا بھی اسی وجہ سے مشکل ہو جاتا تھا کہ عثمانیہ ہاسٹل کے کسی کمرہ میں لوگ قہقہے بلند کرنے لگتے تھے، ان خوش گپیوں اور تفریحات کی وجہ سے ہاسٹلوں میں شام رات کے دس بجے اور پڑھائی کا وقت رات میں بارہ بجے کے قریب شروع ہوتا تھا اور تین چار بجے رات تک جاری رہتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ صبح بھی نو دس بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی مگر اس "سحر خوابی" کے آداب میں یہ بات شامل تھی کہ پلنگ سورج نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کمرے میں چلا جائے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مچھر دانیوں کا جو جنگل یونیورسٹی شروع ہونے کے بعد بھی آج کل صبح میں برآمدوں اور سڑک پر نظر آتا ہے وہ اس وقت دکھائی نہیں دیا کرتا تھا، ہم نے بھی علی گڑھ آتے ہی "سحر خیزی" کو چھوڑ کر "سحر خوابی" کے رواج کو اپنا لیا اس کے نقصانات کا اندازہ اب ہو رہا ہے۔ اس وقت تو اگر کوئی کہتا تھا کہ "صبح اٹھنے سے صحت

اور عقل بڑھتی ہے تو ہم یہی کہتے تھے "ارے صاحب چھوڑیئے بھی! صبح اٹھنا تو صرف دماغ کی خشکی کی دلیل ہوتا ہے۔ اگر دماغ میں خشکی نہ ہو تو نیند آنا لازمی ہے"!

اس زمانہ میں ایک خاص بات جو آج کل نہیں ہوتی یہ تھی کہ یونیورسٹی نے طلبا کی داڑھیاں ناخن وغیرہ بنانے کے لئے نائیوں کی "مفت خدمت" کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ہمارے ہاسٹل میں جو "خلیفہ جی" تھے وہ جناب "برق رفتار" واقع ہوئے تھے۔ ایسی تیزی کے ساتھ تھوڑی پر صابن لگاتے کہ جیسے کوئی مصور تصویرکشی کے لئے زمین تیار کرنے کے واسطے جلدی جلدی رنگ کی تہ کنویس پر بچھا رہا ہو۔ اس کے بعد اتنی ہی تیزی کے ساتھ ایک زنگ آلود سا استرہ نکال کر داڑھی کی اس بے رحمانہ انداز پر صفائی شروع کرتے کہ جیسے یہ داڑھی کسی آدمی کی نہیں بلکہ مجسمہ کے منہ پر اُگی ہوئی ہو۔ "صاحب ریش" کی آہ و فغاں ان پر بے اثر ہوتی تھی۔ بسا اوقات طلبا کی صبح کو دیر سے اٹھنے کی عادت اور شیو کرانے کی ضرورت اور خلیفہ جی کی عجلت بازی اور صاحب ضرورت کی حاجت روائی کا جذبہ مل کر ایک حسین صورت اختیار کر لیتے تھے۔ جیسے ہی خلیفہ جی اپنی آمد کا مژدۂ جانفزا سوتے ہوئے طالب علم کے کان میں پھونکتے وہ لیٹے ہی لیٹے چادر منہ سے ہٹا کر ایسی شکل اختیار کر لیتا جیسے گیدڑ اپنے بھٹ سے باہر محو استراحت ہو اور اسی عالم غنودگی میں "سپردم بتو مایۂ خویش را" کی تصویر بن جاتا اور خلیفہ جی بلا تکلف اسی حالت میں اس کی داڑھی صاف کر دیتے اور وہ طالب علم پھر اپنی چادر تان کر سو جاتا۔ چوں کہ ہمارے منہ پر داڑھی کے آثار ہی نہیں تھے لہٰذا خلیفہ جی سے ہم نے "مرغِ سحر" یا الارم والی گھڑی کا کام لینا شروع کر دیا یعنی وہ ہمیں صبح کو جگا دیا کریں۔

ہم سائرن سے پہلے اٹھنے کا اہتمام اس وجہ سے کرتے تھے کہ ناشتہ سے فارغ ہو کر وقت پر کلاس پہونچ سکیں۔ اس زمانہ میں ہال کی طرف سے ساڑھے بائیس روپیہ ماہانہ پر طلبا کو کھانا فراہم کیا جاتا تھا۔ ایس ایس ہال میں یہ بات روایتی طور پر پست درجہ سمجھی جاتی تھی کہ ناشتہ ہال کی طرف سے فراہم کیا جائے جیسا کہ آفتاب ہال وغیرہ میں ہوتا تھا۔ طلبا بیروں سے ناشتہ

خرید تے تھے۔ جو قریب پندرہ روپیہ ماہانہ میں چائے ایک گولی مکھن اور چار توس دیا کرتے تھے، ہمیں بیروں کی تیار کردہ "دھواں دھار چائے" سے کوئی مناسبت نہ تھی اس وجہ سے ہم "دست خود دہان خود" کے اصول پر عمل پیرا تھے اور ہیٹر پر چائے اور توس خود ہی بنالیا کرتے تھے۔

کھانا شروع شروع میں کمروں پر دیا جاتا تھا۔ مگر جلد ہی ڈائننگ ہال شروع ہوگیا اور ہم اور ہمارے ایک ہم جماعت اظہرالدین زبیری صاحب جو کمرہ ۱۳۲ میں رہتے تھے ساتھ ساتھ ڈائننگ ہال جانے لگے، پیر کے دن دوپہر بریانی اور جمعہ کو دن میں انڈا اور رات میں میٹھا ملنے کی وجہ سے ان دو دنوں کا چھ دن تک انتظار کیا کرتے تھے۔ باقی دنوں میں تو یہ شعر پڑھ پڑھ کر سینیر فوڈ کی جان کو دعائیں دیا کرتے تھے۔

ہم کو دیتا ہے دال اور روٹی
آپ کھاتا ہے گوشت مرغی کا

جس جونیروں کو یہ شکایت بھی تھی کہ بیرے ان کی "ویراکٹی" مار جاتے ہیں یعنی نہ ان کو پیر کے دن بریانی دیتے ہیں اور نہ جمعہ کو انڈا اور میٹھا اور پوچھنے پر یہ کہتے ہیں کہ "یہ چیزیں تو سینیروں کے کھانے کی ہیں جب آپ سینیر ہو جائیں تب مانگیے گا" ہمیں اس قسم کے حادثہ سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔

اس زمانہ میں شاہی ٹکڑا سب سے اعلیٰ میٹھا گردانا جاتا تھا۔ بعد میں فروٹ کریم کا رواج ہوا اور حال ہی میں اسپنج پڈنگ نے سب کو مات کر دیا ہے مگر یہ میٹھے عام طور پر نہیں دیئے جاتے تھے صرف خصوصی دعوتوں میں ان کا اہتمام ہوتا تھا اس زمانہ میں ایک اور میٹھا دیکھنے کو ملا کرتا تھا جسے "کلنھی" کہتے تھے غالباً یہ چاولوں کو دودھ میں ابال کر مٹی کی طشتریوں میں جما کر تیار ہوتی تھی اس میٹھے کے ساتھ ایک تلخ حادثہ کی یاد وابستہ ہونے کی وجہ سے ہم نے ہمیشہ کے لیے اس کو فراموش کر دیا تھا۔

ہوا یوں کہ اظہر صاحب کے ساتھ ہم ایک جمعہ کی رات میں ڈائننگ ہال پہونچے، بیرے نے جب گلتھی کی طشتری ہماری طرف بڑھائی تو ہم نے اس کو کھانے کے لئے چمچہ مانگا۔ بیرا بولا "انگلی سے کھا لیجئے۔" یہ سنکر سخت کوفت ہوئی اور ہم نے یہ کہکر وہ طشتری واپس بیرے کی طرف کھسکا دی "اسے اٹھا لیجئے آپ ہی کھا لیجئے گا!" اظہر صاحب میرے سامنے بیٹھے تھے انہوں نے بھی چمچہ طلب انداز میں جو بیرے کی طرف دیکھا تو ان کے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے یہ کہتے ہوئے اظہر صاحب کو ایک چمچہ دیا "اس کو احتیاط سے رکھیئے گا!" ہماری جو شامت آئی ہم بول اٹھے۔ "اظہر صاحب آپ کو چمچے سے کھانے کی اجازت تو ہے مگر چمچے کو کھانے کی اجازت نہیں ہے" ان صاحب نے ہمیں بغور دیکھا اور بولے "آپ کھانا کھانے کے بعد ذرا کمرہ ۱۴۲ پر تشریف لائیے گا!" اتنا سن کر ہماری تو سٹی گم ہوگئی وہ صاحب چلے گئے۔ پتہ چلا ان کا نام کاظمی ہے اور کافی سینیر آدمی ہیں۔ کھانا ختم کر کے ہم "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا وظیفہ پڑھتے ان کے کمرے پر پہونچے، دستک دی۔ اجازت ملی، تو بیک روم میں پہونچے۔ کاظمی صاحب بستر پر دراز تھے ہم نے سلام کیا انہوں نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، ہم اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے کئے کرسی پر بیٹھ گئے وہ بولے "ہاں میاں اس وقت آپ نے کیا کہا تھا!" ہم نے فوراً کہا "آئی ایم ویری ساری سر" کاظمی صاحب کے چہرے کے تیکھے نقوش بدل گئے بولے "آپ کہاں سے آئے ہیں" کہا "گنگوہ ضلع سہارنپور سے" بولے "وہی گنگوہ جو تحصیل نکوڑ میں ہے" ہم نے کہا "جی ہاں" بولے "وہاں میرے والد صاحب تحصیلدار رہے تھے اور گنگوہ کے ایک صاحب قاضی محمد حنیف سے ان کے بہت تعلقات تھے کیا آپ ان صاحب کو جانتے ہیں؟" ہم نے کہا "جی ہاں۔ قاضی محمد حنیف صاحب ہمارے تایا صاحب تھے ان کا انتقال ہو چکا ہے" یہ سننا تھا کہ کاظمی صاحب تو بالکل ہی بدل گئے اور بہت ہی مشفقانہ انداز میں بولے "دیکھئے میاں اگر کسی شخص سے آپ کی واقفیت نہیں ہے تو بالواسطہ بھی اس سے مذاق نہیں کرنا چاہیئے۔ جو جملہ اس وقت آپ نے کہا تھا

وہ غیر مناسب تھا آئندہ اس کا لحاظ رکھیئے گا، کوئی تکلیف اور پریشانی ہو تو آپ بلا تکلف مجھ سے کہیئے گا۔" ہم سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ آج غور کرتے ہیں کہ یہ انداز تربیت کس قدر مختلف تھا اور اس کے اثرات تھپڑ رسید کرنے، گالیاں دینے یا کان پکڑوانے سے کس قدر زیادہ اور دیرپا اور اچھے تھے۔

۱۹۳۸ء میں ہمارے سینیر پارٹنر بلبلیا صاحب جنوبی افریقہ کے رہنے والے تھے ان کا روزانہ کا معمول کچھ یوں تھا۔ خوش گپیاں کر کے رات کو ایک دو بجے فارغ ہوتے۔ ہمیں آواز دے کر کہتے "پارٹنر مجھے صبح کو کلاس کے لئے اٹھا دینا۔" اور کتاب لے کر بستر پر لیٹ جاتے صبح کو سائرن سے پہلے بیرا ان کے لئے ناشتہ لے کر آتا جس میں انڈا، توس، مکھن اور چائے ہوتی، ہم کلاس جاتے وقت آواز دیتے "پارٹنر اٹھیئے سائرن ہو گیا ہے ناشتہ میز پر رکھا ہے۔" وہ یہ کہتے ہوئے کروٹ بدلتے "ہاں پارٹنر اٹھتا ہوں" ہم کلاس چلے جاتے، قریب دس بجے ہم اپنے خالی گھنٹے میں کمرہ میں آتے تو بلبلیا صاحب کو محو استراحت پاتے، اسی وقت مسیتا خاں کبابی کمرہ میں "کباب پوری گرم" کہتا ہوا داخل ہوتا اور آٹھ عدد سموسے بلبلیا صاحب کی میز پر رکھ دیتا۔ ہم کہتے "پارٹنر اٹھیئے دس بج گئے ہیں چائے اور سموسے رکھے ہیں" وہ عالم غنودگی میں جواب دیتے "ہاں پارٹنر اٹھتا ہوں" ہم پھر کلاس چلے جاتے، قریب بارہ بجے ہم دوسرے خالی گھنٹے میں کمرہ آتے تو بلبلیا صاحب کو بستر پر ہی دراز پاتے اس وقت عبدالرحیم خاں پھل والا کمرہ میں "کیلا، سیب، سنترہ" کہتا ہوا داخل ہوتا اور ایک درجن کیلے ان آٹھ عدد سموسوں کی برابر رکھ کر چلا جاتا۔ ہم کہتے "پارٹنر اٹھیئے، بارہ بج گئے ہیں، چائے، سموسے اور کیلے آ گئے ہیں۔" وہ پھر عالم غنودگی میں جواب دیتے "ہاں پارٹنر اٹھتا ہوں۔" ہم پھر کلاس چلے جاتے۔ ایک بجے کے بعد واپس کمرے آتے تو دیکھتے بیرا کھانا لے آیا ہے۔ وہ بلبلیا صاحب کی میز پر کھانا سجا دیتا۔ ہم کھانے سے فارغ ہو کر پھر آواز دیتے۔ "پارٹنر اٹھیئے اب تو دو بج گئے ہیں۔" "اچھا پارٹنر تمہاری یہی ضد ہے تو لو اٹھا جاتا ہوں" اور

بلبلیا صاحب انگڑائیاں توڑتے، سیٹی بجاتے غسل خانے میں داخل ہو جاتے۔ شیو وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ اس میز کی طرف متوجہ ہوتے جو یزید اور بایزید کے دستر خوانوں کا مجموعہ بنی ہوتی تھی، ناشتہ میں سے توس، مکھن اور انڈا لیتے، کھانے بہت صرف شور با لیتے۔ بچی ہوئی چیزوں کو کنارے کھسکاتے، سموسے اور کیلے اپنی طرف بڑھاتے اور شکم سیر ہو کر خاص انداز کی سیٹی بجاتے اور سگریٹ سلگا کر اور کوٹ کندھے پر ڈال کر گھومنے نکل جاتے اور پھر اگلے دن کے لئے یہی عمل دہرانے کے لئے رات میں تشریف لے آتے۔

ہمارے دوسرے پارٹنر ابراہیم بدت صاحب سورت کے رہنے والے تھے۔ عجیب سیمابی طبیعت رکھتے تھے۔ گھڑی میں لڑتے تھے، گھڑی میں دوستی کرتے تھے وہ انٹر کامرس کے دوسرے سال میں تھے۔ بدقسمتی سے ہم نے وہی چیزیں پہلے سال میں پڑھنی شروع کر دی تھیں جن سے وہ دوسرے سال میں متعارف ہو رہے تھے اس لئے وہ ہم سے مختلف مضامین میں مدد چاہا کرتے تھے، جب مدد کی ضرورت پڑتی صلح کر لیتے اور جب سوال حل ہو جاتا اعلانِ جنگ کر دیتے۔ ہمارے دودھ اور مکھن کے وہ کوپن جو ہم نے یوپی گورنمنٹ سنٹرل ڈیری فارم کے ایجنٹ سے خریدے تھے ہماری میز پر کتابوں کے نیچے رکھے رہا کرتے تھے ایک بار ہم علی گڑھ سے باہر گئے واپس آکر دیکھا تو کوپن غائب۔ صبح کو جب ڈیری کا آدمی آیا تو ہم نے اس سے پوچھا کہ ہمارے کوپن پر دودھ اور مکھن کس نے لیا ہے تو اس نے بدت صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ بدت صاحب نے وہی انداز ہمارے ساتھ اختیار کیا جو اسرائیل نے مصر کے ساتھ ۶ جون ۱۹۶۷ء کو اختیار کیا تھا یعنی ہم پر حملہ بول دیا اور جا کر فاروقی صاحب وارڈن سے پہلے ہی شکایت کر دی کہ ہم شور مچاتے ہیں اور ان کو پڑھنے نہیں دیتے۔ فاروقی صاحب نے ہم کو ڈانٹنا شروع کیا تو ہم نے ساری صحیح صورت حال سے انھیں آگاہ کر دیا۔ انھوں نے بدت صاحب کو بلا کر وہی حالت بنائی جو یوم اکتوبر ۱۹۷۳ء میں مصر نے اسرائیل کی بنائی تھی مگر ہمیں یہ ہدایت ضرور ہوئی کہ ہم "بدت صاحب کو" پڑھانا "بند کر دیں کیوں کہ ہم

اسنتاد مقرر نہیں ہوئے ہیں۔

ہاسٹل میں افریقہ کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے ہندوستانی نژاد لوگ خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طلباء کمروں میں ملے جلے رہتے تھے اسی کی وجہ سے ہاسٹل کی حیثیت کل ہند سے زیادہ بین الاقوامی قسم کی تھی اور جس طرح آج کل بعض ہاسٹل افسوسناک حد تک "ضلع وار" قسم کے ہو کر رہ گئے ہیں وہ صورت اس وقت تصور میں نہیں آتی تھی۔

چند ہی ہفتے ہمیں ۱۹۵۱ میں آئے ہوئے گذرے تھے کہ اسٹوڈنٹس یونین کے الکشن آ گئے۔ چوں کہ سرسید ہال کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس لئے نائب صدر، لائبریرین اور سکریٹری کے عہدوں کے امیدواران اپنے کیمپ یہاں ہی قائم کرتے تھے جس کی وجہ سے بڑی ردوق رہتی تھی، ان عہدوں کے ناموں میں یہ تبدیلی آگئی ہے کہ اب نائب صدر کو صدر اور لائبریرین کو نائب صدر کہتے ہیں، وائس چانسلر جو صدر کہلاتا تھا اب سرپرست کہلاتا ہے۔ عبد الباری صاحب غیر کمیونسٹ کیمپ کے اور شفیع صاحب کمیونسٹ اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کیمپ کے امیدواروں کی حیثیت اختیار کئے ہوئے یونین کے نائب صدر کے لئے مقابلہ پر تھے، دونوں امیدواروں نے اپنے کھڑے ہونے کا اعلان روایتی انداز میں چائے کی دعوت کر کے کیا جس میں یاران نکتہ داں کے لئے صلائے عام کے طور پر برفی اور نمک پارہ وافر مقدار میں موجود تھا اور ہر کیمپ کے لوگ بے دھڑک انداز میں دعوت میں شریک ہو کر داد شجاعت دے رہے تھے۔ دونوں صاحبان نے اپنی اپنی قابلیت اور صلاحیت سے طلبا کو روشناس کرانے کے لئے ان انعامات اور اعزازات کی فہرست شائع کی تھی جو تحریری اور تقریری مقابلوں میں ان کو علی گڑھ اور بیرون علی گڑھ حاصل ہوئے تھے۔ ہر امیدوار نے دوسرے امیدوار کی کمزوریاں بیان کرنے کی غرض سے مخالف اعلان شائع کئے تھے جن کو "اینٹی" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دونوں امیدواروں کے معاونین رات دن کمرہ پر آتے رہتے تھے اور دونوں امیدواروں کے

نے اپنا اپنا جو منشور جاری کیا تھا اس کے حسن و قبح پر تفصیلی روشنی ڈالتے رہتے تھے۔ الیکشن کے کام کا یہی انداز یونین کے لائبریرین اور سکریٹری کے عہدیداروں کے امیدواروں نے بھی اختیار کیا تھا۔ کابینہ کے دس اراکین کے لیے بھی بہت سے امیدوار میدان میں تھے۔ ان سب کے معاونین بھی دن اور رات میں وقت کی پابندی کیے بغیر کمرہ پر دستک دیتے رہتے تھے۔ جس سے خاص الجھن ہوتی تھی مگر روایتی طور پر اس کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ضروری تھا الیکشن کا یہ انداز موجودہ طرز سے بہت مختلف تھا۔

ووٹوں کی گنتی الیکشن ختم ہونے کے بعد شام سے ہی شروع ہو گئی تھی اور رات میں قریب گیارہ بجے مکمل ہو گئی اور اسی وقت نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ باری صاحب اور ان کے حمایت کردہ لوگ جیت گئے۔ شفیع صاحب اور ان کے دوست ہار گئے۔ اعلان کے فوراً بعد "جنازہ" چلنے کی تیاری شروع ہو گئی۔

جنازہ کی رسم بڑی زبردست تفریح کی چیز تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ الیکشن کے نتیجے کا اعلان ہوتے ہی جیتنے والا امیدوار ہارنے والے امیدوار کو ایک "تعزیت نامہ" روانہ کرتا تھا۔ جس میں اظہار افسوس کے ساتھ ساتھ اس سے تعاون کی درخواست کرتا تھا اور اس کے ایسے کارکنان کی فہرست طلب کرتا تھا جو "سینیر" کی تعریف میں آتے ہوں۔ ہارنے والا امیدوار جیتنے والے امیدوار کو "تہنیت نامہ" روانہ کرتا تھا۔ اور اس کے اندر اپنے پورے تعاون کا یقین دلاتا تھا اور ساتھ ہی اپنے سینیر رفقاء کی فہرست روانہ کرتا تھا۔ اس کے بعد جیتنے والے نائب صدر، لائبریرین اور سکریٹری کے کیمپوں سے ہارنے والے امیدواروں کے کیمپوں کی جانب چارپائی پر تکیوں وغیرہ سے مردہ کی شکل پیدا کر کے سفید چادر اڑھا کر جنازہ لایا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ "مرثیے" پڑھتے ہوئے، نعرہ لگاتے ہوئے ہو ہو اور رونے کی آواز بناتے ہوئے لوگ آتے تھے۔ اور ہارے ہوئے امیدوار کے کیمپ پر اس کے سارے کارکنان جمع ہوتے تھے۔ جنازہ لا کر باہر رکھ دیا جاتا تھا اور ایک ایک کر کے ان ہارے ہوئے کارکنوں کو باہر لایا جاتا تھا اور سینیر برآمدہ میں

کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ اس کے برابر میں صرف ان سینیر حضرات کو کھڑے ہونے کی اجازت ہوتی تھی جو جنازہ پیٹنے کے مجاز ہوتے تھے جونیر لوگ برآمدہ سے باہر سیڑھیوں سے نیچے کھڑے ہوکر رونا کانا کرسکتے تھے مگر اذپر نہیں آسکتے تھے، سینیر حضرات کے ہاتھ میں عام طور پر ٹارچ ہوتی تھی اور وہ ہارے ہوئے امیدوار کے ہر کارکن کے منہ پر روشنی ڈال ڈال کر نوحہ اور بین کرتے تھے۔

یہ بہت ہی بزدلانہ فعل سمجھا جاتا تھا کہ جنازہ کے ڈر سے کوئی کارکن بھاگ جائے ایک روایت یہ تھی کہ اس طرح بھاگنے والا اگر ہاتھ آجائے تو اس کا جنازہ سزا کے طور پر بجائے سینیر حضرات جونیر پیٹتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ جونیر جنازہ کیا خود "مردہ" ہی کو پیٹتے تھے۔

جنازہ کی یہ رسم اس زمانہ میں ایسے روایتی انداز میں منائی جاتی تھی کہ درحقیقت یہ ان اختلافات کا جنازہ معلوم ہوتی تھی جو الیکشن کے دوران پیدا ہوجاتے تھے اور اس میں بجائے تذلیل اور تضحیک کے تفریح اور تفنن کا پہلو زیادہ روشن ہوتا تھا۔ جنازہ کا اس سے بھی بڑا مقصد ایک طرح سے اس حفظ مراتب کو قائم رکھنا تھا جو علی گڑھ کے مزاج کا جزو لاینفک ہے۔ یعنی سینیر طلبار کی حیثیت کو باقی رکھنا چونکہ سینیر طلبار ہی اس قابل تصور کئے جاتے تھے کہ وہ جنازہ پیٹیں۔ لہٰذا سینیر طلبا کا ادارہ خود بخود پروان چڑھتا تھا۔ جنازہ کی رسم ختم ہونے سے سینیر حضرات کا سکہ خاصا کھوٹا پڑ گیا ہے۔ شروع شروع میں ہم نے دیکھا کہ اگر سینیر حضرات کا جنازہ نہیں پٹتا تھا تو انہیں ناگوار ہوتا تھا کہ ہم کیسے اس "عزت افزائی" کے قابل نہیں گردانا گیا۔ مگر افسوس ہمارے ایک دوست نواب دین قریشی صاحب اکبرآبادی نے ۱۹۵۴ء میں اپنی "عزت افزائی" کے اس موقع کو "ذریعۂ توہین" سمجھ کر اپنا جنازہ پٹوانے سے انکار کیا اور لٹھ لے کر میدان میں کود پڑے یہ کہہ کر کہ "میرا جنازہ جو بھی پیٹے گا میں اس کا سر پھوڑ دوں گا" باوجود یہ دوست شیخ رشید صاحب کے سمجھانے کے وہ اپنی ضد پر اڑے ہی رہے اور ان کا جنازہ نہیں پٹا۔ اس سے رسم جنازہ کو خاصا گھن لگ گیا اور ۱۹۶۱ء کے

الیکشن کے دوران جنازہ کے سلسلے میں ایک افواہ کی بنیاد پر جب علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا تو ہمیشہ کے لئے یہ رسم ختم کر دی گئی۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ سینیروں کی حیثیت بہرحال ڈوب گئی۔

اس زمانہ میں یونین بہت ہی فعال انداز میں کام کرتی تھی کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ کسی اردو یا انگریزی تقریری یا تحریری مقابلہ کا نوٹس نظر آتا ہو، دوسرے مسائل پر بھی یونین کا انداز بہت ہی مثبت اور تعمیری قسم کا ہوتا تھا، یونین کی فعالیت کا مظاہرہ اس زمانہ میں ہوا جب ۱۹۵۰ء کی نمائش قریب تھی۔ ہوا یوں کہ نقوی پارک میں (جو آج کل جواہر پارک کے نام سے مشہور ہے) ایک پروگرام "تعلیمی ہفتے" کے سلسلے میں ہو رہا تھا اس میں فٹ بال کے میچ کے دوران کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے یونیورسٹی کو اس گڑبڑ کے لئے موردِ الزام ٹھیرایا۔ اس پر یونین میں شدید ردّعمل ہوا۔ طے کیا کہ یا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ معافی مانگے، نہیں تو ضلع کی صنعتی و زراعتی نمائش کا بائیکاٹ! علی گڑھ کی خشکی میں نمائش ہی ایک تری کی صورت ہوا کرتی تھی لہٰذا یہ بائیکاٹ بڑا مجاہدہ تھا مگر طلبا میں وہ اتحاد اور نظم و ضبط موجود تھا جس کی بنیاد پر بائیکاٹ کامیابی سے لاگو ہو گیا۔ ادھر دوکانداروں کو خاصا نقصان ہونے لگا اور انہوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کو طلبا سے معافی مانگنی پڑی اور بائیکاٹ ختم ہونے کا اعلان نائب صدر باری صاحب نے کیا جس کو سنتے ہی لڑکے اس طرح جا کر نمائش میں گھسے جیسے گومتی کا پانی لکھنؤ شہر میں۔

ایس ایس ہال اس زمانہ میں بھی مرکزی حیثیت کا حامل تھا، اور اسٹریچی ہال تمام ثقافتی اور سماجی تقریبات کے لئے استعمال ہوا کرتا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو کہ یہاں کوئی نمائش، ڈرامہ، شامِ موسیقی، مشاعرہ وغیرہ نہ ہوتا ہو، عام طلبا کے لباس، چہرہ مہرہ، اندازِ تکلّم، طرزِ گفتگو سے شرافت، خوش حالی اور بے فکری کا اظہار ہوتا تھا، ایک بہت ہی اچھی روایت

اس دور میں یہ بھی کہ معاشی طور پر کمزور طالب علم کے "نان نفقہ" کی ذمہ داری کا عام طور پر "حلقۂ یاراں" کے سپرد ہوتا تھا یعنی خوش حال دوستوں پر یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ اپنے پریشان حال دوست کو اس بات کی کھلی چھوٹ دیں کہ وہ جس دوست کی چاہے شیروانی پہنے، جس کی چاہے قمیص پہنے، جس کے ساتھ چاہے کھانا کھائے، جس کے ساتھ چاہے ناشتہ کرے، جہاں چاہے سوئے وغیرہ وغیرہ، اور ہر دوست نیکی کر دریا میں ڈال پر عمل کرتے ہوئے اپنے احسان کو زبان پر نہیں لاتا تھا۔ یہ سب کچھ خاندانی شرافت، شستگی، عظمتِ انسانی، دریا دلی، قناعت پسندی یا یوں کہیے علی گڑھ کی روایتی اخوت اور برادر ہڈ کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ پورا معاشرہ کچھ اس انداز پر منظم تھا کہ کوئی شخص بھی اپنی فیس معاف کرانے کے لیے اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتا تھا جو آج کل فری شپ حاصل کرنے کے لیے لوگ دھڑلے سے استعمال کرتے ہیں۔ یہی کیفیت یونیورسٹی ہال یا ہاسٹل میں "عہدوں" کے متعلق تھی۔ کوئی شخص بھی کسی عہدہ کے لیے اس ندیدے پن، گروہ بندی، اور زور آزمائی کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا جو آج کل عام ہے اور جس کی وجہ سے طلبا پڑھائی سے زیادہ لام بندی میں اپنا وقت اور صلاحیتیں صرف کرتے ہیں، ہم نے ان دنوں کبھی نہیں دیکھا کہ سینیر طلبا یا عہدیداران اس طرح بے جھجک انعامات طلب کریں یا انعامات کی تقسیم پر اس طرح دست گریباں ہوں جو آج کل عام رواج بن کر رہ گیا ہے۔ اس دور میں ہاسٹلوں میں کوئی استقبالیہ یا الوداعیہ نہیں ہوتا تھا صرف ہال میں سالانہ الوداعی تقریب ہوتی تھی۔ کھیلوں اور دوسرے تحریری و تقریری مقابلوں میں جیتنے والوں کو انعامات کپ یا کتاب کی شکل میں دیئے جاتے تھے ایسا ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ طلبا کو دیئے جانے والے انعامات (جو عام طلبا کے پیسے سے خریدے جاتے ہیں) اٹیچی کیس، شیروانی یا سوٹ کے کپڑے جیسی قیمتی اشیا کی شکل میں چند مخصوص طلبا پر برسائے جا رہے ہوں۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں علی گڑھ کے "کھلنڈروں" کے پاس "تعلیم"

سے زیادہ "تربیت" کی دولت تھی۔ اور اسی کے بل بوتے پر انہوں نے وطن میں نام پیدا کیا تھا آج کے دور میں "تربیت" نام کی کوئی چیز رہ ہی نہیں گئی ہے۔ صرف "تعلیم" کا نام رہ گیا ہے۔ مگر "تعلیم" کے میدان میں بھی دکھاوٹ، بناوٹ اور سجاوٹ پر زیادہ زور ہے۔ گراوٹ اور ملاوٹ روکنے پر کسی کا دھیان نہیں ہے جس کی وجہ سے علی گڑھ کی پیداوار کا خریدار ہی مشکل سے نظر آتا ہے۔

اس زمانہ میں آرٹس فیکلٹی کے سارے شعبہ جات ایس ایس ہال ہی میں واقع تھے۔ شعبہ ریاضی ایس ایم ایسٹ ہاسٹل کے اوپر کے سارے کمروں کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایس ایم ایسٹ ہاسٹل کا آخری کمرہ اس زمانہ میں ۲۲ تھا جس کے بعد برآمدہ میں ایک دیوار کھڑی ہوئی تھی اس دیوار کے پیچھے جو برآمدہ کا حصہ باب العلم کے راستے تک واقع ہے اس میں بنے ہوئے پانچ کمرہ شعبہ فارسی کے تصرف میں تھے۔ شعبہ معاشیات کے کمرہ اس جگہ واقع تھے جہاں آج کل ایس ایم کورٹ کا ڈائننگ ہال ہے جسے طیب جی صاحب وائس چانسلر نے ۱۹۶۴ء میں تعمیر کرایا۔ شعبہ عربی، ہندی، انگریزی وسنسکرت عثمانیہ ہاسٹل کی اوپری منزل میں واقع تھے۔ شعبہ اردو اور شعبہ فلسفہ اور دینیات اس عمارت میں واقع تھے جو آج کل شعبۂ قانون کے پاس ہے اور ایس ایم کورٹ ڈائننگ ہال اور ایس ایس ایسٹ ہاسٹل کے درمیان میں واقع ہے۔ سنٹرل ہاسٹل کے جو کمرے اسٹریچی ہال کے مشرق میں واقع ہیں ان میں لٹن لائبریری تھی اب جس جگہ "کمرہ دعوت" موجود ہے وہاں ریڈنگ روم تھا اور جہاں کینٹین ہے وہاں لائبریرین صاحب کا دفتر تھا۔ کامن روم کی جگہ اس وقت کتابیں رکھنے کا کمرہ تھا اور کامن روم اس زمانہ میں اس جگہ تھا جہاں آج کل پرووسٹ کا دفتر ہے اور پرووسٹ کا دفتر اسی عمارت کے اوپر گول کمرہ میں واقع تھا۔ اسٹریچی ہال کے مغرب میں جو کمرے موجود ہیں ان میں شعبہ سیاست، تاریخ اور قانون واقع تھے۔ وائس چانسلر اور امتحان کے اسسٹنٹ رجسٹرار کے دفاتر جن کمروں میں آج کل واقع ہیں وہ اس زمانہ میں لڑکوں کے رہنے کے کام میں آتے تھے۔ غرضیکہ

ایس ایس ہال اسی انداز پر منظم اور تعمیر کیا گیا تھا کہ طالب علم کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، کھانا پینا ہر چیز تعلیمی عمل کا جزو معلوم ہو۔

اس زمانہ میں ایس ایس ہال کے اندر کنکر کی بنی ہوئی ناہموار سڑکیں تھیں، نہ لان تھے نہ زیادہ درخت تھے۔ ہال کے باہر چاروں طرف تو اور بھی ناگفتہ بہ حالت تھی عثمانیہ کے پیچھے انوپ شہر روڈ تک جھیلیں اور پوکھروں سے بھرا ہوا میدان تھا اس ریگستانی انداز کے ماحول میں یہ ظاہر تھا کہ ہوا کا جو بھی جھونکا کمرہ میں داخل ہوتا تھا وہ اپنے ساتھ خاصی مقدار میں مٹی لاکر وہاں جمع کرتا تھا ذاکر صاحب نے یونیورسٹی میں عموماً اور اسٹریچی ہال کے سامنے اور وکٹوریہ گیٹ کے سامنے خصوصاً شجرکاری اور لان سازی پر توجہ دی تھی جس کی وجہ سے علی گڑھ کی خشکی میں خاصی کمی واقع ہوئی۔ اس زمانہ میں ہندوستانی طرز کے بیت الخلاء ہر ہاسٹل کے لئے اندر کھلی ہوئی جگہوں پر بنے ہوئے تھے مثلاً ایس ایم ایسٹ کے شمال مشرقی کمروں کے طلبار کے لئے بیت الخلاء اس جگہ تھا جہاں اب بیڈمنٹن کا پکا کورٹ بنا ہوا ہے۔ یہ بیت الخلاء کچھ ایسے مغربی طرز تعمیر کے تھے کہ ان کو دیکھ کر بعض لوگوں پر اگر "روحانیت" کا تصور غالب آجاتا تو مقام تعجب نہ ہوتا۔ ان بیت الخلاؤں کے استعمال کرنے والے ہر طرف سے کودتے پھاندتے اس انداز میں آتے تھے کہ لان اور پھلواری تہ و بالا ہو جاتے تھے۔

سنہ ۱۹۶۱ء کے قریب یہ روایتی قسم کے بیت الخلار توڑ دیئے گئے اور ان کے ساتھ ہی سب کمروں کے اندر بنے ہوئے غسل خانے بھی توڑ دیئے گئے۔

اس زمانہ میں کمروں کے پچھلے دروازوں پر صرف لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی رہتی تھیں تار کی جالی ان کے اوپر لگی ہوئی نہیں تھی اس کی وجہ سے بعض کمروں میں "خفیہ راستے" بنے ہوئے تھے جہاں سے رات میں ۹ بجے کے بعد گیٹ بند ہو جانے پر ایک روپیہ جرمانہ ہونے کے ڈر سے لڑکے آیا جایا کرتے تھے یہ "خفیہ راستے" سلاخوں کو موڑ کر کھول لئے جاتے تھے اور صبح

سلاخوں کو سیدھا کر کے بند کر دیئے جاتے تھے تاکہ "نظرِ بد" سے محفوظ رہیں۔ جالی نہ ہونے کی وجہ سے مچھروں کی فوج بڑی آسانی کے ساتھ کمروں میں حملہ کیا کرتی تھی۔ مگر اس حملہ سے زیادہ تکلیف دہ حملہ کبھی کبھی ان چوروں کا ہوا کرتا تھا جو بانسوں میں کونڈے باندھ کر سینیئر صاحبان کو ان کے کپڑوں سے محروم کر جایا کرتے تھے۔

اس دور میں شریفانہ اسلامی روایات کے پیشِ نظر طلباء اور طالبات میں مکمل "علیحدگی" کا اہتمام تھا۔ پوسٹ گریجویٹ طلباء اور طالبات ہی ایک ساتھ بیٹھ سکتے تھے انڈر گریجویٹ کلاسوں میں ان کے ایک ساتھ بیٹھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان بڑی کلاسوں میں بھی یہ صورت تھی کہ یا تو طالبات ایک کونے میں پردہ کے پیچھے بیٹھتی تھیں یا پھر برقعہ اوڑھ کر اگلی سیٹوں پر بیٹھتی تھیں۔ اسی وجہ سے علی گڑھ "جنسی خشکی" کا شکار رہتا۔ اسی خشکی کا نتیجہ یہ تھا کہ طلباء جہاں بھی یونیورسٹی میں کسی "برقعہ پوش" یا بے برقعہ شخصیت کو دیکھتے تو اسے "بند گوبھی" یا "پھول گوبھی" کے خطاب سے نوازتے اور دعا، سلام یا مبارکباد پیش کرتے۔ کوئی کوئی من چلا تو "ریشہ خطمی" ہو کر جملے تک کہہ گزرتا تھا۔ "خاطر معصوم پر گزرنے والے "اس "وبا" کے سدِ باب کے لئے مجبور ہو کر یونیورسٹی نے کمروں کی پشت پر سڑک کی جانب کالے رنگ سے کمروں کے نمبر ڈلوا دیئے تھے تاکہ ہر "مظلوم" اس کمرہ کی نشان دہی کر سکے جس سے "ظلم کے تیر" سلام دعا یا کسی اور شکل میں اسیر چھوڑے گئے ہوں، اس کی وجہ سے "وارداتوں" میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔ علی گڑھ میں "بند گوبھی" کی کاشت کم ہو گئی ہے اور "پھول گوبھی" کا رواج زیادہ ہو گیا ہے اس کی وجہ سے "جنسی خشکی" میں نہ صرف خاصی کمی واقع ہو گئی ہے بلکہ "جنسی تری" کا گمان ہونے لگا ہے۔

ایک بار مہتروں نے ہڑتال کی تو ہم نے بحیثیت جونیئر اپنی یہ ذمہ داری سمجھی کہ کمرہ کو جھاڑو لگا کر صاف کریں۔ اس کام میں مشغول ہوئے تو دیکھا کہ کمرہ کا فرش اور دیواروں کے جوڑ میں کھٹملیں لگی ہوئی ہیں۔ ہم نے متجسسانہ انداز میں جب ایک سینیئر صاحب سے ان کیڑوں کی

حقیقت معلوم کی تو پتہ چلا کہ یہ اس وقت کی یادگار ہیں جب علی گڑھ "رئیس زادوں" کی درسگاہ" کہا جاتا تھا اور کمروں میں دریاں بچھا کر ان پر سرخ کپڑا لگایا جاتا تھا اور ان کو پلٹنے سے روکنے کے لئے کیلوں سے جڑ دیا جاتا تھا اب دریاں تو چلی گئی ہیں صرف کیلیں رہ گئی ہیں۔ اللہ باقی من کل فانی!

رات میں بجلی غائب ہونے کا مرض خاصا عام تھا جس کی شدت میں امتحانات کے زمانہ میں اور زیادہ تیزی آجاتی تھی۔ لوگ اندھیرے میں اپنی فطری آوازیں نکالتے تھے جو کتے، گدھے، بلی اور دوسرے جانوروں کی آوازوں سے ملتی جلتی ہوتی تھیں۔ مگر کوئی بھی شخص ناشائستہ یا نازیبا کلمہ اس اندھیرے میں بھی اپنے منہ سے نہیں نکالتا تھا۔ شاید جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے قیام کی مناسبت سے اب لوگ بجلی غائب ہوتے ہی پروفیسر گرے کی اناٹومی یعنی علم البدن کی کتاب کا زور شور سے ورد شروع کر دیتے ہیں۔

اس زمانہ میں پابندئ وقت کے ساتھ ہمیشہ ۲۳ر مارچ سے امتحانات ہوا کرتے تھے اور امتحانات ختم ہوتے ہی زیادہ تر طلبار گھروں کو چلے جاتے تھے۔ صرف ایل ایل بی کے امتحانات اپریل کے آخر میں ہوا کرتے تھے۔ اور مئی کا مہینہ آتے ہی قانون کے طلبار بھی علی گڑھ کو خیرباد کہہ دیا کرتے تھے۔ ساری یونیورسٹی میں ہو کا عالم ہوتا تھا۔ کمروں میں لوہے کے کنڈے ڈال دیئے جاتے تھے کوئی طالب علم نظر نہیں آتا تھا۔ سوائے ان چند غیر ملکی طلبار کے جو ساری یونیورسٹی سے اکھٹے ہو کر میکڈانل ہاسٹل میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر بجلی کے پنکھوں کی ضرورت نہ کبھی ہمارے دوستوں کو محسوس ہوئی اور نہ ہمیں۔

فرسٹ ایر کامرس کا امتحان مارچ ہی میں ختم ہو گیا۔ ہم سارے طلبار کو یہ شوق سوار ہو گیا کہ ایک گروپ فوٹو ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ جونیر طلبار کی پہونچ کسی "نئے استاد" تک ہی ہو سکتی تھی۔ ہم سب نے شبیر احمد خاں صاحب لکچرار ان اکنامکس (جو آج کل شعبۂ اکنامکس میں

پروفیسر اور صدر ہیں) سے درخواست کی کہ وہ ہمارے ساتھ فوٹو میں تشریف فرما ہوں انہوں نے ہماری درخواست منظور کرلی اور کرکٹ پویلین پر فوٹو ہوا۔ فوٹو کے بعد ہمارے ایک دوست شیخ ماجد صاحب گھبرائے ہوئے ہمارے پاس آئے اور بولے "کاغذ پر لوگوں کے نام لکھے ہی نہیں اب ماونٹ کیسے چھپے گا؟" جب ہم سب نے یک زبان ہو کر کہا "حضرت فوٹو کو دیکھ کر نام چھپ جائے گا!" تو شرمندہ ہو کر بولے "اچھا! یہ تو ہمیں پتہ ہی نہ تھا" کسی نے پھر ان کی چٹکی لی: "آپ کی خطا نہیں ہے۔ کسی بھی فرسٹ ایئر فول کو اتنی گہری باتوں کا پتہ نہیں ہوتا!"

اعلان ہوا کہ یونیورسٹی اس سال یعنی ۱۹۵۰ء میں جولائی میں کھلے گی۔ ہم نے گھر جانے سے پہلے اپنے ساتھی اظہر الدین زبیری سے کہا کہ اس سال ہم ان کے کمرے یعنی ۱۲۲ میں آنا چاہیں گے اور وہ اپنے سینیئر پاٹنر جناب محمد نظر صاحب کاکوروی سے اس کا ذکر کر دیں انہوں نے نظر صاحب سے اجازت لے کر یہ انتظام کر دیا کہ جب ہم آئیں تو ۱۲۸ سے ۱۲۲ میں منتقل ہو جائیں۔

ہم اگست ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ واپس آئے اور ۱۲۲ میں پہونچ گئے۔ وہاں فرنٹ روم میں اظہر الدین کے ایک اور ساتھی کنور ماجد علی خاں صاحب بھی براجمان تھے۔ ماجد صاحب موضع رحیم کوٹ ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ ہائی اسکول تک کامرس کے طالب علم رہے تھے۔ چھٹیوں میں گاؤں گئے تو وہاں کسی نے کہہ دیا "بچہ ڈاکٹر بنے گا" اور دیوانہ را ہوئے بس است کے مصداق ماجد صاحب نے کامرس چھوڑ کر ۱۹۴۹ء میں فرسٹ ایر سائنس میں داخلہ لے لیا۔ اور پورا سال کسی عزیز کے ہاں گزار کر اگلے سال ہاسٹل میں وارد ہو گئے۔ چونکہ سائنس اور ماجد صاحب میں کوئی تعلق ہی نہیں تھا لہٰذا پڑھائی ان کا مقدر بن کر رہ گئی۔ کبھی حاضری کم تو کبھی امتحان میں نمبر کم۔ اسکیمیں بنانے میں ماجد صاحب ہندوستان کے پلاننگ کمیشن کو بھی پیچھے چھوڑے ہوئے تھے۔ جب حاضری کم ہوتی تو منصوبہ بناتے کہ کسی طرح ڈین آفس

کو پٹرول ڈال کر پھونک دیں تاکہ ریکارڈ تلف ہو جاوے اور یہ "سنٹ اپ" ہو جا دیں۔ جب پرچے خراب ہوتے تو مختلف دعائیں مانگتے۔ کہ کسی طرح ممتحن کی آنکھوں پر چربی چھا جاوے مگر نہ کبھی منصوبہ پورا ہوا اور نہ دعائیں قبول ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۹ء میں ہمارے ساتھ تھے اور ۱۹۵۷ء میں ہمارے چھوٹے بھائی ارشاد مسعود کے ساتھ ہو گئے۔ اور اس کے بعد ہمارے سب سے چھوٹے بھائی رشید مسعود کے کلاس فیلو ہونے کے قریب ہی تھے کہ ۱۹۶۵ء میں شاہی درجہ میں ایم، ایس سی جیالوجی کر کے یونیورسٹی کو خیرباد کہہ گئے۔

ماجد صاحب کے اندر خلوص اور محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لئے آپ کا دل اپنی پڑھائی سے زیادہ اس فکر میں مبتلا رہتا تھا کہ پتہ نہیں گاؤں میں کون بیمار ہو۔ اس فکر کو دور کرنے کے لئے آپ علی گڑھ سے ہر تین چار روز کے بعد اپنے گاؤں جایا کرتے تھے۔ گاؤں والوں کے لئے سوغات کے طور پر آپ ککڑی کھیرے، کباب وغیرہ ضرور لے جایا کرتے تھے۔

ماجد صاحب جب کرم فرمانے پر آتے تو تمام حدود کو پار کر جاتے ایک مرتبہ ۱۹۵۲ء میں ہم نے ان سے گاؤں جاتے وقت یہ کہدیا کہ سلاد بنانے کو کچھ پیاز لیتے آیئے گا چند روز کے بعد آپ ڈھائی من کی بوری پیاز سے بھروا کر لے آئے اور اپنے پلنگ کے نیچے رکھ لی اتفاق کی بات ہمارے استاد پروفیسر ڈی پی مکرجی صدر شعبۂ معاشیات ہمارے کمرے کے سامنے سے گذرتے ہوئے یہ کہکر "ہم تمہارا کمرہ دیکھے گا" اندر آ گئے۔ گھستے ہی بولے "علی گڑھ میں کمرہ کیسی باس مارتا ہے" اب ہم کھڑے ہیں شرمندہ! کس منہ سے کہتے کہ جناب یہ ہمارے کرم فرما ماجد علی خاں صاحب کے اخلاص نیت کی بو ہے!

جب ہم نے ایل ایل بی میں داخلہ لینا چاہا تو ماجد صاحب نے اس کی مخالفت کی چند روز بعد آپ بڑے خوش خوش ہمارے پاس آئے اور بولے "یار تم قانون اچھی طرح پڑھنا۔

اب تو مزے ہی مزے نظر آرہے ہیں"۔ ہم نے کہا "میں سمجھا نہیں، کیا بات ہے؟" بولے "ارے! تمہیں پتہ نہیں؟ دلّی میں کوئی لوک صاحب آ گئے ہیں، پنڈت نہرو کے بھی پریذیڈنٹ معلوم ہوتے ہیں جو قانون چاہے بناتے ہیں جو قانون چاہے ختم کرتے ہیں، ایسے موقع قانون دانوں کے لئے اچھے ہوتے ہیں" ہم نے کہا "بھائی صاحب آپ لوک سبھا کو "لوک صاحب" پڑھ کر یہ کس چکر میں پڑ گئے ہیں۔ لوک سبھا تو پارلیمنٹ کو کہتے ہیں۔" یہ سن کر بڑی معصومیت سے بولے "ارے یہ تو بڑی عجیب بات ہے"

غرضیکہ ہم ۱۳۲ میں آ گئے۔ برسات کا موسم تھا، ایس ایس ایسٹ میں کسی من چلے نے پانی برسنے کے ساتھ ہی اپنے دو ایک ساتھیوں کو لے کر بارش میں اچھل کود شروع کر دی، رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس تفریح میں شامل ہو گئے اور آہستہ آہستہ یہ تعداد بڑھتی رہی۔ اور اب لوگوں کا انداز بدلنے لگا اور انہوں نے دوسرے طلبار کو ان کے کمروں سے مذاق کے انداز میں کھینچ کھینچ کر باہر نکالنا شروع کر دیا لوگ کیچڑ سے "ہولی" کھیلنے لگے اس "کیچڑ کے فساد" کے دوران لوگوں کو یہ سوجھ گئی کہ صوفی طاہر صاحب سہارنپوری کو پورے ہال کے سارے "جونیروں" کا "شوہر" بنایا جاوے لہٰذا پانی کے بھرے ایک گڑھے میں صوفی جی کو معہ ان کی طویل دعریض داڑھی کے بٹھا دیا گیا اور ہر جونیر کو گود میں دلہن کی طرح اٹھا کر لایا گیا اور مولانا کے سامنے پانی میں بٹھا کر اس کا "نکاح" مولانا سے پڑھا یا گیا۔

ایس ایس ایسٹ سے "فسادیوں" کا یہ مجمع ایس ایس ویسٹ پہونچا اور وہاں کے سارے جونیروں کو صوفی صاحب کے "حرم" میں داخل کرنے کے بعد عثمانیہ میں آ گیا۔ ہم نے اپنے کمرہ سے جو اُدھر نظر کی تو تماشا اور ہم وہاں ہو رہا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ اب جب کہ سارے طلبار کو لوگ ان کے کمروں سے نکال نکال کر لے جا رہے ہیں اور ہم بچ نہیں سکیں گے ہم نے پہل کر ڈالی اور پرانی قمیص اور پاجامہ چڑھا کر کیچڑ اچھالنے میں مشغول ہو گئے۔ اپنے

کئی ساتھیوں کو نکال کر ہم خود ہی عثمانیہ جا پہونچے۔ ہم کمرہ ۱۰۱ کے سامنے کنکر کی سڑک پر کھڑے تھے۔ اس زمانہ میں عثمانیہ اور ایس ایم ایسٹ میں وہ چبوترے نہیں بنے تھے جو آج کل برآمدوں کے باہر موجود ہیں۔ اور اس جگہ پر پانی رک جایا کرتا تھا جس کی وجہ سے برسات میں بہت ہی کائی جمع ہو جایا کرتی تھی جس پر سخت پھسلن ہوتی تھی ہمارے برابر میں ہمارے ساتھی فتح محمد صاحب (وکیل علی گڑھ) کھڑے تھے۔ انہیں پتہ نہیں کیا سوجھی، ہمیں زور سے دھکا دے دیا اور ہم سڑک سے اس کائی کی تہ جمی ہوئی زمین پر پہونچ گئے اور پھسلن کی وجہ سے ہم نے جو "ڈانس" اور "اسکیٹنگ" کا ملا جلا مظاہرہ اس چکنی سطح پر کیا وہ لوگوں کے لئے خاصا دلچسپی کا باعث تھا اور اس سے زیادہ تفریح کا باعث ہمارا چاروں شانے چت گرنا رہا تھا۔ یوں کہ جب ہم اپنی ہڈیاں سہلاتے ہوئے اٹھے تو لوگوں کے قہقہے ہمارے زخموں پر نمک کا کام کر رہے تھے۔

وہاں سے کل مجمع ایس ایم ایسٹ میں آگیا۔ سب کمروں سے لڑکوں کو نکال کر کیچڑ میں لت پت کر دیا گیا۔ جب کمرہ ۱۴۲ پر پہونچے تو اس میں ساؤتھ افریقہ کے ایک ہندوستانی نژاد صاحب زادے تھے۔ انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ان کو دروازہ کھولنے پر مجبور کیا گیا وہ کھولنے پر تیار نہیں ہوئے۔ ایک صاحب کے اوپر کے روشندان سے اندر اترنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان صاحبزادے نے ان کے ڈنڈا جڑ دیا مگر وہ اندر کود ہی گئے۔ اور کنڈی کھول دی پھر تو ان صاحب زادے کی خاصی مرمت ہوئی۔ مگر جو کام تفریح کے لئے چل رہا تھا اس کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ اور سب لوگ بہت ہی بدمزہ ہو کر اپنے اپنے کمروں کو واپس چلے گئے!

جلد ہی پڑھائی شروع ہو گئی۔ ہم لوگ تجارتی جغرافیہ پڑھنے شعبہ جغرافیہ میں آیا کرتے تھے۔ سائنس اور آرٹس کے بعض طلبا بھی جغرافیہ پڑھتے تھے۔ جغرافیہ سوسائٹی کا الیکشن ہوا۔ انٹر کامرس سائنس اور آرٹس کی نمائندگی بھی اس سوسائٹی میں ہوتی تھی۔

الیکشن میں کسی نے ہمارا نام بھی تجویز کر دیا۔ الیکشن ہوا اور ہم اپنے دوست شاہد صاحب بلند شہری کے مقابلہ پر جیت گئے۔ جیت میں جس بات کو خاص دخل حاصل تھا وہ یہ تھی کہ کامرس کے طلباء کی تعداد زیادہ تھی اور شاہد صاحب سائنس کے طالب علم تھے۔

اس الیکشن کے کچھ ہی دن بعد انٹرمیڈیٹ ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا الیکشن آگیا۔ ہمیں بھلا "ڈیبیٹنگ" سے کیا سروکار تھا۔ مگر جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ ایسے ہی ہم لوگوں کے چڑھائے میں آکر یونین کی طرف بھاگ لئے اور اس الیکشن میں سکریٹری شپ کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے مقابلہ پر عبدالعزیز صاحب اعظمی جو انٹر سائنس کے طالب علم تھے کھڑے تھے۔ (عزیز صاحب نے بعد میں لکھنؤ سے ایم بی بی ایس کیا اور آج کل اعظم گڑھ میں پریکٹس کرتے ہیں) الیکشن کے سلسلے میں "دعوت اعلان" کی گئی۔ خوب کام بھی ہوا۔ مگر جو بات ہمیں لے ڈوبی وہ یہ تھی کہ ہم کامرس کے طالب علم تھے اور عزیز صاحب سائنس کے اور ان کے رفقاء کی تعداد کہیں زیادہ تھی ہم سو ووٹ سے ہار گئے۔ تفریح لینے کی غرض سے ہم نے ایک طویل فہرست اپنے کارکنان کی عزیز صاحب کو بھیجدی تاکہ جنازہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا پڑھے۔ سب سے زوردار جنازہ ہمارے خاص ساتھی اظہر الدین کا پٹا۔ اظہر الدین دبلے پتلے لمبے قد کے تھے ان کا جنازہ پیٹتے ہوئے جو مرثیہ پڑھا جا رہا تھا اس میں ایک شعر یہ تھا۔

سنا ہے کہ ان کے کمر ہی نہیں ہے   یہ جانے جانے کہاں باندھتے ہیں

پورا سال ہنسی خوشی کے ماحول میں کٹ گیا۔ ۲۳ر مارچ سے امتحانات شروع ہوئے جن کے لئے پیرس ہال جانا پڑتا تھا۔

چھٹیوں کے بعد بی کام میں داخلہ لیا۔ اور اگست ۱۹۵۱ء میں علی گڑھ پہونچے۔ تیسرا ہی سال تھا کہ بغیر کچھ کہے اور سنے ہمیں ۱۳۲ کا اور اظہر الدین صاحب کو ۱۳۴ کا بیک روم مل گیا۔ ادھر بغیر کسی جدوجہد کے ہمیں کامرس سوسائٹی کا سکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ ہمیں یہ پتہ ضرور چلا

کہ اس "اعزاز" کے عطا کرانے میں ہمارے مشفق و محترم استاد اور وارڈن فاروقی صاحب کا بڑا ہاتھ تھا اور ان کی خدمت میں ہمارے لئے کار خیر پیش کرنے والوں میں ہمارے کرم فرما بابو خان صاحب (وکیل بلند شہر) بھی شامل تھے۔ ہیں یہ دونوں چیزیں جس طرح بغیر کوئی رسہ کشی کئے حاصل ہوئیں یہ کوئی نئی بات اس دور میں نہیں تھی۔ اس زمانہ میں ہال یا ہاسٹل کے عہدوں کے لئے کسی قسم کا شور شرابہ یا اودھم دیکھنے میں بھی نہیں آتا تھا اسی وجہ سے لوگ اپنی قوتوں کو عہدوں کے پیچھے دوڑنے میں ضائع نہیں کرتے تھے۔ مگر تفریح کے لئے کبھی کبھی یہ دوڑ ہو جایا کرتی تھی۔ مثلاً مجید الدین صاحب کے زمانہ پر دوستی میں حشمت اللہ صاحب بھوپالی سینیئر فوڈ مانیٹر بننے کے خواہش مند تھے۔ یار لوگوں نے تفریح کے لئے ان کے مقابلہ پر ایک فرسٹ ایر کے لڑکے کو لا کھڑا کیا اور اس سے یہ درخواست دلائی کہ چونکہ وہ پندرہ "ڈنلپ" کھاجاتا ہے اس لئے سینیئر فوڈ کے عہدہ کا وہ سب سے زیادہ مستحق ہے۔ اب بڑی تفریح اس وقت آرہی تھی جب مجید الدین صاحب اپنی دھیمی دھیمی آواز میں اس کو سمجھا رہے تھے کہ ابھی آپ اس جگہ کے اہل نہیں ہیں اور وہ صاحبزادے خاصے زور شور سے کہے جا رہے تھے "واہ صاحب واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو سب سے زیادہ نان کھائے وہ سینیئر فوڈ بننے کے لائق نہ سمجھا جائے"۔ بڑی مشکل سے مجید الدین صاحب نے اس لڑکے کو آمادہ کر ہی لیا کہ وہ اپنی درخواست واپس لے لے۔ مگر تفریح خوب آئی۔

حشمت صاحب کے مخالفوں نے ایک روز "کھانے کی ہڑتال" کرانے کی ٹھان لی۔ سنا ہے کہ ایک چھپکلی مار کر چپکے سے شوربہ میں ڈال دی گئی اور پھر نکال کر دکھا دی گئی اور ہنگامہ شروع۔ مجید الدین صاحب آگئے۔ خاصی گفت و شنید کا بازار گرم رہا، آخرکار ہڑتال ختم ہوئی اور کھانا ملا۔

اس سال ہمارے کمرے میں خلیل احمد خاں (ساکن موضع کھبنادر، ضلع سہارنپور) تشریف

وئے۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ ان کے تکیہ پر جو پیغام لکھا تھا وہ بڑا ہی عجیب و غریب تھا۔ سفید تکیہ تھا جس کی ہری کناری تھی اور لال دھاگے سے بڑے اہتمام سے لکھا تھا۔ "یہ ہے خلیل احمد خاں کا تکیہ" ہم نے ان سے عرض کیا "واقعی یہ پیغام بہت کام کا ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے تکیہ کا کھو جانا بہت مشکل ہے۔ لیکن ہماری ناقص رائے یہ ہے کہ آپ اس پر یہ اور لکھوا دیتے کہ "کسی صاحب کو ملے تو موضع گھجناور، ضلع سہارنپور بھیج دیں!"

• •

خلیل صاحب ایک روز موڈ میں آکر فرمانے لگے "دیکھیے صاحب بعض پڑھے لکھے لوگ بھی عجیب باتیں کر جاتے ہیں، ایک صاحب ہمارے اسکول کی تقریب میں آئے تھے اور تقریر کرتے کرتے یہ کہنے لگے کہ 'وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے'، تو صاحب میں ان سے جا کر بھڑ گیا کہ آپ نے میرا نام کیسے لیا میں کب فاختہ اڑاتا تھا۔" ہم نے کہا "خلیل صاحب یہ تو محاورہ ہے اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟" تو بولے "واہ صاحب واہ! یہ کیا محاورہ ہوا جس میں میری توہین ہوتی ہے" ہم نے کہا "اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ آپ وہاں موجود ہیں" تو بولے "یہ ایک ہی رہی! انہیں خلیل خاں کا نام لے کر بات کہنے سے پہلے معلوم کر لینا چاہیے تھا کہ یہاں کوئی خلیل خاں تو نہیں ہے" جب ہم نے دیکھا کہ خلیل صاحب کا پارہ اس وقت اتنی گرمی پر ہے کہ وہ ہماری کسی بات کو سنیں گے نہیں، تو چپ ہو گئے۔ اگلے دن ہم نے اپنے ایک شکاری دوست اعجاز احمد خاں صاحب سے ایک فاختہ مروا کر اس کے پر میں رسی باندھ کر خلیل صاحب کی چھپر دانی میں لٹکا دی، خلیل صاحب نے جو یہ منظر دیکھا تو بہت چراغ پا ہوئے ہم نے ان سے عرض کیا کہ حضرت اب آپ بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فاختہ چکی ہے لہٰذا اب اس کو خلیل خاں اڑا ہی نہیں سکتے۔ اس "فاختہ نامے" کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلیل خاں کا نام ہو گیا "خلیل خاں فاختہ زنی"

خلیل صاحب کو رفتہ رفتہ اپنے "دانشور" ہونے کا گمان ہونے لگا۔ ایک روز فرمانے لگے

"ارشد صاحب کیا اللہ میاں ایک ایسا پتھر بنا سکتے ہیں جسے خود نہ اٹھا سکیں؟" ہم نے کہا "خلیل صاحب میں سمجھا نہیں آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں" بولے "اس لئے اگر وہ نہیں بنا سکتا تو کاہے کا خدا ہوا۔ اور اگر بنا کر اٹھا نہیں سکتا تو پھر کاہے کا خدا ہوا" ہم نے عرض کیا "ارے خلیل صاحب یہ سوال آپ کو پتھروں کے چکر میں ڈالنے کے لئے ہے اس میں منطقی بھول بھلیاں ہیں" خلیل صاحب گرم ہو گئے۔ بولے "یہ کوئی علمی جواب ہوا ارے آپ مجھے اللہ کے وجود پر مطمئن کیجئے" ہم نے ذرا زور سے کہدیا "کیوں میں کوئی اللہ میاں کا ایجنٹ ہوں کہ آپ کو مطمئن کروں"۔ بس خلیل صاحب تو اور گرم ہو گئے۔ ہمیں تفریح کا موڈ آ گیا۔ ہم نے پلٹ کر سوال کیا "خلیل صاحب دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے؟" وہ بولے "چھیاسٹھ کروڑ" ہم نے بڑے ٹھنڈے انداز میں کہا "بھائی صاحب ہمیں چھیاسٹھ کروڑ، ننانوے لاکھ نوسو ننانوے کافی ہیں، آپ چاہیں تو تشریف لے جا سکتے ہیں" بس پھر کیا تھا خلیل صاحب آگ بگولہ ہو گئے اور پیر پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔

ہمارے ایک اور بہت ہی خاص دوست اور ہم جماعت تھے۔ عزیز الرحمٰن خاں رحمانی ساکن ایٹہ۔ یوپی، یہ انتہائی ہنس مکھ، بذلہ سنج، سمجھدار، حساس اور مخلص تھے۔ شعر و شاعری کے شوقین تھے۔ مگر پڑھائی لکھائی سے خاصے دور تھے ان کی رفتار تحریر اتنی کم تھی کہ وہ پانچ سوالات میں سے صرف تین کے جوابات لکھ سکتے تھے اور اسی مناسبت سے وہ تیاری کیا کرتے تھے۔

ان کو اللہ میاں نے یہ عجیب صلاحیت عطا کی تھی کہ وہ ہر پرچہ میں آنے والے سوالات میں سے تین کا اندازہ لگا لیتے تھے اس کے بعد ہماری ڈیوٹی یہ ہوتی تھی کہ ان تین سوالات کے جوابات تیار کریں اور عزیز صاحب کو رٹوائیں۔ عزیز صاحب محلہ بنی اسرائیلاں میں ایجوکیشنل پریس کے قریب رہتے تھے۔ وہاں سے پیدل عصر کے قریب ہمارے پاس آتے تھے اور چائے پی کر ہم لوگ، دودھ پور ہوتے ہوئے میرس روڈ سے گذر کر ریلوے اسٹیشن ہوتے ہوئے

جواہر پارک میں آتے تھے اور وہاں ہوا کھا کر وکٹوریہ گیٹ سے نکل کر کمرو واپس پہونچ جاتے تھے۔ سارے راستے عزیز صاحب کا سبق جاری رہتا۔ تینوں جوابات رٹ لیتے تھے اور غلطی سے بچنے کے لئے اس کے الفاظ، کاما اور فل اسٹاپ کی تعداد بھی گن کر یاد کر لیتے تھے۔ تاکہ بعد میں یہ چیک ہو سکے کہ پورے جوابات کاپی میں داخل ہو گئے ہیں۔ تینوں سوالات لکھنے کے بعد عزیز صاحب جس انداز میں "الفاظ" شماری کرتے تھے وہ بھی امتحان ہال کے اندر دیکھنے کا سین ہوا کرتا تھا۔ زبان سے بُدبُد اتنے جاتے تھے، کبھی چھت کی طرف کورسے انداز میں دیکھتے تھے۔ جلد جلد کاپی پر انگلیاں چلاتے تھے، فوراً انگلی کے پوروں پر گنتی میں الجھ جاتے تھے اور جب حساب کتاب برابر کر چکتے تو "زاروقطارہ مسکراتے ہوئے ہماری طرف فاتحانہ انداز میں دیکھتے ہوئے مور کی طرح سینہ پھلائے ہوئے کاپی جمع کرنے کے لئے اٹھ کر چلتے تھے۔

عزیز صاحب اور کنور ماجد علی خاں صاحب میں ہمیشہ نوک جھونک اور مذاق چلتا رہتا تھا عزیز صاحب کا دہانہ خاصا چوڑا تھا اور وہ "بنگلچر" کو ہمیشہ "بنچر" کہا کرتے تھے۔ اسی مناسبت سے ماجد نے ان کا نام رکھا تھا "گیرتیج" اور عزیز صاحب نے ماجد صاحب کے پستہ قد اور لمبی شیروانی اور ٹوپی کی وجہ سے اور کچھ اس مناسبت سے کہ ماجد صاحب ہمیشہ گاؤں میں ہر ایک کی تندرستی کے غم میں جلد جلد رحیم کوٹ کے چکر لگایا کرتے تھے ان کا نام رکھ چھوڑا تھا "حکیم جی"! جب سب جمع ہو جاتے تو ان دونوں میں خوب چوٹیں چلا کرتی تھیں جس میں ہمیشہ ماجد صاحب کو پیٹھ دکھانی پڑتی تھی اور جب اٹھنے لگتے تو عزیز خاں آخری وار کیا کرتے "قسم خدا کی تم قد سے مارے گئے ورنہ فلم ایکٹر ہوتے"!

ہمارے ایک پارٹنر تھے، اعجاز احمد آزاد۔ ساکن سکندر آباد ضلع بلند شہر، یہ بڑے ہی جذباتی اور گرم جوش انسان تھے انہوں نے مخفر ڈایر میں داخلہ لیا تھا، آتے کے چند ماہ کے بعد ہی یونین کے الیکشن میں کابینہ کی ممبری کے امیدوار بن گئے۔ ہم نے یہ حرکت کی کراہ

کے سارے کارڈوں پر عطر چھڑک کر تقسیم کرا یا۔ عطر میں بسے ہوئے کارڈ لوگوں نے اپنی جیبوں میں احتیاط سے رکھ لیے۔ نتیجہ کا اعلان ہوا تو آزاد صاحب پانچویں نمبر پر کابینہ کے ممبر ہو گئے آپ کو یونین کے محکمۂ تعلیم کا انچارج بنا یا گیا۔

آزاد صاحب کو یہ کمال حاصل تھا کہ نرم گرم بول کر آدمی کو گڑبڑا لیتے تھے۔ مثلاً ایک روز صبح کے وقت دیوار کی طرف اپنا منہ کئے اپنے بستر پر لیٹے تھے کہ ہمارا بیرہ کمرہ میں داخل ہوا تو آزاد صاحب نے بڑے رعب سے اس سے کہا "شاہ زماں میرا سویٹر کہاں ہے؟" وہ بولا "کونسا سویٹر صاحب"۔ "ارے وہی جو تم لے گئے تھے!" انہوں نے رعب کی لی۔ وہ بولا "میں کب لے گیا تھا؟" یہ کڑک کر بولے "ارشد صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ تم حال ہی میں لے گئے ہو!" ہم ان کا یہ سفید جھوٹ سن کر چونک گئے "ارشد صاحب! ارشد صاحب! میں کب لے گیا تھا سویٹر" اب بیرے نے ہماری گواہی لینے کے لئے ہمیں آوازیں دینی شروع کیں ہم نے عافیت اسی میں جانی کہ یہی ظاہر کریں جیسے سو رہے تھے۔ اس لئے غنودگی کی سی کیفیت بناتے ہوئے ہم نے بھی بے پر کی اڑائی "ہاں جب لے گئے تھے اب دے جاؤ" اس کے بعد ہمیں بیرے کے کمرے سے باہر جانے کی آواز سنائی دی۔ جیسے ہی وہ کمرہ سے باہر نکلا۔ ہم اٹھ کر بیٹھ گئے اور آزاد صاحب سے کہا "ارے یار یہ تمہیں کیا سوجھی تھی کہ ہمارا نام لے بیٹھے ہم نے کب اس غریب کو سویٹر اٹھاتے دیکھا تھا جو تم نے اس سے کہدیا" یہ بولے "ارے یں تو ویسے ہی رعب میں لے رہا تھا اسے۔ میرا خیال ہے کہ یہیں میرا سویٹر لے گیا ہے" ہم نے اٹھ کر استنجا کیا اور کلاس میں چلے گئے۔

قریب گیارہ بجے جو لوٹ کر آئے تو دیکھا کہ کمرہ میں سویٹر پڑا ہوا ہے۔ اتنے ہی میں آزاد صاحب آ گئے اور انہوں نے وہ سویٹر پہن لیا۔ تھوڑی دیر بعد بیرا آیا۔ آزاد صاحب کو دیکھ کر بولا "صاحب آپ تو یہ سویٹر پہنے ہوئے ہیں۔ میں تو کہتا تھا کہ میں سویٹر نہیں لے گیا ہوں" ہم نے اس پر کہا "کون کہتا ہے کہ تم آزاد صاحب کا سویٹر لے گئے تھے؟" ہمارا اتنا کہنا

تھا کہ غریب بیرے نے کچھ ایسی بے بسی کے انداز میں ہماری طرف دیکھا جیسے زبان حال سے یہ کہہ رہا ہو کہ "حضرت یہ کہنے والے تو آپ ہی تھے اور اگر یہ بات آپ پہلے سے کہہ دیتے تو میں سوئٹر واپس ہی کیوں لا کر ڈالتا!"

اگلے سال ہمارے کمرے میں ایک نئے پارٹنر کا اضافہ ہوا جن کا نام تھا اعجاز احمد خاں، ساکن بلند شہر، آزاد وغیرہ نے ہم سے کہا کہ وہ اعجاز کا "انٹروڈکشن" لیں گے اور اس سے "موٹی چائے" پئیں گے۔ ہم نے ان کی تائید کی۔ ساتھ ہی انہیں یہ ہدایت کی کہ سب کام شرافت کے دائرے میں رہ کر ہونے چاہئیں۔

اعجاز صاحب کو بلا کر پہلے ان سے نام، پتہ پوچھا گیا۔ پھر ہم نے ان کا خاص مضمون پوچھا تو بولے "جغرافیہ" ہم نے سوال کیا "ماسکو کیا ہے؟" بولے "لندن کا دارالخلافہ"! ہم نے کہا "سبحان اللہ ایک تیر سے کئی شکار! ایک جواب میں کئی غلطیاں! آپ کو یہ نہیں معلوم کہ روس کا دارالخلافہ کیا ہے، نہ یہ معلوم کہ برطانیہ کا دارالخلافہ کیا ہے، نہ یہ معلوم کہ لندن ملک نہیں بلکہ شہر ہے" مگر واہ رے اعجاز خاں باوجود اتنی غلطیاں کرنے کے بڑی ڈھٹائی سے مسکراتے رہے اور ہمیں یہ اندازہ ہوتا رہا کہ ان صاحب زادے میں سچے علیگیرین ثابت ہونے کے پورے جراثیم موجود ہیں (اعجاز صاحب بعد میں سینیئر ہال بنے اور آج کل آئل اینڈ نیچرل گیس کمیشن میں ملازم ہیں)۔

اس کے بعد آزاد صاحب نے اعجاز صاحب سے چائے پلانے کا مطالبہ کر دیا۔ اعجاز صاحب بولے "صاحب میں چائے نہیں پلا سکتا بہت غریب آدمی ہوں!"۔ اس پر ہم نے کہا "بھائیو ہمارے نئے پارٹنر صاحب چونکہ بہت غریب آدمی ہیں اس لئے ان کی جانب سے چائے ہم پلائیں گے آپ سب اٹھیئے اور کیفے ڈی کھوسٹ چلیئے!" ہماری اس بات کا اعجاز صاحب پر کچھ اور ہی اثر ہوا۔ بولے "آپ تکلیف نہ کیجئے میں ہی چائے پلا دوں گا۔" ہم نے کہا "سبحان اللہ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ!" کیفے سے واپسی کے بعد تو بیچارے آزاد صاحب، کو اعجاز صاحب سے للہی بیر

ہو گیا۔ بولے " اس اعجاز کے بچے نے چائے ڈھنگ سے نہیں بلائی ہے اب اس سے اچھی طرح چائے پی جائے گی !" اور اگلے ہی دن سے ہمیں یہ اندازہ ہونے لگا کہ آزاد صاحب اپنے پورے زور و شور کے ساتھ اعجاز صاحب کو ہر بات پر شرطیں لگانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ بمصداق۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے انداز
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں۔

اعجاز صاحب کو لالچ نے مار لیا اور وہ آزاد صاحب کے دام تزویر میں پھنس گئے۔ ہر روز کسی نہ کسی بات پر شرط لگتی اور ہر بات اتفاق سے ایسی ہوتی تھی کہ جیت آزاد صاحب کی ہی ہوتی اور ایک دو روپیہ اعجاز صاحب ہارتے۔ روپیہ وصول ہوتے ہی ہم سب رحمت کے ہوٹل پر پہونچ جاتے اور چائے وغیرہ اڑاتے۔ جن باتوں میں شرطیں لگیں ان میں نمونے کے طور پر دو باتیں پیش ہیں۔ ایک بڑی اینٹ کو زمین پر سیدھا کھڑا کرکے آزاد صاحب نے اس کے ایک طرف چاروں انگلیاں اور ایک طرف انگوٹھا لگا کر اس کو اوپر اٹھایا اور بولے " اعجاز تم اس طرح اس اینٹ کو کتنی دیر تک اٹھائے رہ سکتے ہو ؟"۔ اعجاز صاحب چہک کر بولے " آدھا گھنٹہ !" آزاد بولے " ٹھیک اگر تم اس کو بیس منٹ تک اسی طرح تھام لو تو میں تمہیں پانچ روپیہ دے دوں گا ورنہ تم مجھے ایک روپیہ دینا !" شرط لگ گئی۔ گھڑی سامنے رکھ کر اعجاز صاحب اینٹ تھام کر کھڑے ہو گئے۔ ہم سب لوگ بھی جمع ہو گئے۔ جب دس منٹ گذر گئے اور اعجاز صاحب اسی طرح اینٹ پکڑے کھڑے رہے تو ہم سب کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کہیں آزاد صاحب شرط نہ ہار جائیں اس لئے ہم نے اعجاز صاحب کو نفسیاتی جھٹکا پہونچانے کا انتظام کیا ہر ایک نے کہنا شروع کیا " ارے بھائی تمہارے تو ہاتھ ہل رہے ہیں " " ارے بھائی تمہارا تو چہرہ اترا جا رہا ہے " " میاں تمہاری تو آنکھیں اندر کو دھنسی جا رہی ہیں " وغیرہ وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریب اعجاز صاحب کی ہمت جواب دے گئی اور ۱۴ ½ منٹ پر

دھڑ سے اینٹ گر گئی۔

ایک دن آزاد صاحب نے اعجاز صاحب سے کہا "فرض کرو ایک شخص ۵۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۲۰ قبل مسیح میں مر گیا تو اس کی عمر کتنی ہوئی؟"۔ اعجاز صاحب بولے "یہ سوال ہی غلط ہے"۔ آزاد صاحب نے کہا "سوال صحیح ہے۔ لگاؤ شرط"۔ اعجاز صاحب بولے "رہی شرط۔ یہ سوال غلط ہے"۔ غرضکہ شرط لگ گئی۔ فیصلہ اطہر علی صاحب ساکن ۱۳۱ ایس ایم ایسٹ (جو آج کل شعبۂ تاریخ میں ریڈر ہیں) پر چھوڑا گیا۔ انہوں نے ظاہر ہے آزاد صاحب کے حق میں فیصلہ دیا۔

ایک بار اعجاز صاحب گھر سے واپسی پر المونیم کے ایسے ڈبے میں قریب دو سیر اصلی گھی بھروا کر لائے۔ اس میں ایک زوردار تالا لگا کر رکھتے تھے جب ڈائننگ ہال جاتے تو بڑے اہتمام سے تالا کھول کر ایک پیالی میں گھی نکال کر ساتھ لے جاتے ہم لوگ دو تین دن تو ان کی یہ حرکت دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ شاید یہ ہمیں بھی اس گھی میں سے کچھ چکھائیں مگر جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ ایک دن ان کی عدم موجودگی میں ہم نے گھی کے اس مقفل ڈبے کو ہیٹر پر رکھ کر خوب گرم کر کے ایک دیگچی میں الٹا کر دیا۔ ڈھکن اور دیواروں کے بیچ میں جو ہلکا سا خلا ہوتا ہے اس میں سے ہو کر پگھلا ہوا گھی آہستہ آہستہ دیگچی میں جمع ہو گیا۔ ہم نے تالا اور ڈبہ کپڑے سے اچھی طرح صاف کر کے الماری میں رکھ دیا۔ دوپہر میں اعجاز صاحب آئے۔ ہم سب لوگ موجود تھے۔ انہوں نے پیالی اٹھا کر اس میں گھی نکالنے کے لئے جو ڈبہ اٹھایا تو چونک کر بولے "ارے ہمارا گھی کہاں گیا؟" ہم نے کہا "آپ کا تالہ تو محفوظ ہے نا؟" بولے "جی ہاں" "بس تو پھر یہ گھی ضرور آپ نے کسی کو دیا ہے۔ اس وقت آپ کو یاد نہیں آ رہا ہے۔ اچھی طرح سوچیے!" یہ بات ہم میں سے ہر ایک نے باری باری اس انداز میں کہی جس انداز میں پرانی کہانیوں میں تین ٹھگوں نے باری باری بکری کے بچے کو کتے کا بچہ کہہ کر اس کے شریف خریدار کو شک میں

مبتلا کر دیا تھا اور جب اس نے اس کی رسی کھول دی تھی تو وہ تینوں بے کاس کو چمپت ہو گئے تھے۔ اب اعجاز صاحب بار بار کہتے ہیں "نہیں صاحب مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی کو گھی دیا ہو!" مگر ہم سب لوگ ان کو ہر بار یہی سبق دے رہے ہیں "نہیں ضرور آپ نے اپنے کسی جاننے والے کو گھی دیا ہے ورنہ تالہ کیسے محفوظ رہتا!" تھوڑی دیر میں واقعی ان کی یہ حالت ہو گئی کہ اس انداز میں سر ہلانے لگے جیسے حقیقتاً گھی کسی کو دے ہی دیا ہو اور یاد نہ آرہا ہو! جب تین چار روز گذر گئے تو ہم نے اسی طرح پیالی میں گھی نکال کر ڈائننگ ہال لے جانا شروع کیا جیسے اعجاز صاحب لے جایا کرتے تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ ہم نے ہر روز اعجاز صاحب کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانا شروع کیا اور گھی ان کے کھانے میں بھی ملانا شروع کیا۔ بار بار ان سے یہ کہا جاتا تھا یہ گھی ہمارے گھر سے آیا ہے اور ہم آپ کی طرح خود ہی خود اس کو کھانا نہیں چاہتے بلکہ مل بانٹ کر کھانا چاہتے ہیں جیسے دوستوں کو کھانا چاہیئے۔

آزاد صاحب کی طبیعت کسی طرح سیر ہونے ہی میں نہیں آتی تھی اور وہ بار بار یہی کہتے تھے "اس اعجاز کے بچے نے چائے تو پلائی ہی نہیں ہے اسے مزہ چکھانا ہے۔" ۱۹۵۳ء کے امتحانات حسب دستور ۲۲ مارچ سے شروع ہوئے۔ اعجاز صاحب امتحانات سے فارغ ہو کر جیسے ہی گھر گئے اور ہم لوگ رہ گئے۔ تو ایک دن آزاد صاحب بولے "اب میں اعجاز سے چائے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔" ہم نے کہا "اعجاز تو چلے گئے ہیں آپ انتظام کیسے کریں گے؟" تو بولے "آیئے میرے ساتھ اور دیکھئے کیسے انتظام ہوتا ہے۔" یہ کہکر وہ ہمیں لے کر چلے اور ڈاک خانہ کے پیچھے بشیر احمد خاں پان فروش کی دوکان پر پہونچے اور ان سے بولے "بشیر میاں ایک پلنگ کرسی اور میز بکاؤ ہے کتنے میں خریدیں گے آپ؟" وہ بولے "پانچ روپے دے سکتا ہوں۔" آزاد صاحب بولے "نہیں بھائی چھ روپے تو ہونے ہی چاہئیں۔" وہ بولے "اچھا صاحب چھ روپے ہی سہی۔" یہ بولے "تو آیئے ہمارے ساتھ۔" اور کمرہ لاکر اعجاز صاحب کا

ذخیرہ اٹھا کر بشیر احمد خاں کو تھما دیا۔ جو کچھ روپے ملے ان میں سب لوگوں نے فلم "شعلہ" دیکھی۔ اور چائے بھی پی۔ اس وقت فرسٹ کلاس کا ٹکٹ طالب علموں کو سترہ آنے میں ملا کرتا تھا۔

اگلا سیشن شروع ہونے پر جب لوگ لوٹ کر آئے تو اعجاز صاحب کو اپنے سامان کے غائب ہونے پر شدید غم وغصہ تھا۔ انہوں نے وارڈن فاروقی صاحب سے سامان غائب کرنے کی شکایت ہم لوگوں کے خلاف کر دی۔ کمرہ پر اپنی شان بگھارتے ہوئے اعجاز صاحب اپنی ایک ایسی "بہادری" کا ذکر کر گئے جو انہوں نے ہائی اسکول کے امتحانات میں کی تھی اور جس پر ان کا اخراج یونیورسٹی سے ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی یہ "راز" آزاد صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے فوراً انہیں "بلیک میل" کرنے کی ٹھان لی۔ بولے "اچھا بیٹا تم ہماری شکایت فاروقی صاحب سے کر آئے ہو۔ ٹھیک ہے۔ لو اب ہوشیار ہو جاؤ۔ کل صبح کو رجسٹرار صاحب سے تمہاری اس حرکت کی شکایت ہو گی جو تم نے ہائی اسکول کے امتحان میں کی ہے" آزاد صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ جیسے اعجاز صاحب کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ گڑگڑاتے ہوئے بولے "خدا کے لئے ایسا نہ کرنا ورنہ میری زندگی تباہ ہو جاوے گی" آزاد بولے "یہ تو ہو کر رہے گا سوائے اس صورت کے کہ تم دو کام کر دو" اعجاز بولے "میں ہر کام کر دوں گا پر آپ یہ بات رجسٹرار سے نہ کہیں" آزاد بولے "ٹھیک ہے نہیں کہیں گے مگر ایک تو آپ فاروقی صاحب کو لکھ دیں کہ آپ کی میز، کرسی، پلنگ سب آپ کو مل گئے، ہیں وہ آپ کے دوست ہی لے گئے تھے۔ اور دوسرے یہ کہ آپ ہمیں ایک عمدہ سی چائے پلائیں" مرتا کیا نہ کرتا۔ اعجاز صاحب کو دونوں باتیں ماننی پڑیں۔ جب چائے پی لی گئی تو ان سے کہا گیا "بھائی صاحب اگر آپ یہی چائے پچھلے سال پلا دیتے تو یہ اتنا لمبا خرچہ آپ کو کیوں برداشت کرنا پڑتا۔ اسے ہی کہتے ہیں مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار!"

ہمارے ایک بڑے کرم فرما تھے راؤ محمود علی خاں صاحب۔ آپ سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ ایس ایس ایسٹ کے کمرہ ۲۵ میں رہتے تھے۔ اور جب ہم علی گڑھ پہونچے تھے تب آپ بی۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے اس زمانہ میں مختلف ضلعوں کے طلباء اپنی علیحدہ علیحدہ ایسوسی ایشن بنائے ہوئے تھے تاکہ ان اضلاع کے طلباء کے مفادات کا تحفظ ہو سکے راؤ محمود صاحب سہارنپور ایسوسی ایشن کے روح رواں تھے۔ اس ایسوسی ایشن یا اس جیسی دوسری ایسوسی ایشنوں نے چاہے کچھ اور کیا ہو یا نہ کیا ہو یہ کام بہر حال وہ بڑی پابندی سے کرتی تھیں کہ علی گڑھ کی نمائش میں ڈنر کا انتظام بذریعہ چندہ کر کے اراکین کو کباب پراٹھا کھلا دیں۔ تمام سہارنپوری طلبا راؤ صاحب کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے تھے۔ یا کم از کم راؤ صاحب ضرور خود کو ان کا بڑا بھائی تصوّر کرتے تھے۔ راؤ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے زبردست بے فکری، ضبط اور طمانیت عطا فرمائی تھی۔ انہیں کسی بات کی پرواہ کرتے ہوئے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ خاصے جسیم اور طویل قامت تھے اور اپنی جسمانی اور دماغی صحت کا خاص دھیان رکھتے تھے جس کے لئے مختلف آسنوں کا استعمال کیا کرتے تھے وہ سیدھے بیٹھ جاتے اور اپنا پورا جسم ڈھیلا کر دیتے اور آنکھوں کو عجیب انداز سے بند کر کے تھکان اور تشنج کو دور کرنے کے خیال سے خاصے زور سے کہتے "جا رہی ہے۔ گئی۔ گئی!" اگر کسی شخص کو پتہ نہ ہو کہ راؤ صاحب ورزش فرما رہے ہیں تو اس کا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا یقینی تھا کہ راؤ صاحب پر کسی بھوت یا پری کا اثر ہو گیا ہے۔ جب راؤ صاحب اس عمل میں مصروف ہوتے تو پھر دنیا اور مافیہا سے قطع تعلق کر لیتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہمارا اور راؤ صاحب کا ایک ہی ٹرین سے غازی آباد ہو کر سہارنپور جانے کا پروگرام بنا۔ اور ہم ٹرین کے وقت روانگی سے آدھ گھنٹہ پہلے راؤ صاحب کے کمرہ پہونچ گئے۔ دیکھا راؤ صاحب آسن لگائے بیٹھے پڑے "جا رہی ہے۔ گئی۔ گئی" کا ورد کر رہے ہیں۔ ہم نے راؤ صاحب کو بتانا شروع کیا کہ صاحب ٹرین کا وقت قریب ہے جلدی اٹھئے مگر ان پر کوئی اثر ہوتا تو در کنار انہیں یہ احساس

ہی نہیں تھا کہ ہم بھی ان کے کمرے میں موجود ہیں اور ٹرین کے فکر میں سخت پریشان ہیں۔ ان کا "جاری ہے۔ گئی۔ گئی" کا وظیفہ جاری تھا۔ یہاں تک کہ ٹرین چھوٹنے کا وقت "ٹائم ٹیبل" کے مطابق گذر چکا۔ تب آپ اپنے عالمِ وجد سے باہر تشریف لاتے۔ حواس میں آتے ہی فرماتے۔ "چلئے ٹرین انتظار کر رہی ہوگی" غصہ اور بے چارگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہم کہتے "چھوڑیئے بھی صاحب اب کیا ٹرین ملنے والی ہے"۔ فلسفیانہ انداز میں راؤ صاحب فرماتے "ارے میاں جب ہم جاتے ہیں تو ٹرین پر لیٹ ہونا لازم ہے۔ آیئے ہمارے ساتھ" اور ہم بادل ناخواستہ ان کے ساتھ چل دیتے اور واقعی عجیب بات تھی کہ ٹرین کھڑی ہوئی ملتی! بڑے فخریہ انداز میں راؤ صاحب اپنی بڑی فربہ قسم کی مونچھوں کو تاؤ دے کر فرماتے "دیکھا میاں یہ ہوتی ہے قوّتِ ارادی"۔

ہمارے دوست کنور ماجد علی خاں صاحب بھی راجپوت تھے۔ اور راؤ محمود علی خاں صاحب بھی راجپوت: ایک روز راؤ صاحب اپنا آسن لگائے زمین پر دراز تھے۔ اور ماجد صاحب ہمارے ساتھ کرسی پر بیٹھے تھے۔ ایک سلسلے میں بات کرتے کرتے ماجد صاحب یہ کہنے لگے "راجپوت بڑے ہی خراب لوگ ہوتے ہیں آپس میں لڑتے ہیں۔ کتوں کی طرح!" اتنا سنتے ہی راؤ صاحب دہاڑے۔ "کیا کہا سکتے؟" ماجد صاحب نے جو راؤ صاحب کے تیور بدلے دیکھے تو گڑبڑا گئے اور گھبراہٹ میں بولے "نہیں نہیں۔ میں تو کتے ہی کہ اعلیٰ نسل کے" اور ہماری ہنسی ضبط سے باہر تھی۔

راؤ صاحب کو "یاروں کا یار" کہنا بہت مناسب ہوگا۔ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں سمٹ آیا تھا۔ اسی لئے "فریادیوں" کی ایک قطار ان کے پیچھے لگی رہتی تھی کوئی کسی مسئلہ میں الجھن کھینچے لئے چلا جا رہا ہے۔ کوئی کسی مسئلے میں۔ راؤ صاحب اس غم جہاں کے پیچھے اپنی تعلیم میں کچھوے کی رفتار سے بڑھ نہیں پائے اور آخر کار ایک دن وہ آیا کہ ۱۹۵۶ء میں جب ہم شعبۂ قانون میں لیکچرار ہو گئے تو راؤ صاحب ہمارے طالب علم

بن گئے۔ ہمیں ان کی حاضری لینے میں بڑی شرم آئی اور ہم نے یہ درخواست کی کہ آپ حاضری کی تکلیف گوارا نہ کیجئے۔ ہم آپ کو دیکھ کر ہی حاضری دیدیا کریں گے۔

راؤ صاحب کو یونین کے الیکشنوں کے دوران خاصا خدمتِ خلق کا موقع ملتا تھا۔ انہوں نے سب سے زیادہ خلوص کے ساتھ جو الیکشن لڑا ہے وہ تھے محمد شفیع قریشی صاحب (موجودہ وزیر ریلوے) کا اور ان کا اپنا! جب شفیع صاحب کا الیکشن ہوا تو راؤ صاحب کی وجہ سے ہمیں بھی خاصا دوڑنا بھاگنا پڑا۔ محمد امین بلبلیا صاحب سے مقابلہ ہوا۔ بلبلیا صاحب کا کام زیادہ تھا چوں کہ وہ ایک سال پہلے احمد سعید انڑا صاحب کے مقابلے پر نائب صدارت کے لئے کھڑے ہو چکے تھے۔ اور رہ گئے تھے۔ شفیع قریشی صاحب ان کے مقابلہ پر ہار گئے۔ غالباً الیکشن کا یہی چسکا تھا کہ جب راؤ صاحب ایل ایل بی میں آ گئے تو خود بھی کھڑے ہونے کی ٹھان لی۔

ایک دن ہمارے پاس آئے اور بولے "ارشد صاحب! میں بھی اس بار الیکشن میں نائب صدارت کے لئے کھڑا ہو رہا ہوں چوں کہ میں وکالت کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے یہ الیکشن لڑنا میرے لئے بہت ضروری ہو گیا ہے۔ جیت گیا تو مجھے بولنے پر مجبور ہو ہی جانا پڑے گا اور اگر ہار گیا تو بھی لوگ مجھے زبردستی بولنے پر مجبور کر دیں گے اس سے مجھے بولنے کی پریکٹس ہو جائے گی جو وکالت میں کام دے گی۔" ہم نے کہا "راؤ صاحب اب تو آپ خلیفہ قسم کی شخصیت ہیں آپ کو الیکشن سے کیا عزت حاصل ہو گی؟" بولے "جی نہیں الیکشن تو بہت ضروری ہے۔" ہم نے کہا "بسم اللہ۔ اتنا ہی شوق ہے تو لڑنے میں حرج ہی کیا ہے۔" غرضکہ راؤ صاحب الیکشن میں کھڑے ہو گئے۔ جب نتیجہ نکلا تو قریب ڈھائی سو ووٹ کل لے پائے۔ راؤ صاحب کو اس ہار سے اور فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اتنا ضرور ہوا کہ اس کی وجہ سے وہ یونیورسٹی کو چھوڑ کر چلے گئے اور وہ کام جو ان کے سارے عزیزوں کے مشوروں اور منتوں سے نہیں ہو پایا تھا آن کی آن میں دوہڑول

نے گرد کھایا۔

جب ہم نے ایم اے اکنامکس اور ایل ایل بی میں ایک ساتھ داخلہ لیا۔ (جس کی اجازت اس زمانہ میں تھی اور جو دو سال کے لئے ہوتا تھا) تو ہمارے کمرے میں حسین اظفر خان جمالی صاحب ساکن ایٹہ، یو۔ پی، سے منتقل ہو کر آگئے۔ بڑی ہی خوبیوں کے درست تھے ان کو بھوت پریت پر خاصا یقین تھا اور ہمیں نہیں تھا۔ لہٰذا ان کے خشگیں ہوتے کا خاصا احتمال رہتا تھا۔

اس مضمون کے شروع میں ہم نے اپنے قارئین سے احمد سعید صاحب انڈا کا ذکر کیا تھا۔ اب ہم ان کے متعلق چند باتیں اور عرض کرنا چاہیں گے۔ یہ بہت ہی گرم جوش ہستی تھے اور دلکش بیاں مقرر تھے۔ طلبا میں ان کی مقبولیت حد درجہ بڑھی ہوئی تھی انہوں نے یونین کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جب فیس میں دو روپے کا اضافہ ہوا تب انہوں نے طلبا کی تحریک چلائی۔ اس کے بعد جب جہلم کی چھٹی کو منسوخ کرنے کا ارادہ یونیورسٹی نے کیا تب انہوں نے ذاکر حسین خاں صاحب وائس چانسلر کی زبردست مخالفت کی اور وہ مشہور جملہ کہا "خود ذاکر حسین کہلاتے ہیں اور ہمیں ذکر حسین کی اجازت نہیں دیتے"۔ جب لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد ساٹرن بجانے کا مسئلہ اٹھا تب بھی یہ سارا زمانہ ہوا۔ ان کے حق میں آگے آگئے تھے۔ مگر واہ رے ذاکر صاحب! ہر موڑ پر وہ سعید صاحب کی دل جوئی کرتے اور ہمت افزائی کرتے رہتے۔ یونین کا معتمد اعزازی بننے میں سعید صاحب کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ مگر یہ جب نائب صدارت کے امیدوار ہوئے تو ان کا مقابلہ عنایت آفتاب صاحب سے ہوا۔ دونوں حضرات عثمانیہ ہاسٹل کے رہنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کی انتظامیہ سعید صاحب کو ہارتا دیکھنے میں دلچسپی رکھتی تھی چنانچہ ایک قاعدہ بنایا گیا تھا کہ جس شخص پر بھی یونیورسٹی کا روپیہ واجب ہوگا وہ ووٹ دینے کا حق دار نہیں ہوگا۔ سعید صاحب کے زیادہ تر ہمدرد اس قاعدہ کا شکار ہو گئے۔ جن کا کسی نہ کسی یونیورسٹی کے ملازم کی ضمانت میسر نہیں آ پائی تھی۔ اور سعید

واجب ہونے کی وجہ سے وہ ووٹ سے محروم تھے۔ باوجود اتنا کچھ ہونے کے بھی سعید صاحب کل ۸۷ ووٹ سے ہارے اور عنایت آفتاب صاحب کامیاب ہوئے۔ کئی آدمی ان کی ہار کا اعلان سن کر بے ہوش ہو گئے۔ ان میں سے ایک ہمارے پارٹنر اعجاز احمد آزاد صاحب ہی تھے جو خود کابینہ کے ممبر عنایت آفتاب صاحب کی منسٹری میں چنے گئے تھے۔ یہ سال گذار کر اگلے سال سعید صاحب پھر الیکشن لڑے۔ اس بار محمد امین بلبلیا صاحب سے مقابلہ تھا۔ سعید صاحب جیت گئے اور کئی سو ووٹ سے بلبلیا صاحب ہار گئے۔ سعید صاحب کا یہ دور خاصا شان سے گذر گیا کاش اپنی مدت پوری کرنے کے بعد یونین کی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے مگر انہوں نے ناسمجھی کا ثبوت دیا اور یونین سے وابستہ رہنے کے چکر میں اپنی انگلیاں پھونک بیٹھے

مولانا حسین احمد علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد یونین ہال میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ سعید صاحب بھی بولنے کے لئے آ گئے۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہوتا۔ مگر جب بولنے کھڑے ہوئے تو حد سے تجاوز کر گئے۔ اور یہاں تک کہہ گئے "مولانا حسین احمد صاحبؒ کے انتقال سے کیا خاص نقصان ہوا ہے۔ جب کہ بہت سے علماء مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی صاحب موجود ہیں"۔ اس پر عابد اللہ غازی صاحب سکریٹری یونین نے شدید اعتراض کیا۔ جس کی وجہ سے ان کے اور سعید صاحب کے درمیان قاصی ترش کلامی وہاں ہو گئی۔ سعید صاحب کے بھانجے آصف نائب صدر تھے۔ سعید صاحب کو خیال تھا کہ آصف صاحب ان کی طرف داری کریں گے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ نتیجہ یہ کہ سعید صاحب غصے میں بھر گئے۔ اور شام میں جب مارلین روڈ پر آصف صاحب اور عابد اللہ غازی صاحب جا رہے تھے تو سعید صاحب نے ان دونوں سے مار پیٹ کی اس پر ماحول خاصا گرم ہو گیا۔ اور سعید صاحب علی گڑھ سے غائب ہو گئے۔ چند روز بعد ایک تار یونیورسٹی میں آیا "سعید مر گیا ہے"۔ لوگوں کو فوراً یہ خیال ہوا کہ یہ تار سعید صاحب نے خود دیا ہے تاکہ وہ یہ غور و فکر کر سکیں کہ یونیورسٹی میں ان کی حیثیت کیا ہے۔ یہاں یہ کیفیت تھی کہ کوئی شخص بھی سعید صاحب کے لئے ایک آنسو بہانے کو تیار نہیں تھا۔ ہم نے خود ایس ایم شفیع

صاحب پر ڈاکٹر کی زبان سے یہ جملہ سنا "ارے وہ بڑا ہی سخت ابلا ہوا انڈا ہے اتنی آسانی سے نہیں مر سکتا!" اور وہی ہوا۔ چند روز بعد سعید صاحب لوٹ آئے۔ اور کوئی شخص بھی ان کی پذیرائی کو تیار نہیں تھا۔ انہوں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ہم ان کی بغیر حاضری ہوئے صرف ان کی شکل دیکھ کر حاضری دیتے تھے۔ ان کی دماغی کیفیت کی رعایت سے ہم ان کی کسی بات کی تردید نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ مستقل ہمارے پاس آنے جانے لگے تھے۔ جب وہ فرماتے کہ "ارشد صاحب دنیا میں دو ہی عقلمند ہیں ایک میں اور ایک آپ!" تو ہم ان سے یہ کہہ کر جان بچاتے "سعید صاحب آپ کے متعلق تو ہمیں کوئی شک عقلمند ہونے میں ہے ہی نہیں مگر ہم اپنے متعلق ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتے!" جب وہ یہ فرماتے کہ "ارشد صاحب! آیئے پاکستان چلیں۔ میں صدر بن جاؤں گا اور آپ وزیر اعظم بن جایئے گا" تو ہم یہ کہہ کر پیچھا چھڑاتے "سعید صاحب آپ تو تجربہ کار صدر ہیں یونین کا صدر ہونے کی وجہ سے پاکستان کا صدر ہونے میں آپ کو کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔ مگر ہم ابھی ناتجربہ کار ہیں لہٰذا ہم وزیر اعظم نہیں بن سکتے!" حقیقت میں سعید صاحب کے واقعہ میں طالب علم لیڈروں کے لئے زبردست عبرت کا پہلو ہے۔ باوجود اپنی بے پناہ مقبولیت کے وہ علی گڑھ میں زیادہ دیر رکنے کی وجہ سے اسی طرح خراب ہو گئے جیسے زیادہ دیر تک پال میں رکنے سے آم۔

مئی ۱۹۵۵ء میں ہم نے ایم اے اور ایل ایل بی کے آخری امتحانات دیئے جوں جوں گھر جانے کا وقت قریب آ رہا تھا ہماری بنیں چھوٹی جا رہی تھیں۔ یہ تصور ہی ہمارے لیے سوہانِ روح تھا کہ یہ سال ہمارا آخری سال ہے اور اس کے بعد علی گڑھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا پڑے گا۔ ہال اور ہاسٹل کی ہر ہر چیز اور یہاں کے ہر ہر آدمی کی طرف دل کھنچا جاتا تھا۔ آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب گنگوہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ اپنی میز، کرسی، پلنگ سب اپنے بیرے ریاست خاں کو دے دیئے۔ اور سامان باندھ کر کتابیں باہر رکھوا یا۔ اور دوبارہ کمرہ میں اندر جا کر ہم بیچ کی دیوار سے لپٹ کر اس طرح بلک بلک کر رونے لگے جیسے کوئی بچہ

ایک ماں سے جدا ہوتے وقت اس کا دامن پکڑ کر رو دیتا ہے۔ آخر کار لوگوں نے ہمیں پکڑ کر باہر لا کر رکشا پر بٹھا دیا۔ اور ہم در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے باب اسحاق کی راہ سے سر سید ہال سے جدا ہوئے۔

گھر پہونچ کر ہمیں بہت سے سبز باغ پاکستان کے دکھائے گئے مگر ہم اپنے وطن عزیز کو چھوڑ کر وہاں جانے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ چند ہی روز بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ہم پھر علی گڑھ آ گئے اسی طرح جیسے مچھلی پانی میں آ جائے۔ اور رفتہ رفتہ وہ خوشی اور مسرت کا لمحہ آیا کہ ہم اپنی مادر درسگاہ کی خدمت پر ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو مامور ہو گئے۔ اس کے بعد حوادث کا ایک ایسا جھونکا آیا کہ ۱۷ر اپریل ۱۹۵۹ء سے ۱۶ر اگست ۱۹۶۳ء تک ہم پھر علی گڑھ سے دور رہے۔ مگر اللہ نے دوبارہ ہمیں ۱۷ر اگست ۱۹۶۳ء سے اپنی مادر درسگاہ کی خدمت کے لئے یہاں بھیج دیا۔ اب ہماری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے اس ادارہ کی اور اس میں داخل ہونے والے ہمارے نئے بھائیوں کی سچی اور صحیح خدمت لے لے۔ آمین

"میری پختہ رائے ہے کہ قدامت پسندی قوموں کی زندگی میں ایک تقویت بخش عنصر ہے گو تنہا یہ عنصر کافی نہیں۔ قدامت پرستی سے کچھ مقصود ہے تو یہ کہ ہمارا ماضی محفوظ رہے۔ ہم ماضی ہی کو ساتھ لئے آگے بڑھتے ہیں یہ آگے بڑھنا ہی زندگی ہے۔"

اقبال

محمد شفیع قریشی
(وزیر مملکت برائے ریلویز)

خوابوں کا شہر

میں صرف دو سال علی گڑھ میں رہا۔ ۱۹۵۲ء میں علی گڑھ پہنچا تھا۔ اور ۱۹۵۴ء میں خوابوں کے اس شہر کو الوداع کہا۔ یہ دو سال میری زندگی کے سب سے زیادہ قیمتی سال تھے۔ آج پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو سب کچھ ایک خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ دھندلی دھندلی سی یادیں آج بھی کتنی حسین معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مختصر سا عرصہ میری زندگی کا کتنا بڑا تجربہ تھا۔ اس دوران میں نے ایم اے اور ایل ایل بی کے دو امتحانات پاس کر لیے۔ ایم اے میں جغرافیہ میرا موضوع تھا۔ پوری یونیورسٹی میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی تھی۔ یونین کے دو الیکشن لڑے۔ یونین کی ایگزیکٹیو کا ممبر رہا۔ محمد امین طلیا کے خلاف یونین کی صدارت کا الیکشن لڑا لا سوسائٹی اور جغرافیہ سوسائٹی کا نائب صدر رہا۔ کتنی بار تقریری مقابلوں میں علی گڑھ کی نمائندگی کی اور انعامات حاصل کیے۔

اُس وقت مرحوم ذاکر حسین یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ مسلمانوں کی یہ عظیم درسگاہ ایک عبوری دور سے گزر رہی تھی۔ قدیم روایات و قدروں کا ڈھانچہ ابھی کسی حد تک موجود تھا

لیکن تبدیلیوں کی سرسراہٹ بھی اس کے دریچوں سے سنائی دینے لگی تھی۔ علی گڑھ کی انھیں قدیم روایات کو ان تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ہی ذاکر حسین علی گڑھ پہونچے تھے۔

جب میں یہ چند سطور اس زمانہ کے بارے میں لکھنے کے لئے بیٹھا ہوں تو یادوں کی ایک بارات ہے جس نے ذہن کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔

یونین ہال میں اپنی پہلی تقریر کا تجربہ میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ یونین ہال طلباء سے بھرا ہوا تھا۔ میں تقریر کرنے کھڑا ہوا میں کہنا چاہتا تھا کہ جب ہم کشمیر سے آئے تھے تو علی گڑھ کے بارے میں کیا سوچتے تھے۔ جب میں نے پہلا جملہ بولا۔ "جب ہم کشمیر سے آئے تھے......" ہال کے ایک گوشہ سے آواز آئی "تو بہت سے سیب لائے تھے" ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اور اس کے بعد فقرے بازی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن میں نے تقریر جاری رکھی۔ تقریر کے فن میں یونین میری پہلی تجربہ گاہ تھی جہاں سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ یونین کی اور روایات بھی نہایت دلچسپ تھیں۔ جس کا چلن آج بھی ہوگا۔ ٹوپی کے بغیر یونین میں کوئی تقریر نہیں کرسکتا تھا اگر کوئی ٹوپی کے بغیر کھڑا ہوجاتا تھا تو آوازیں بلند ہوتی تھیں "ٹوپی۔ ٹوپی"۔ بعض اوقات تقریباً ہر کسی کو بغیر ٹوپی کے کھڑا کردیا جاتا تھا۔ اور جب "ٹوپی۔ ٹوپی" کی مانگ شروع ہوتی تھی تو کسی کی بھی ٹوپی اتار کر اس کے سر پر رکھ دی جاتی تھی۔ یہ نہ صرف زندگی اور زندہ دلی کی نشانیاں تھیں بلکہ مقرر میں خود اعتمادی، ذہنی توازن اور حاضر دماغی کی خصوصیات پیدا کرتی تھیں۔

میں ایس ایس ایسٹ میں روم نمبر ۱۵ میں رہتا تھا۔ میرے روم پارٹنرز تھے۔ محمد مظفر جان بینڈت جو آج کل روزہ میں سیشن جج ہیں۔ صوفی طاہر جو مولوی ڈنڈا کے نام سے مشہور تھے وہ میرے ساتھی تھے۔ سہارنپور کا ایک لڑکا اطہر عثمانی بھی میرا روم پارٹنر تھا۔ ہمارا کمرہ سرسید ہال اور یونیورسٹی کی سیاسی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہتا تھا۔ اپنے

کمرہ کی یہ اجتماعی زندگی مجھے اس قدر پسند تھی کہ باوجودیکہ مجھے آفتاب ہال میں ایک بیڈ والا کمرہ مل رہا تھا لیکن میں نے وہاں منتقل ہونے سے انکار کر دیا۔

ماضی کے جھروکوں سے نہ جانے کتنی یادیں جھانک رہی ہیں۔ کتنے ہی ساتھیوں و استادوں کو تو میں بھول بھی چکا ہوں لیکن زیادہ چہرے، زیادہ تر نام آج بھی ایسے ہیں جو ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس زمانہ میں ایل ایل بی کے اساتذۂ کرام میں ایک ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن تھے۔ نظم و ضبط کی سختی سے پابندی کرانے والے۔ لیکن اسی کے ساتھ نہایت ہمدرد اور مشفق۔ کلاس میں حاضری کے وقت اکثر طلباء اپنے دوستوں و ساتھیوں کی پروکسی بول دیا کرتے تھے۔ لیکن ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کی کلاس میں پروکسی بولنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ ہر طالب علم کے نام کے ساتھ اس کی آواز کو بھی پہچانتے تھے۔ ڈاکٹر مظفر علی شعبۂ جغرافیہ کے صدر تھے۔ بہت اچھا پڑھاتے تھے۔ انہوں نے پڑھاتے وقت کبھی نوٹس کا سہارا نہیں لیا۔ ان کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ ڈاکٹر محمد شفیع بھی میرے استاد تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ نہایت دلچسپ تھا۔ ان کے علاوہ میں نے پروفیسر انس اور طاہر رضوی سے بھی پڑھا ہے۔

علی گڑھ میں یہ سعید انڈا اور محمد امین بلبلیا کا دور تھا۔ اگرچہ سعید انڈا یونین کے صدر نہیں رہتے تھے۔ لیکن ان کی خطابت اور قابلیت کی اب بھی دھاک تھی۔ میں ایک مرتبہ ان کے ساتھ مرحوم ذاکر حسین سے ملنے گیا تھا۔ یہ ملاقات بھی ایک یادگار ملاقات تھی۔ اس زمانہ میں محرم کی دس دن کی چھٹیاں ہوتی تھیں۔ ذاکر حسین صاحب نے انھیں کم کر دیا تھا۔ ان چھٹیوں کو بحال کرنے کے لئے ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب یہ مانگ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ آخر میں سعید انڈا نے کہا۔ "آپ ذاکر حسین ہوتے ہوئے ذکر حسینؑ سے منع کر رہے ہیں۔" اس فقرہ پر ذاکر حسین مسکرائے اور ہماری مانگ مان لی گئی۔

میرے کھانے کا انتظام اپنا تھا۔ لیکن فوڈ مانیٹر میرا دوست تھا۔ کھچڑی کی بریانی میرے کمرہ میں بھی منگل ہو جاتی تھی۔ اس طرح کی بہت سی شرارتیں ہیں جن کا ذکر کیا جائے تو پوری

ایک کتاب بن جائے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کا ذکر وہاں کی INTRODUCTION NIGHT کے بغیر ناممکن ہے۔ بے چارے نو واردوں کے لئے یہ رات ہوا بنی رہتی تھی۔ نئے طلبا گھبرائے و سہمے باوجود سخت گرمی کے سرِ شام ہی اپنے کمروں میں بند ہو جاتے تھے کہ کہیں کسی سینیر کی مشقِ ستم کا نشانہ نہ بن جائیں۔ جب تک تعارف کی رات نہ آتی تھی چھوٹی موٹی "ACTIVITY" کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس رات کا میرا تجربہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ ڈائننگ ہال میں طلبا جمع تھے۔ ایک میز پر کرسی رکھی گئی۔ کرسی پر مجھے بٹھایا گیا اور میرے سر پر کاغذ کی ایک تکونی سی ٹوپی پہنائی گئی۔ آوازوں کے شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہی فقرے، وہی مذاق جو اس ہال میں کتنے سالوں سے دہرائے جاتے رہے ہوں گے مجھ پر بھی آزمائے گئے۔ ایک کشمیری گانا سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے گانا سنا دیا۔ ایک دوسرا سینیر بولا (جو شاید یونیورسٹی میں بیس سال سے زیرِ تعلیم تھا) "کشمیر میں سیب کتنے قسم کے ہوتے ہیں۔ جب آپ آئے تھے تو کتنے سیب لائے تھے اور کس کس کو بانٹے تھے"۔ ایک دوسرے نے سوال کیا۔ "آپ نے پتلون کب سے پہنی؟" ایک صاحب اور چہکے۔ "پاجامے میں ازار بند کب سے باندھنا سیکھا؟"۔ آخر خدا خدا کر کے یہ "قتل" کی رات بھی گذر گئی اور اب ہم علیگ برادری میں باقاعدہ شامل ہو گئے۔

علی گڑھ کو میں محض گہوارۂ علم و ہنر ہی نہیں سمجھتا بلکہ وہ مدرسۂ عمل بھی ہے۔ یہاں انسان کو پاکیزہ و صالح قدروں کا ادراک ہوتا ہے۔ خود اعتماد۔ خودداری۔ ہمت و حوصلہ۔ فراخدلی و وسعتِ نظری۔ ہمدردی و انسانیت فکرِ بلند و عزم جوان۔ ترتیب و سلیقہ۔ نظم و ضبط مصیبت، تحمل، بردباری جیسی صفات کے لئے علی گڑھ ایک مثالی تربیت گاہ ہے۔ میں کسی ایسے طالب علم سے واقف نہیں ہوں جو علی گڑھ کا طالب علم رہا ہو اور تنگ نظر ہو۔ فرقہ پرست ہو آج کشمیر میں کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں علی گڑھ کا گریجویٹ نہ ہو۔ علی گڑھ ہماری تعلیمی و تہذیبی

زندگی کی ایک عظیم روایت ہے۔ علم و فن کے کتنے چراغ اس نے جلائے ہیں۔ شمالی ہند میں مسلمانوں کا یہ واحد ادارہ ہے جس کی وجہ سے آج کچھ مسلمان پڑھے لکھے نظر آجاتے ہیں۔ اس ادارہ کی روایات و جڑوں کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔

خوابوں کا یہ شہر جس کے دل فریب و حسین ماحول میں میں نے شخصی ترقی، قومی و ملی تعمیر کے نہ جانے کتنے خواب دیکھے تھے اور جنہیں میں آج شرمندۂ تعبیر کرنے میں معروف ہوں۔ میری یادوں میں بسا ہوا ہے۔ اس کی فضاؤں میں بسی محبت و یگانگت کی گرمی کا لمس میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔

جب میں علی گڑھ میں اپنے زمانہ کو یاد کرتا ہوں تو خواہش ہوتی ہے کہ کاش مجھے ایک بار پھر اس عظیم درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل سکتا۔

○

" جدید اردو علی گڑھ کا عطیہ ہے اردو جا ہے جہاں بنی یا نمودار ہوئی خواہ اس کے اسباب کچھ ہی رہے ہوں اس کی تنظیم، استحکام، ہمہ جہتی ترقی اور اس کو مقبول عام اور مفید انام بنانے میں علی گڑھ کا بڑا نمایاں اور بیش بہا حصہ ہے۔ جن معاشرتی علمی اور تہذیبی کسر و انکسار سے اردو وجود میں آئی ان ہی قوتوں کی کارفرمائی علی گڑھ کی تشکیل میں بھی تھی ہے۔ اگر اردو اور علی گڑھ کا یہ رشتہ تسلیم کیا جاسکتا ہے تو علی گڑھ کے لوگوں کے اس شغف کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو علی گڑھ اور اردو دونوں ہی سے ان کو رہا ہے اردو کی حفاظت اور حیات اور ترقی علی گڑھ کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔"

(رشید احمد صدیقی)

خبیب احمد صدیقی

داستانِ عہدِ گل

بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں انتہائی اہم انقلابات کی حامل ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے اثرات ان بیس سالوں میں اقوام عالم کے لئے بے شمار تغیرات کے حامل بنے تاریخ کے مبصرین اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

علی گڑھ تحریک جو کہ اس برصغیر کے مسلم سیاسی اور سماجی اور ثقافتی احیاء کی انتہائی عنصر بنی وہ تقسیم ہند کے بعد کس راستہ پر چل پڑی اس کے واضح نشانات ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۵۷ تک ملنے لگے تھے۔ اس عاجز نے بھی عین اسی وقت یعنی ۱۹۵۶ء میں داخلہ لیا۔ اس کے پہلے میں نے بی ایس سی کا پہلا سال الہ آباد یونیورسٹی سے پاس کیا اور دوسرے سال میں علی گڑھ چلا آیا۔

اس وقت جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم شیخ الجامعہ تھے۔ جناب قاری محمود صاحب رجسٹرار تھے۔ ایس ایس ایسٹ کے کمرہ نمبر ۴۳ میں قیام کا حکم نامہ جناب پروفیسر شیخ رشید صاحب پرووسٹ ایس ایس ہال نے مرحمت فرمایا اور راقم جانب اپنا سامان لئے اس کمرے پر وارد ہوئے۔ کمرہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ قریب ۹ بجے صبح کا وقت تھا۔ برآمدے

میں سامان رکھوایا، تانگہ والے کو کرایہ چکایا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب سفید شیروانی اور علی گڑھ کٹ پائجامہ فرنچ کٹ داڑھی سیاہ چشمہ لگائے ہوئے سامنے سے گزرے۔ میری طرف دیکھا اور مسکراکر بولے کیوں صاحب کیا چاہیئے۔ عرض کیا کہ کمرہ بند ہے سامان رکھنا ہے۔ بولے کہ دروازے کے پیچھے دیکھئے کنجی لٹکی ہوگی۔ میں نے دیکھا ایک کیل میں کنجی ٹنگی ہوئی ملی۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ بولے کہ کہاں سے آئے ہو۔ نام و پتہ وغیرہ بتایا۔ اچھا بڑی خوشی ہوئی اگر کوئی ضرورت آن پڑے تو وکٹوریہ گیٹ کے بغل کے کمرے میں دن کے ۹ بجے سے دو بجے تک رہتا ہوں۔ مل لیجیے گا۔" یہ کہہ کر چل دیئے۔ میں نے سامان کمرے میں رکھا اسی اثنا میں کمرے کے ایک دوسرے ساتھی سید اعجاز علی صاحب وارد ہوئے۔ آپ فیروزآباد کے رہنے والے تھے۔ اُن سے تعارف کے بعد باہر نکلا وکٹوریہ گیٹ کے پاس پہونچا دیکھا کہ بغل والے کمرے پر وائس چانسلر کی تختی لگی ہوئی ہے۔ لوٹ کر کمرے میں آیا اور اعجاز صاحب سے احوال بتایا۔ معلوم ہوا جن صاحب نے کمرہ کھولنے کی تدبیر بتائی وہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب وائس چانسلر تھے۔ مادر درسگاہ کی یہ خصوصیت ہمیشہ سے تھی کہ ہر کس و ناکس ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ کسی عہدہ یا کسی درجہ پر ہو۔ یہ سبق پہلے ہی روز ملا اور بار بار یہ آموختہ دہراتا رہا۔

میرا قیام علی گڑھ میں بحیثیت طالب علم ۱۹۵۹ تک رہا۔ ان ۴ سالوں میں اس درس و تدریس کے مرکز سے تین ڈگریاں مجھے عطا ہوئیں۔ یعنی بی۔ ایس سی ایم اے اور لا۔ اس زمانے میں ڈبل کورس یعنی ایم اے اور لا ر کے امتحانات دو ہی سال میں پورے کئے جا سکتے تھے۔ اس طور سے میرا تعلق سائنس اور آرٹس دونوں ہی فیکلٹی سے رہا۔ جناب پروفیسر بابر مرزا صاحب حیوانیات کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھے۔ سائنس ڈپارٹمنٹ میں خالی پیریڈز میں زیادہ تر میں حیوانیات کے میوزیم میں چلا جاتا تھا۔ ایک دن میوزیم میں پہونچا تو وہاں پر ایک الماری پر ایک لنگور رکھا ہوا تھا۔ بالکل زندہ جیسا میں نے

سمجھا کہ یہ میوزیم میں ایک نیا اضافہ ہے۔ لہٰذا قریب پہونچا دو ہی قدم بڑھا ہوں گا کہ لنگور
نے گردن موڑی ابھی میں سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس نے ایک جست بھری اور دوسری
الماری پر جس میں بہت سے جانور مختلف EXHIBITS کے رکھے ہوئے تھے جا بیٹھا میں
کمرے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ایک چھناکے کے ساتھ کئی جار زمین پر آرہے۔ اتنی دیر
میں ایک چپراسی دوڑا ہوا پہونچا اور اس نے کہا کہ دروازہ بند کر دیجئے۔ تھوڑی دیر
میں اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ پتہ یہ چلا کہ پروفیسر مرزا صاحب اور غالباً اطہر حسین صاحب
HIMALYAN LANGUR کی آنتوں میں پائے جانے والے ایک کیڑے پر ریسرچ
کر رہے ہیں اور یہ لنگور صاحب اسی سلسلے میں آئے تھے مگر اپنے ENCLOSURE سے کسی طرح
فرار ہو گئے تھے اور میوزیم میں پناہ گزیں تھے کہ مجھ سے ملاقات ہو گئی اسی اثنا میں خود
بابر مرزا صاحب اور دوسرے کئی اساتذہ بھی آگئے۔ لنگور صاحب بہ مشکل تمام گرفتار
کئے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پروفیسر بابر مرزا صاحب نے دنیائے سائنس میں جس نئے
کیڑے کی دریافت کی اس کا نام ENTEROBINS ZAKRI ہے جو جناب شیخ الجامعہ کے
نام نامی سے منسوب ہوا۔

سرسید ہال یونیورسٹی کا اہم ترین مرکز تھا۔ تمام تر دفاتر اور بیشتر ڈپارٹمنٹ یہیں
مرکوز تھے۔ لٹن لائبریری بھی یہیں پر تھی۔ ایک دن صبح صبح جب لا کے کلاس کے لئے
پہونچا تو لائبریری کے سامنے ایک صاحب مدراسی انداز کی لنگی اور کرتا کندھے پر ایک
تہہ کی ہوئی چادر ڈالے ہوئے کٹ بال کے ساتھ کھڑے ہوئے دکھائی دیئے۔ ذرا
آگے بڑھا تو پہچانا کہ جناب وی کے کرشنا مینن صاحب جو ان دنوں وزیر دفاع تھے
موجود ہیں میں نے بڑھ کر ان سے اپنا تعارف کرایا اور پوچھا کہ کس سلسلے میں تشریف
آوری ہوئی۔ بتایا کہ یونیورسٹی دیکھنے اور آپ لوگوں سے ملنے چلا آیا ہوں۔ ان سے
دس پندرہ منٹ تک باتیں ہوتی رہیں۔ مینن صاحب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ

PROTOCOL کے بالکل قائل نہ تھے، نہایت بے تکلفی سے ہم لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ نہ سکریٹری نہ چپراسی اور نہ کوئی پروگرام دلّی سے سیدھے یونیورسٹی چلے آئے تھوڑی دیر میں جناب سید نورالحسن صاحب جو ان دنوں ہسٹری کے پروفیسر تھے اور پرووائس چانسلر سید نوراللہ صاحب، پراکٹر جناب ڈاکٹر بشیر خاں صاحب وغیرہ آگئے اور پھر قریب ساڑھے گیارہ بجے یونین ہال میں مینن صاحب کا استقبال ہوا اخباروں اور ریڈیو پر مینن صاحب کی شعلہ بیانی پڑھی اور سُنی گئی تھی مگر اس دن خود مینن صاحب کو بولتے سُنا اور یہ احساس ہوا کہ فن تقریر اپنی جگہ پر ہے مگر اس میں لیاقت بھی شامل ہو جائے تو پھر سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ مینن صاحب اپنے RADICAL خیالات کے لئے مشہور تھے اور انہوں نے اس تقریر میں نوجوانوں کو جو پیغام دیا وہ تھا LERN TO LIVE DANGEROUSLY کس پرزور طریقہ استدلال سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے انھیں سُنا ہوگا۔ میرے ایک دوست اور کلاس فیلو آر۔ کے بھنڈاری صاحب تھے جو دہلی کے رہنے والے تھے انہوں نے اس تقریر کے کچھ حصے یاد کر رکھے تھے جو وہ اسی انداز میں کبھی کبھی دہرایا کرتے تھے۔ پتہ نہیں بھنڈاری صاحب آجکل کہاں ہیں۔

میرے زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جن متعدد غیر ملکی مہمانوں کی آمد ہوئی ان میں شاہ سعود، محمد شاہ ایران، بادشاہ افغانستان کے علاوہ بہت سے وزراء اور سفراء شامل ہیں۔ سردیوں کا زمانہ تھا جب شاہ ایران مع ملکہ ثریا کے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ کرکٹ گراؤنڈ پر ان کی ضیافت کا انتظام جناب چانسلر سید ذاکر حسین صاحب کی طرف سے شام کی چائے پر ہوا تھا۔ جس میں پوری یونیورسٹی مدعو تھی۔ مجھ کو یاد ہے کہ شاہ گہرے نیلے سوٹ میں ملبوس ملکہ کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر ایک تقریر کی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میری دلی تمنا اور خواہش

ہے کہ کاش میری عمر بیس سال کم ہوتی اور میں اس یونیورسٹی میں بحیثیت طالب علم کے
داخلہ لیتا۔ چائے کے بعد ملکہ ثریا نے ایک سگریٹ نکال کر جلایا مگر کسی وجہ سے سگریٹ
کو ایک ہی دو کش کے بعد ایش ٹرے میں رکھ دیا اور کسی سے باتوں میں مصروف ہو گئیں
جیسے ہی شاہ اور ملکہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ ایس ایس ویسٹ کے ایک طالب علم مظہر الدین
صاحب جو غالباً راجستھان کے رہنے والے تھے جھپٹے اور اس سگریٹ کو اڑا لیا۔ اس
دن کے بعد ہفتوں بلکہ مہینوں تک ایس ایس ویسٹ میں ان کا کمرہ لڑکوں سے بھرا
رہتا جو اس سگریٹ کی زیارت سے بہرہ مند ہوتے۔ یہ خاکسار بھی ان میں سے ایک تھا
میں نے دیکھا کہ سگریٹ ایک فریم میں شیشے کے نیچے آویزاں تھا۔ مظہر الدین صاحب
نے از راہ کرم میرے ہاتھوں میں وہ فریم دیدیا اور اس کی ہلکی سی سرخی کی طرف بھی توجہ
دلائی جو ملکہ ثریا کی لپ اسٹک کے اثرات تھے۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے ظاہر شاہ والئ افغانستان کی آمد علی گڑھ میں ۱۹۵۸ء میں
ہوئی ان دنوں یونیورسٹی اور خصوصاً ایس ایس ہال میں اس بات کا شور تھا کہ سی۔ آئی
ڈی والے شاہ کی حفاظت کے پیش نظر یونیورسٹی میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ہمارے
ایک ہم وطن عزیز جناب محبوب ربانی عباسی صاحب جو نمبر ۱۸ ایس ایس ایسٹ میں
رہتے تھے اس سلسلے میں کافی چوکنے تھے۔ لہٰذا ہم سب نے اس بات کو ان سے کافی بڑھا
چڑھا کر بیان کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ سلیمان ہال کے دو لڑکوں کو جو ظاہر شاہ کے بارے
میں باتیں کر رہے تھے پولیس والے غیر معلوم مقام پر لے گئے ہیں۔ ربانی صاحب معاملہ
کی اہمیت کو تو سمجھ گئے مگر اظہار مردانگی کچھ اس طرح کیا کہ دو چار جملے پولیس۔
ظاہر شاہ اور حکومت کے بارے میں بھی۔۔۔۔۔۔ کہہ گئے۔ جس صبح کو ظاہر شاہ
کی آمد متوقع تھی اس سے پچھلی شام کو میرے کمرے میں ایک چھوٹی سی میٹنگ ہوئی۔
جناب افتخار احمد خاں صاحب موجودہ پراکٹر اس وقت ایس ایس ایسٹ کے وارڈن

تھے۔ اپنی نیک فطرت اور خلوص کی وجہ سے طلباء میں اس وقت بھی بہت مقبول تھے
ان کے وہاں سے جو کرکٹ کپتان کے کمرے کے اوپر سے ان کے پیڈ کا ایک کا غذ اڑا لیا گیا
اس پر ایک حکم نامہ بنام محبوب ربانی عباسی صاحب اس امر کا ٹائپ کرایا گیا کہ چونکہ
ربانی صاحب متوقع مہمان کے بارے میں خطرناک رجحانات رکھتے ہیں لہٰذا وہ فوراً
وارڈن صاحب کے پاس پہونچ جائیں جہاں کچھ لوگ ان کے منتظر ہیں۔ یہ آرڈر ایک
لفافہ میں رکھ کر ایک بیرے کے ذریعہ ربانی صاحب تک پہونچا دیا گیا۔ اس وقت انکی
سراسیمگی اور وحشت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بیچارے باچشم تر
بھاگتے ہوئے وارڈن صاحب کے یہاں روتے ہوئے وہاں کیا ہوا یہ تو ربانی صاحب خود ہی بتا سکیں گے لیکن یہ ضرور ہوا
کہ کم از کم دو چار ماہ تک ربانی صاحب بہت سنجیدہ رہے۔ یہاں ان لوگوں سے معافی
چاہتا ہوں جو اس شرارت میں شریک تھے ان سے رازداری کا وعدہ آج ٹوٹ گیا۔
آج لوگ اکثر یہ کہتے ہیں کہ لڑکوں میں نظم و ضبط کی کمی ہے یا اس قسم کے دوسرے
الزامات نئی پود پر عائد کرتے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ ڈسپلن یا ذمہ داری کا احساس لڑکوں
میں پیدا کرنا والدین اور اساتذہ کی ذمہ داری ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جن حالات
سے گذری ہے اور جیسے طوفان سے دوچار رہی ہے ان حالات میں کوئی دوسرا ادارہ
کب کا دم توڑ چکا ہوتا۔ مگر یہ بانئ درسگاہ بابائے قوم سرسید علیہ الرحمۃ کا فیض ہے
کہ یہ دانش کدہ ہر طوفان سے گذرتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں کے اساتذہ عموماً طور پر طلباء
اور ادارے سے محبت اور ہمدردی رکھتے چلے آئے ہیں۔ یہاں کے طلباء آج کے
حالات میں بھی ذمہ دار اور بڑی حد تک سنجیدہ رہے ہیں۔ غالباً ۱۹۵۷ء میں کتاب
RELIGIOUS LEADERS میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی پر پورے
ملک کے مسلمانوں میں زبردست ہیجان برپا ہو گیا اور جگہ جگہ فسادات ہو گئے۔ علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی میں حالات بہت ہی سنگین صورت اختیار کر گئے۔ شہر میں فساد ہو گیا

لوگوں کی دو کانیں جلائی گئیں۔ یونین میں میٹنگ ہوئی طلبا نے تقریریں کیں ان میں بعض اصحاب نے ڈائریکٹ ایکشن وغیرہ پر بھی زور دیا لڑکوں میں سخت برہمی اور ہیجان تھا۔ مگر وائس چانسلر ذاکر حسین صاحب نے یونین ہال میں طلباء سے خطاب کیا انھوں نے جس محبت اور ہمدردی سے لڑکوں کو سمجھایا وہ شاید انتہائی شفیق باپ بھی نہ کر سکتا۔ انھوں نے کہا کہ سر سید مرحوم کے وقت میں بھی ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں اسی طرح کی مذموم باتیں رسولِ اکرم کی شان میں لکھی گئی تھیں۔ جو انتہائی گمراہ کن اور گستاخانہ تھیں۔ مگر سرسید نے کوئی ہنگامہ نہیں کھڑا کیا۔ کوئی ہڑتال یا ایجی ٹیشن نہیں کرایا۔ بلکہ وہ انگلینڈ تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے برٹش میوزیم لائبریری میں گہرے مطالعے کے بعد اس کتاب کا جواب لکھا جو وہاں چھپا۔ اس کتاب میں انھوں نے ان الزامات کو قطعی طور پر لغو اور بے بنیاد ثابت کر دیا۔ وہ سچے عاشق رسول تھے۔ لہٰذا اگر کسی نے اپنی نادانی یا جان بوجھ کر ایک غلط بات لکھی تو ہم کو بحیثیت آنحضرتؐ کے اُمتی اور اس ادارے کے طالب علم بذریعہ استدلال اس غلطی کو واضح کر دینا چاہیئے۔ میں اس تقریر میں موجود تھا۔ یونین ہال میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی اوپر گیلری اور باہر برآمدے تک لڑکے بھرے ہوئے تھے مگر ذاکر صاحب کی پوری تقریر نہایت خاموشی سے سنی گئی اور اس کا خاطر خواہ اثر لڑکوں پر پڑا۔ کیا کوئی مثال کسی دوسرے ادارے سے اس قسم کی مل سکتی ہے۔

ذاکر صاحب کے بعد جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر ہو کر آئے۔ ذاکر صاحب نے اپنے زمانے میں پوری یونیورسٹی میں ٹیوب ویل اور نالیوں کا جال بچھوا کر یونیورسٹی کو گلستاں بنا دیا تو زیدی صاحب نے نئی تعمیرات کے ساتھ ایک دوسرا شہر بسا کھڑا کر دیا۔

یہ شاید ۱۹۵۸ء یا ۱۹۵۹ء کا واقعہ ہے کہ ایک صبح ہم سب کو معلوم ہوا

کہ وی ایم ہال ڈوب رہا ہے۔ سخت حیرت ہوئی، سیلاب تو ہم پورب دیس کے رہنے والے جھیلتے ہیں علی گڑھ میں کون سا دریا ابل پڑا۔ ہم سب وی ایم ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں لوگ ساتھ آگئے اور کارواں لمبا ہوا۔ ہم لوگ جو سڑک راؤنڈنگ کلب کو پیچھے چھوڑ کر روانہ ہوئے۔ ابھی تھوڑی ہی دور پہونچے تھے کہ دیکھا کہ ایک سمندر سامنے ہے۔ سڑک تک پانی پہونچ گیا تھا اور وی ایم ہال کی پچھلی دیوار زد پر تھی ہمیں سخت حیرانی تھی کہ یہاں قریب کوئی دریا نہیں، کیسا سیلاب ہے۔ ابھی ہم وہاں کھڑے ہی تھے کہ وائس چانسلر صاحب بمع یونیورسٹی کے اسٹاف اور چند ضلع کے ذمہ داران کے تشریف لے آئے۔ انھوں نے آتے ہی ہم لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ تماشائی نہیں بلکہ یونیورسٹی کے ذمہ دار طلبا ہیں اپنی ذمہ داری سنبھالئے۔ یونیورسٹی انجینئر صاحب نے ایک جگہ بند باندھنے کا فیصلہ کیا اور یونیورسٹی سے فوراً پھاوڑے اور بیلچے وغیرہ آگئے۔ زیدی صاحب نے خود ایک پھاوڑا سنبھال لیا۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ہم سب نے بندھ پر کام شروع کر دیا۔ قریب کے گاؤں والے جو زیر آب آ گئے تھے ان کو وہاں سے نکالنے کا کام بھی لڑکوں نے سنبھال لیا۔ صبح قریب آٹھ بجے سے لے کر شام کے تین بجے تک لگاتار یونیورسٹی کے طلبا محنت کرتے رہے۔ یونیورسٹی کے بیشتر ذمہ داران وہاں موجود تھے۔ بارہ بجے زیدی صاحب کے حکم سے لڑکوں کو چنے تقسیم کئے گئے مگر بیشتر لڑکوں نے یہ چنے غریب دیہاتیوں کو بانٹ دیئے جو اس سیلاب کے پناہ گزیں تھے تین بجے شام تک تین فرلانگ لمبا بند بن کر تیار ہو گیا۔ پانی بڑھنا بند ہو گیا اس وقت ضلع کے کچھ حکام کچھ انجینئر صاحبان اپنے ساتھ سامان لے کر پہونچے اور حیرت سے اس بند کو دیکھتے رہ گئے جو بغیر کسی ٹینڈر و ٹھیکے کے انسانی ہمدردی

اور خلوص کے سہارے بن کر تیار ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی کے اقامتی کردار کا ایک اہم عنصر ڈائننگ ہال ہے۔ یوں تو ڈائننگ ہال کے کھانے کے متعلق عام طور سے کہا جاتا ہے کہ سرسید نے جو نسخہ لکھ دیا وہ آج تک بغیر کسی فرق کے تیار ہو رہا ہے۔ مگر اس کے متعلق ایک واقعہ مجھ پر بھی گزرا جو اپنی جگہ پر دلچسپ ہے۔ جہاں تک یاد ہے اکتوبر یا نومبر ۱۹۵۷ء کی بات ہے میں کہیں سے واپس اپنے کمرے پر آیا۔ روم پارٹنرز صاحبان نہیں تھے کمرہ بند تھا مگر ایک بزرگ خضر نما برآمدے میں کھڑے تھے۔ عرض کیا کہ کس کی تلاش ہے۔ بڑے میاں نے فرمایا 'میں اپنی نوجوانی تلاش کر رہا ہوں جو اسی کمرے میں گزاری ہے' عرض کیا کہ اندر تشریف لے چلئے شاید مل جائے۔ اندر آئے۔ میرا پورا شجرہ معلوم کیا۔ وہ خود میرٹھ ضلع کے کسی بڑے قصبہ کے رہنے والے ۱۹۱۵ء کے اولڈ بوائے تھے۔ میں نے چائے تیار کی وہ چائے پیتے رہے اور برابر اپنے وقتوں کی بات کرتے رہے۔ فرمایا آپ آج گلزار میں رہ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کے وقت میں جو گرد اسٹیشن کے پاس اٹھتی تھی وہ انھیں کمروں میں آکر بیٹھتی تھی۔ آپ کو عمدہ فرنیچر ملا ہوا ہے۔ ہم سب بالائے قلعہ سے بانس کے پلنگ اور ایک آدھ کرسیاں لے آتے تھے غرض کہ تمام IMPROVEMENTS کے بارے میں ذکر کرتے رہے۔ اتنے میں ڈائننگ ہال کی گھنٹی بجی۔ میں نے عرض کیا کہ چل کر کھانا بھی کھا کر دیکھئے۔ ایک خالص علیگ کی طرح فوراً تیار ہو گئے۔ ڈائننگ ہال کے اندر ایک حصہ میں CANTEEN قائم تھی۔ دیکھتے ہی بولے بھلا بتاؤ تو ہم لوگ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس شاندار فرنیچر اور کراکری کے ساتھ CANTEEN یونیورسٹی میں قائم ہوگا غرض کہ اس تمام تعریف اور توصیف کے بعد جب حضرت کے سامنے ڈونگے اور سالن رکھا گیا اور انھوں نے پہلا نوالہ اٹھایا ہی تھا

کہ بے ساختہ بولے " قسم خدا کی کوئی فرق نہیں ہے وہی مزا ہے۔" ان بزرگ کی آنکھوں سے اس وقت آنسو رواں تھے۔ آج اس مضمون کو ختم کرتے وقت میری آنکھیں بھی پرنم ہیں۔ کاش یہ دانش گاہ اپنی مخصوص روایات کے ساتھ تا ابد پھولتی پھلتی رہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

ہند کے جلوۂ صد رنگ کا ہے پاس ضرور
اس میں سوز عرب و حسن عجم یاد رہے
کارواں منزل نو کے لئے ہو گرم سفر
اپنی تہذیب کا بھی نقش قدم یاد رہے
چمن علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور
میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے
محو ہوں عظمت شاہی کے حسیں افسانے
گر رہے یاد تو جمہور کا غم یاد رہے
در میخانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے
پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے

آل احمد سرور

سید وقار حسین

ایس ایس ہال کی باتیں

میں ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۴ء تک ایس ایس ہال میں رہا۔ جن دو کمروں میں رہنے کا مجھے اتفاق ہوا اُن میں سے ایک اب ایس ایس ایسٹ میں ہے اور دوسرا ایس ایس ساؤتھ میں۔ میرے زمانے میں ہوسٹلوں کی موجودہ تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی۔ گو کہ مجھے ہال چھوڑے ہوئے ابھی صرف گیارہ سال کا عرصہ ہوا ہے اور میرے بعض معاصرین کہ وفاداری بشرطِ استواری کے قائل ہیں اب بھی وہیں اپنا ڈیرہ جمائے بیٹھے ہیں، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اس وقت کا ایس ایس ہال آج کے ایس۔ ایس ہال سے ذرا مختلف تھا۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو کہ ہال کے ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے یعنی موجودہ دور کا آغاز میرے دیکھتے دیکھتے ہوا۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو ایسی روایات کا ماتم کرتے ہیں جن کے بارے میں خود انہیں نہیں معلوم کہ کیا تھیں اور نہ میں اُس عام خوش فہمی میں مبتلا ہونا پسند کروں گا جس میں ماضی کو یاد کرتے وقت ہم میں سے اکثر مبتلا ہو جاتے ہیں یعنی یہ کہ ہمارا زمانہ آج کے زمانے سے کہیں بہتر تھا۔

میرے زمانۂ طالب علمی کے ابتدائی برسوں میں ایس ایس ہال میں سترہ وگل کی یہ

فراوانی نہیں تھی جو آج دیکھنے میں آتی ہے اور وہ لان جن پر ہال کے ساکنان اب بیڈمنٹن یا کرکٹ کھیلتے ہیں یا کبھی کبھی کتاب ہاتھ میں لیکر محض لوٹ لگاتے ہیں وہاں رومن طرز تعمیر کی ایک مخصوص عمارت ہوتی تھی جس کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ جو نیز حضرات کو اگر ذوقِ تحقیق ہو تو کسی سال خوردہ ہیڈ بیرے سے پوچھ لیں یا پھر کسی پرانے بیرے کی خدمات حاصل کریں۔ برآمدوں کی سیڑھیوں کے نیچے صحن کا حاشیہ پختہ نہیں تھا اور یہی ہماری ٹرف وکٹ تھی۔ جب سے یہ حاشئے پختہ ہوئے ہوسٹل میں کرکٹ کھیلنے کا مزا گیا اور Mad Riot کے امکانات بہت کم رہ گئے۔ ویسے اللہ معاف کرے ہم لوگ کبھی کبھی ہوسٹل کے برآمدے میں بھی کرکٹ کھیلتے تھے۔ ایس۔ ایم۔ کورٹ کے باہر جو چبوترے سے بنا دیئے گئے ہیں۔ یہ بھی بعد کا اضافہ ہیں۔ ہر کمرے کے بیک روم میں ایک غسل خانہ تھا جس میں نل لگا ہونے کے باوجود بھشتی صبح شام بڑی پابندی سے گھڑوں میں پانی بھر جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے بیک روم ملا تو اس کا غسل خانہ کس طرح منہدم ہونے سے بچ گیا تھا لیکن جگہ کی تنگی کے پیش نظر مجھے شعبۂ تعمیرات کو کئی درخواستیں دیکر عہدِ رفتہ کی اِس یادگار کو زمین ریز کروانا پڑا۔

ڈائننگ ہال صرف ایک تھا (میرے قیام کے آخری سال میں دوسرا بھی شروع ہو گیا تھا) اور کھانے والے کوئی پانچ سو اس وقت، شاذ و نادر ہی کوئی طالب علم ایسا ہوتا ہو جو ڈائننگ ہال کا کھانا نہ کھائے۔ بڑی بھیڑ ہوتی تھی۔ میں رہنے کو تو ہمیشہ ڈائننگ ہال کے آس پاس رہا (ممکن ہے کمرے کے انتخاب میں کسی لاشعوری مصلحت کو دخل ہو) لیکن اس قربت کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکا کہ یارانِ تیزگام پہلے ہی منزل کو جا لیتے تھے۔ ڈائننگ ہال کے کھانے کے بارے میں بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ مثل حقیقتِ ابدی کے ہے یعنی تغیر و تبدل سے مادرا ہے۔ مجھے نہ اس کی توفیق ہے اور نہ میرے پاس ایسے شواہد ہیں کہ میں اس قول کی تردید کر سکوں لیکن میں نے اپنے زمانے

میں ایس ایس ہال کے کھانے اور ڈائننگ ہال دونوں کو ہر ہال کے مقابلہ میں بہتر اور زیادہ قابلِ قبول پایا۔ ہوسکتا ہے میں ایسا ہر بنائے تعصب کہہ رہا ہوں۔

کمروں میں رہائش کی صورت یہ تھی کہ فرنٹ روم میں تین اور بیک روم میں ایک طالب علم رہتا تھا کسی سال داخلے زیادہ ہو جائیں تو ایک کمرے میں پانچ لڑکے بھی رکھے جاتے تھے۔ ہم لوگ اِس بھرتی پر زیادہ ناک بھوں نہیں چڑھاتے تھے کہ ہم نے تقسیم ملک سے پہلے کا حال سن رکھا تھا جب ہر کمرے میں اتنے لڑکے ہو جاتے تھے کہ چارپائیاں باہر پھینک کر فرش پر ایک دری بچھالی جاتی تھی اور محمود و ایاز سب ایک صف میں اس پر اپنے بستر جمالیتے تھے۔ میں جب نیا نیا علی گڑھ آیا تو مجھے ایس ایس ہال کے کمروں میں رہنے والوں کی تعداد دیکھ کر ذرا وحشت ہوئی۔ یہ شکایت بھی عام تھی کہ یہاں پڑھائی لکھائی کچھ ہو نہیں پاتی۔ ہر وقت کا شور و غل مہلت ہی نہیں کہ یکسوئی سے اپنا کام کریں۔ میری ڈویژن ایسی تھی کہ مجھے آفتاب ہاسٹل میں کمرہ مل سکتا تھا (اس وقت صرف آفتاب ہوسٹل ہی میں SINGLE SEATED کمرے تھے) لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے ایس ایس ہال ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ کیا عجب میں نے یہ سوچا ہو کہ اگر کچھ پڑھ لکھ نہ پایا تو آدھا الزام پارٹنرز اور ہوسٹل کی بھیڑ بھاڑ کے سر جائے گا۔ اتنے مختلف النوع لوگوں کے ساتھ رہنے کا تجربہ میرے لئے نیا بھی تھا اور میری افتادِ طبع کے خلاف بھی خوش قسمتی سے مجھے اس سلسلے میں وہ دشواریاں اور مسائل پیش نہیں آئے جن کا اندیشہ تھا۔ اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ایس ایس ہال میں رہنا میرے حق میں ہر لحاظ سے اچھا ثابت ہوا۔ اور کچھ نہیں تو چشم تنگ کو کثرتِ نظارہ سے دا ہونے کا موقع تو ملا ہو۔ سچ پوچھیے تو ایس ایس ہال اپنی گنجان آبادی کے باوجود نہ صرف تاریخی اعتبار سے وقیع ترین بلکہ یوں بھی سب سے صاف ستھرا اور روشن ہال ہے اور چاندنی رات میں اس سے زیادہ خوبصورت جگہ یونیورسٹی میں کوئی اور نہیں۔ چوں کہ

میں ایس ایس ہال کا ایک سابق باشندہ ہوں اس لیے آپ ان تعریفوں کو اپنے ہال سے میری محبت پر محمول جانئے گا اور زیادہ سنجیدگی سے ان پر دھیان نہ دیجئے گا۔

ایس ایس) ہال کی رونق جن ہنگاموں پر موقوف تھی آن میں سے دو یعنی آرٹس فیکلٹی اور لٹن لائبریری نقل مکانی کر چکے ہیں۔ ان کی موجودگی میں جو چہل پہل رہتی تھی اور ہال کو جو مرکزیت حاصل تھی وہ اب کہاں۔ اسی لیے میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ ہمارے وقت کا ایس ایس۔ ہال ذرا مختلف تھا۔ آرٹس کا طالب علم تھا اور آرٹس کے بیشتر شعبے میرے کمرے سے STONE'S THROW والے فاصلے پر تھے۔ ویسے اس وقت طلبا کو سنگ زنی کا شوق ذرا کم تھا۔ کلاس روم سے اس قربت مکانی کے بعض نقصانات بھی تھے۔ مثلاً کتنی ہی تیز بارش کیوں نہ ہو رہی ہو آپ بعض شعبوں تک بغیر بھیگے پہونچ سکتے تھے اور کلاس سے غائب رہنے کا ایک نہایت فطری عذر آپ کے لیے کارگر نہیں تھا۔ بہرحال کے لڑکے کو دن میں کم از کم ایک بار ایس ایس ہال کے در پر ضرور جبہ سائی کرنا پڑتی تھی اور ایس ایس ہال کا تقریباً ہر کمرہ ایک چھوٹا موٹا سائیکل اسٹینڈ بن جاتا تھا۔ جس عمارت میں لٹن لائبریری تھی اس نے عجیب قسمت پائی تھی۔ جب یہ لائبریری تھی تو میں نے یہاں کتابیں پڑھیں۔ پھر یہ شعبۂ نفسیات کی تجربہ گاہ بن گئی اور میں نے بحیثیت طالب علم نفسیات کے تجزیے کئے۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ میں نے اسی عمارت میں نہاری کھائی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب عثمانیہ اور ایس۔ ایم۔ ایسٹ کا ڈائننگ ہال یہاں منتقل ہو گیا تھا اور ہال کے سارے لڑکوں کو اس نئے ڈائننگ ہال میں جاڑے کے موسم میں ایک دو بار نہایت خشوع خضوع کے ساتھ رات کے وقت نہاری کھالی گئی تھی۔ انقلابات کی بات چل نکلی ہے تو مجھے یاد آیا کہ ایس۔ ایس۔ ایسٹ میں میرے قیام کے زمانے میں علی گڑھ کے ایک بڑے ہی پرانے طالب علم اپنے بیوی بچوں کو یونیورسٹی گھمانے کے لئے لائے۔ یہ بزرگ کسی زمانے

میں ایس۔ ایس۔ ایسٹ میں رہتے تھے۔ بڑے اشتیاق سے اپنے کمرے کی طرف بڑھے لیکن قریب پہنچے تو ٹھٹھک کر رہ گئے اور تصویر حیرت بنے۔ بیوی بچوں کو دیکھنے لگے جن کے لئے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا اُن بزرگ کے کمرے کا نمبر وا تھا۔

بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ میں ایس۔ ایس۔ ہال میں اپنی رہائش کے دوران پیش آنے والے کچھ واقعات سناؤں یا ہال کی بعض دلچسپ شخصیتوں کا تذکرہ کروں۔ صرف ایک آدھ واقعے کے ذکر اور چند لوگوں کی یاد تازہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ایک سابق پرووسٹ کی طرز گفتار اور وکٹوریہ گیٹ کے ایک سن رسیدہ چوکیدار کی چوکسی کا عالم بھلانا مشکل ہے۔ یادش بخیر ہمارے ہوسٹل میں ایک خاصے سینئر طالب علم رہتے تھے۔ اُن صاحب کے سامنے اگر کھانا رکھا ہو تو اُن کے لئے ہاتھ روکنا تقریباً ناممکن ہوتا۔ جب کوئی رسمی ڈنر ہوتا تو انہیں بڑی سخت آزمائش سے گزرنا پڑتا اور اکثر وہ تکلّف بالائے طاق رکھ کر مہمانوں سے پہلے ہی شروع ہو جاتے ۶۳ء میں سربراہ ڈنر بڑے اہتمام سے ہوا۔ پنڈت نہرو آئے تھے۔ مہمان خصوصی کی آمد سے پہلے کھانا چُن دیا گیا اور ہم لوگ شیروانیاں پہنے دسترخوان پر بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ پنڈت جی کے آنے اور دور تک بیٹھی ہوئی طلبا کی صفوں کا ایک راؤنڈ لینے میں کافی دیر لگ گئی۔ اُس وقت اُن صاحب کی بڑی یاد آئی۔ شکر ہے کہ وہ پہلے ہی یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے ورنہ اضطراب میں وہ شجر ممنوعہ پر ہاتھ صاف کر جاتے یا پھر صدمۂ فراق کی تاب نہ لا کر جاں بحق تسلیم کر دیتے

اکتوبر ۶۱ء میں یونین کے الیکشن کے بعد فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ کئی دن تک کرفیو لگا رہا۔ ہم ایس۔ ایس۔ ہال والے اپنے آپ کو ایک قلعہ میں محصور تصور کرتے تھے اور اس قلعہ کی دفاع کی تیاریوں میں شب و روز لگے رہتے تھے کچھ لوگ رات بھر نہیں سوتے تھے اور وارڈن صاحبان کی سرکردگی میں مختلف ہوسٹلوں کے طلبا کی ٹولیاں ہال کی چہار دیواری میں گشت کرتی رہتی تھیں۔ بعض حضرات کی رجز خوانی اور فن سپاہ گری میں

بھارت کے زبانی مظاہرے دیدنی اور شنیدنی تھے۔ ایک رات کوئی نو دس بجے کے قریب بڑے زور کا سائرن بجا۔ سائرن سنتا تھا کہ ہم سب نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے مچھر دانی کے بانس لے کر دوڑ پڑے۔ بڑی بھگدڑ مچی۔ سارے گیٹ بند تھے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کس طرف جانا ہے اور اگر حملہ آور ہے تو کہاں ہے؟ یوں سمجھئے کہ ایک بگولا اٹھا جس نے چشم زدن میں سارے ہال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فضا میں اللہ اکبر کی صدا، مچھر دانی کے بانس اور انسانوں کے سائے حدِ نظر تک اس طرح ابھرتے ڈوبتے تھے جیسے آندھی میں جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت چند منٹوں بعد مطلع صاف ہو گیا۔ سائرن جھوٹا تھا۔ اب اس منظر کو یاد کریں تو ہنسی آتی ہے لیکن خوف کے وہ چند لمحے بڑے شدید اور کربناک تھے جن میں سینکڑوں آدمیوں نے موت کو روبرو محسوس کیا اور تحفظِ ذات کے اضطراری تجربے سے گزرے۔

میرے زمانہ میں ایس ایس۔ ہال کا ذہنی اور تہذیبی ماحول کیسا تھا اور نصابی پڑھائی لکھائی کے علاوہ کھیل کود، سیاست، ادب اور ثقافت وغیرہ کی صورت کیا تھی؟ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ میرے زمانے میں ایس ایس ہال ذہنی اعتبار سے ایک LOW BROW قسم کی جگہ تھی۔ انفرادی فکر، وسیع النظری اور روشن خیالی کی حوصلہ افزائی عام نہیں تھی۔ ہر معاملہ میں روایت پرستی اور تقلید پر زور تھا۔ سنجیدگی سے پڑھنے والے لڑکوں کی تعداد موجود تھی جن میں سے بعض امتحانات میں بہت اچھے نمبر پاتے تھے لیکن ہمہ گیر آگہی رکھنے والے زندہ اور فعال ذہن بہت کم نظر آتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ سب عمومی قسم کے مشاہدات ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی پسماندگی کچھ ایس۔ ایس ہال تک ہی محدود نہیں تھی۔ بالکل درست ہے لیکن اپنے گھر میں کوئی کمی ہو تو فطری طور سے اُس کا احساس زیادہ شدید ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایس ایس ہال بے حس اور بے جان تھا۔ رونق یہاں کبھی کم نہیں ہوئی۔ اسپورٹس کا بڑا چرچا تھا۔ تقریری مقابلے، بیت بازی اور مشاعرے بھی خوب ہوتے تھے مگر مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا کہ ان سرگرمیوں میں ہم

کچھ واجبی ہی سے رہے اور ہمارے ہال کا معیار اوسط سے زیادہ بلند نہ ہو سکا۔ سیاست کا معاملہ یہ تھا کہ یونین کے الیکشن کے وقت یونیورسٹی کے ہر گوشے سے سیاست داں یہاں اکٹھا ہو جاتے تھے اور بڑی ہنگامہ آرائی رہتی تھی۔ لیکن الیکشن ختم ہوا اور سیاست میں دلچسپی بھی غائب۔ جو حضرات فل ٹائم سیاست داں تھے اُن کی بات الگ ہے۔ یونیورسٹی میں اس وقت CULTURE VULTURES تھے اُن کا بسیرا ہمیشہ ایس ایس ہال کے باہر رہا۔

آخر میں تلخ نوائی کی معافی چاہتے ہوئے یہی عرض کر دوں گا کہ یہ تنقید بھی اسی تعلق خاطر کا ایک رُخ ہے جو مجھے ایس ایس ہال سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

○

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

(اقبال)

اس بزم میں

میاں محمد امین ۔ میاں محمد امین صاحب جالندھر کے رہنے والے تھے وہ اکتوبر ۱۸۷۸ء سے مارچ ۱۸۸۹ء تک مدرسۃ العلوم کے طالب علم رہے کالج کے دور اول کے ممتاز طلبا میں تھے ۱۸۸۶ء میں کالج کرکٹ ٹیم کے کپتان مقرر ہوئے صوبہ پنجاب کے نامور پولس افسر تھے ۔ ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ کی صدارت بھی کی تھی ۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۳۵ء کو انتقال ہوا ۔

سید طفیل احمد ۔ سید طفیل احمد ۱۸۶۸ء میں بمقام منگلور ضلع سہارنپور پیدا ہوئے ۔ ۲۳ر جولائی ۱۸۷۹ء کو مدرستہ العلوم میں داخل ہوئے ۱۸۸۹ء میں ایف اے پاس کیا ۔ زمانہ طالب علمی میں چھ سال تک کالج کی کرکٹ الیون میں رہے سڈنس یونین کے کیبنٹ اور مدمیں سکرٹری ہوئے انجمن اخوان الصفا کے سب سے پہلے ارکین میں تھے ۔ علی گڑھ کے کھلنڈروں کی جلم پارٹی کے ممتاز رکن تھے انھوں نے مدرستہ العلوم کی ڈائرکٹری مرتب کی جس میں ۱۸۷۵ء تک کے تمام طلبا کے مختصر حالات ہیں ۱۹۳۸ء میں اپنی مشہور کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" لکھی ۔ ۳۰ر مارچ ۱۹۴۶ء کو انتقال ہوا ۔

خواجہ عبدالعلی ۔ مولوی خواجہ عبدالعلی کا سلسلۂ نسب مشہور صوفی بزرگ خواجہ عبداللہ احرار سے ملتا ہے وہ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے مدرستہ العلوم کے دور اول کے ممتاز طلبا میں تھے ملازمت کی ابتدا انھوں نے منصفی سے کی وہ علی گڑھ اولڈ بوایز اسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۴ء کے صدر تھے ۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا انتقال ہوا ۔

میر ولایت حسین ۔ میر صاحب مدرستہ العلوم کے ممتاز اولڈ بوایز میں تھے وہ ۱۸۸۲ء میں کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۸۶ء میں اسٹاف میں شامل ہو گئے انھوں نے کالج کے پراکٹر

کے فرائض کے علاوہ اور بہت سی انتظامی خدمات انجام دیں وہ بہت دنوں تک علی گڑھ میگزین

کے منیجر بھی رہے۔ ان کا انتقال ۔۔۔ ۱۹۲۹ء کو ہوا۔

ڈاکٹر شیخ عبداللہ ۔ شیخ عبداللہ ۲۱؍ جون ۱۸۷۴ء کو پیدا ہوئے وہ کالج کے ممتاز طلبا

میں تھے تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور ہندوستانی عورتوں کی فلاح و بہبود کی تحریک کے

بانی تھے۔ تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے جولائی ۱۹۰۴ء میں انھوں نے رسالہ خاتون کا اجرا

کیا۔ ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ میں مسلم گرلس اسکول کی بنیاد ڈالی جو اب ویمنس کالج کے نام سے مشہور

ہے ان خدمات کے اعتراف میں مسلم یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی سند اور بھارتی حکومت

نے پدم بھوشن کا خطاب دیا۔ شیخ صاحب کا انتقال ۹ اپریل ۱۹۶۵ء کو ہوا۔

سر رضا علی ۔ سر رضا علی ۱۸۸۰ء میں کندرکی ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے وہ مدرسۃ العلوم

کے ممتاز اولڈ بوائز میں تھے اور زمانہ طالب علمی میں بھی طلبا اور اساتذہ میں احترام کی نظر سے دیکھے

جاتے تھے ایک طویل مدت تک ہندوستانی سیاست سے بھی منسلک رہے انھوں نے ہندوستان

کے مندوب کی حیثیت سے جنوبی افریقہ میں اہم خدمات انجام دیں۔ اردو کے سوانحی ادب میں

ان کی مشہور کتاب "اعمال نامہ" کو اہم مقام حاصل ہے۔

عبدالمجید قریشی ۔ عبدالمجید قریشی مدرسۃ العلوم کے ممتاز طالب علم اور مقبول استاد تھے

وہ ہمارے ہال کے دوبار پرووسٹ مقرر ہوئے مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل بھی

رہے اور شعبۂ ریاضیات کے صدر بھی۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔

حکیم احمد شجاع ۔ حکیم احمد شجاع ۱۸۹۵ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے وہ مدرسۃ العلوم کے

نمایاں طالب علموں میں تھے۔ ان کے ادبی اظہار کا مخصوص شعبہ ڈرامہ تھا ان کے ڈراموں میں

قدیم و جدید روایات کا امتزاج ہے ان کے اسٹیج ڈراموں میں باپ کا گناہ، حسن کی قیمت،

جانباز دلہن اور بھارت کا لال وغیرہ ہیں انھوں نے بنگالی ڈراموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

حکیم صاحب بہت دنوں تک پنجاب لیجس لیٹو کونسل کے سکریٹری تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ ذاکر صاحب ۸ فروری ۱۸۹۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۱۹۱۳ء میں
مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے ۱۹۱۸ء میں بی اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا ایم اے اکنامکس
کے آخری سال میں تھے کہ مدرسۃ العلوم میں جونیئر لکچرر مقرر ہوئے وہ کالج کے ان طلبا میں
تھے جو اپنے سیرت و کردار اور تعلیمی امتیاز کے سبب ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔
کالج یونین کے وائس پریسیڈنٹ تھے ۱۹۲۰ء میں جب جامعہ کی بنیاد پڑی تو وہ جامعہ آگئے
اور ۱۹۲۶ء میں جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے ۱۹۴۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے
وائس چانسلر ہوئے ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر اور ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ ہند
ہوئے ۱۹۶۷ء میں ہندوستان کے صدر جمہوریہ کے عہدے پر سرفراز ہوئے ۱۹۶۹ء میں قومی
فلاح و بہبود کے لیے مسلسل جدوجہد ایثار و قربانی دلسوزی اور دلنوازی کی مثال پیش کر کے اپنے خالق سے جا ملے۔

پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد صدیقی ۔ اردو کے مایۂ ناز ادیب رشید احمد صدیقی ۱۸۹۲ء
میں ضلع جون پور میں پیدا ہوئے ۱۹۱۵ء میں فرسٹ ایئر میں علی گڑھ آئے۔ بی اے میں
انگریزی میں اول آنے پر مورس ٹرافی اور فارسی میں اول آنے پر دوسرا انعام ملا تھا۔ ایم
اے کے زمانے میں رشید صاحب ٹینس کلب کے جنرل سکریٹری، اسٹوڈنٹس یونین کے
آنریری سکریٹری اور ڈائننگ ہال کے فوڈ مانیٹر تھے۔ وہ علی گڑھ میگزین کے بہت دنوں
تک ایڈیٹر رہے ۱۹۲۲ء میں یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہوئے اس زمانے میں
انھوں نے مارس ہال میں وارڈن شپ کے فرائض بھی انجام دیئے۔ علی گڑھ کی تقریباً
ساٹھ برس کی تاریخ ان کے مشاہدے اور تجربے کا حصہ ہے۔ آج بھی ان کے فقرے
اور جملے اہل اردو اور علی گڑھ کے لیے سرمایہ مسرت و بصیرت اور علم و دانش کی
امیدیں ہیں۔ ان کے اسلوب کی ندرت نے اردو ادیبوں کی کئی نسل کو متاثر کیا ہے۔
اردو نثر کے معمار کی حیثیت سے رشید صاحب کی خدمات بہت قابل قدر اور وسیع ہیں
انھوں نے ایک مدت تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی صدارت کے فرائض انجام

دیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان سے نسبت کے سبب یونیورسٹی اور شعبۂ اردو کا نام اور بھی روشن ہوا۔ ابھی حال میں رشید صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف میں ہماری یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی سند پیش کی ہے۔

- **محمد عدیل عباسی** ۔ مجاہد آزادی اور اردو تحریک کے قائد عدیل عباسی صاحب کی شخصیت کئی اعتبارات سے امتیاز کی حامل ہے۔ وہ ہماری یونیورسٹی کے نمایاں طالبعلموں میں تھے۔ زمانۂ طالب علمی کے بعد انھوں نے اپنی ساری زندگی ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردی۔ انھوں نے اترپردیش میں اردو کی ابتدائی تعلیم کے لئے مدرسوں کا نظام قائم کیا اور اردو تعلیم کے مسائل پر اخبارات وجرائد میں رقیع مضامین لکھے۔ ابھی حال میں ان کی کتاب اقبال کا فلسفہ حیات وشاعری شائع ہوئی ہے۔

- **مسعود علی ذوقی** ۔ ذوقی صاحب ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے بی ٹی اور ایم اے کے امتحانات اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۵۳ء میں مسلم یونیورسٹی اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہوئے ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ذوقی صاحب اپنی رومانی نظموں اور گیتوں کے لئے مشہور ہیں۔ فلمی دنیا سے بھی ان کا تعلق رہ چکا ہے انھوں نے تقریباً دو درجن ڈراموں میں ہدایت دی ہے۔

- **پروفیسر آل احمد سرور** ۔ سرور صاحب ہمارے ملک کی ان شخصیتوں میں ہیں جن سے ہماری تہذیب زبان اور ادب کے کئی شعبوں کو روشنی ملی وہ یونیورسٹی میں ایک طالب علم کی حیثیت سے بھی نمایاں اور ممتاز رہے اور ایک استاد کی حیثیت سے بھی انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا گیا۔ وہ یونین کے وائس پریسیڈنٹ، علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر اور ہمارے ہال کے طالب علم کے علاوہ پروسٹ بھی رہے۔ وہ انگریزی اور اردو زبان پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور دونوں زبانوں میں ان کے مضامین کا ایک قابل قدر ذخیرہ

سرور صاحب سے منسوب ہے ہندوستانی حکومت کے مندوب کی حیثیت سے اور کبھی بیرونی یونیورسٹیوں کی دعوت پر سرور صاحب کئی ملکوں کا سفر کر چکے ہیں وہ اردو تنقید کے قافلہ سالار صاحب طرز ادیب، ممتاز شاعر اور صحافی ہیں ایک طویل عرصہ تک اردو تحریک کے سربراہ رہے ہیں بہ حیثیت صدر شعبۂ اردو ان کے زمانہ قیام میں شعبہ اردو کو نہ صرف یہ کہ ہماری یونیورسٹی میں مرکزیت حاصل رہی اور برصغیر میں اس کی سرگرمیوں کا اعتراف کیا گیا بلکہ بہ حیثیت استاد انھوں نے جس دلنوازی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ نوجوان ذہنوں کی پرورش کی اس پر ہماری کئی نسلیں فخر کر سکتی ہیں ان میں وہ کشادہ ذہنی اور روشن خیالی ہے جو ایک عالم کی شان ہے وہ متانت و وقار اور شفقت ہے جو ایک اچھے استاد کا شرف ہے اور ملک کے تہذیبی و معاشرتی مسائل سے وہ ذہنی ربط ہے جو ایک سچے دانشور کی پہچان قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرور صاحب کی تصانیف اور تالیفات کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے اس کے علاوہ ہزارہا صفحات مضامین، سفرناموں اور مقالات کی شکل میں برصغیر کے ممتاز جرائد میں بکھرے ہوئے ہیں ان دنوں سرور صاحب شملہ کے اعلیٰ تحقیق کے مرکز میں انگریزی میں اردو کی ادبی روایت پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔

پروفیسر مختار الدین احمد ۔ ماہر غالبیات اور اردو کے چوٹی کے محقق پروفیسر مختار الدین احمد آرزو مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے سربراہ اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین ہیں۔ آرزو صاحب نہ صرف یہ کہ زمانۂ طالب علمی میں اس یونیورسٹی کے منتخبات میں گنے جاتے تھے بلکہ استاد کی حیثیت سے بھی انھوں نے وہ عزت و وقار حاصل کیا جو کسی بھی عالم کے لئے باعث افتخار ہو سکتا ہے۔ وہ اردو ادب کے عارف اور عربی ادب کے منتہی ہیں انھوں نے دہلوی نثر کی پہلی کتاب کربل کتھا کی دریافت اور اردو کے قدیم ترین خط کی تلاش سے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اہم اضافے کئے ہیں۔ ملک کے چند ماہرین غالبیات میں آرزو صاحب کا نمایاں مقام ہے۔

قاضی ارشد مسعود گنگوہی۔ قاضی ارشد مسعود صاحب ۱۹۳۲ء میں گنگوہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے ۱۹۴۹ء میں انٹرمیڈیٹ کامرس میں مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں ایم اے ایل ایل بی کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیا ارشد صاحب کا تعلیمی ریکارڈ نہایت شاندار رہا ہے وہ یونیورسٹی کے ممتاز طالب علموں میں گنے جاتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ شعبۂ قانون میں استاد مقرر ہوئے ان کے مختلف موضوعات پر بہت سے مضامین ملک کے انگریزی اور اردو جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ بین الاقوامی قانون پر تحقیقی کام کے سلسلے میں آپ کا قیام بیرونی ممالک میں بھی رہا ہے۔ ارشد صاحب بہت دنوں تک آفتاب ہال میں اور کچھ دنوں تک سلیمان ہال میں بحیثیت وارڈن بھی رہے ہیں۔

محمد شفیع قریشی۔ شفیع قریشی صاحب ۱۹۲۹ء میں وادی کشمیر میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی سے آپ نے ایم اے ایل ایل بی کیا۔ شفیع صاحب سرسید ہال کے ان طلبا میں ہیں جو اپنی متانت، ذہانت اور تعلیمی امتیازات کے سبب ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ یونیورسٹی کی ثقافتی سرگرمیوں میں وہ برابر حصہ لیتے رہے اور اس سلسلے میں کئی ذمہ داریاں بہت خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے سرینگر میں وکالت شروع کی ابتدا سے آپ کو کشمیر کے مسائل سے دلچسپی تھی چنانچہ وادئ کشمیر میں انڈین نیشنل کانگریس کی شاخ قائم کرنے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ شفیع قریشی صاحب ۱۹۶۵ء میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے وزارت تجارت، فولاد اور ریلویز میں ڈپٹی منسٹر کے عہدوں پر فائز رہے آج کل آپ وزیر مملکت برائے ریلویز ہیں۔
شفیع صاحب کو مسلم یونیورسٹی کے مسائل سے والہانہ لگاؤ ہے۔

حبیب احمد صدیقی۔ حبیب صاحب سرسید ہال کے رکن رہے ہیں وہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں یونیورسٹی اور ہال کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ آپ گورکھپور کے ممتاز وکلا میں گنے جاتے ہیں اور وہاں کی سماجی زندگی میں نمایاں اور ممتاز ہیں۔ گورکھپور میں علی گڑھ

ہولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی شاخ کے سرگرم کارکن ہیں۔

سید وقار حسین۔ وقار صاحب کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار ہے وہ سرسید ہال کے ان طالب علموں میں ہیں جو اپنے تعلیمی امتیازات اور متانت کے سبب قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے ۱۹۶۹ء سے شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ ان کے ادبی اظہار کا مخصوص شعبہ تنقید ہے نئی انگریزی شاعری اور جدید اردو شاعری سے متعلق متعدد مضامین اردو کے معروف اور ممتاز جرائد میں شائع ہوئے ہیں ان دنوں جارج آرویل پر انگریزی میں پی ایچ ڈی کیلئے مقالہ تیار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر حسام الدین فاروقی۔ سرسید ہال کے مقبول اور ہر دل عزیز پرووسٹ حسام الدین صاحب ۱۹۳۴ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے ۱۹۵۰ء میں ہمارے ہال کے رکن رہے۔ ۱۹۵۸ء میں شعبۂ زوالوجی میں استاد مقرر ہوئے بحیثیت استاد وہ اس ہال کے وارڈن اور پرووسٹ شپ کے تجربے سے بھی گزرے ہیں اس طرح سرسید ہال کے در و دیوار سے ان کا رشتہ کئی دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ حسام الدین صاحب کی سب سے بڑی خوبی خیال کی وہ وسعت ہے اور شخصیت کی وہ بے تعصبی ہے جسے ہم تہذیب و تعلیم کا اصل الاصول کہہ سکتے ہیں۔ وہ اختلافات کا احترام کرنا بھی جانتے ہیں اور آزادی رائے کے حق سے اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی محروم نہیں سمجھتے یہی وجہ ہے کہ وہ ہر حلقے میں احترام اور محبت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کے متعدد مضامین سائنس کے وقیع جریدوں میں شائع ہو کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر اصغر عباس۔ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں استاد ہیں ان کی دلچسپی کا موضوع علی گڑھ تحریک ہے اس سلسلے میں متعدد مضامین ملک کے علمی و ادبی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ سرسید پر ان کی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سے ایک پر حکومت یوپی نے انعام دیا ہے۔ سرسید ہال کے طالب علم بھی رہے ہیں اور آج کل سنٹرل ہاسٹل سرسید ہال کے وارڈن ہیں۔ ان دنوں علی گڑھ تحریک پر ڈی لٹ کے لئے مقالہ تیار کر رہے ہیں۔

○

SIR SYED HALL REVIEW

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

OLD BOYS NUMBER

Censor
Dr. Asghar Abbas

Editor
Malik Khalid Husain

1975